# ہست و بود

مولفہ

میاں اعجاز نبی

پی۔سی۔ ایس (ریٹائرڈ)

# ہست و بود

## قوم منگرال راجپوت کی سرگزشت

(ورود و قیام گجرات پنجاب)

مولفہ

میاں اعجاز نبی
(پی۔ سی۔ ایس ریٹائرڈ)

غیروں میں نہ مل اپنوں سے نہ کٹ۔ اُن کو نہ بڑھا اور آپ نہ گھٹ

فرقوں میں نہ بٹ مرکز سے نہ ہٹ۔ پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے

(مولانا ظفر علی خاں)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَّ أُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا

ترجمہ: اے لوگو ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے۔ قبیلے اور خاندان تمہارے بنا دیئے گئے تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ (قرآن حکیم)

---

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

(سعدی شیرازی)

---

ضخامت ———— ۳۲۸ صفحات

کتابت ———— جمیل مرزا۔ بی اے

طبع اوّل ———— ۱۹۷۷ء ———— تعداد ———— ۱۱۰۰

پریس ———— دین محمدی پریس جیل روڈ لاہور

ناشر ———— میاں اعجاز نبی، پی سی ایس (ریٹائرڈ)

# انتساب

رفتگان و گزشتگانِ قوم کے نام ۔ بالخصوص
والدِ گرامی میاں محمد اقبال نبی مرحوم اور برادرِ عزیز
میاں محمود افتخار نبی مرحوم کے نام جو دونوں عنفوانِ شباب
میں واصل بحق ہوئے !

أَنْتُمُ السَّابِقُوْنَ وَنَحْنُ إِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ
لَاحِقُوْنَ ۔ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْكَ وَجَعَلَ
الْجَنَّةَ مَنْزِلَكَ ؕ

ترجمہ :- (آپ ہم سے پہلے چلے گئے اور ہم انشاءاللہ آپ
سے ملنے والے ہیں ۔ راضی ہو اللہ تعالیٰ آپ سے اور
بناوے جنت کو آپ کا گھر)

مِلّتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر

سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

(مولانا الطاف حسین حالؔی)

# انڈکس

# دستاویزات

(۱) عکس حکمنامہ بنام میاں رسول بخش کاردار بارود خانہ گجرات

(۲) عکس شاہی فرمان مجریہ ۱۸ اسوج سمت ۱۸۹۱ بنام کارداران پرگنہ گجرات

(۳) عکس روبکار مجریہ ۱۳ مگھر سمت ۱۸۹۰ دربارہ پروانہ واگزاری اراضی بنام نور محمد چابک سوار منجانب شہزادہ کھڑک سنگھ۔

(۴) عکس پروانہ واگزاری اراضی بنام نور محمد چابکسوار مجریہ ۲۲ بھادوں سمت ۱۸۸۹

(۵) عکس پروانہ واگزاری اراضی وچاہ بنام نور محمد چابکسوار منجانب مسٹر ہارلن انصاری مجریہ ماہ کاتک سمت ۱۸۸۸

مؤلّف

ع وہ خطا کار جو اعجازِ نبی کہلایا
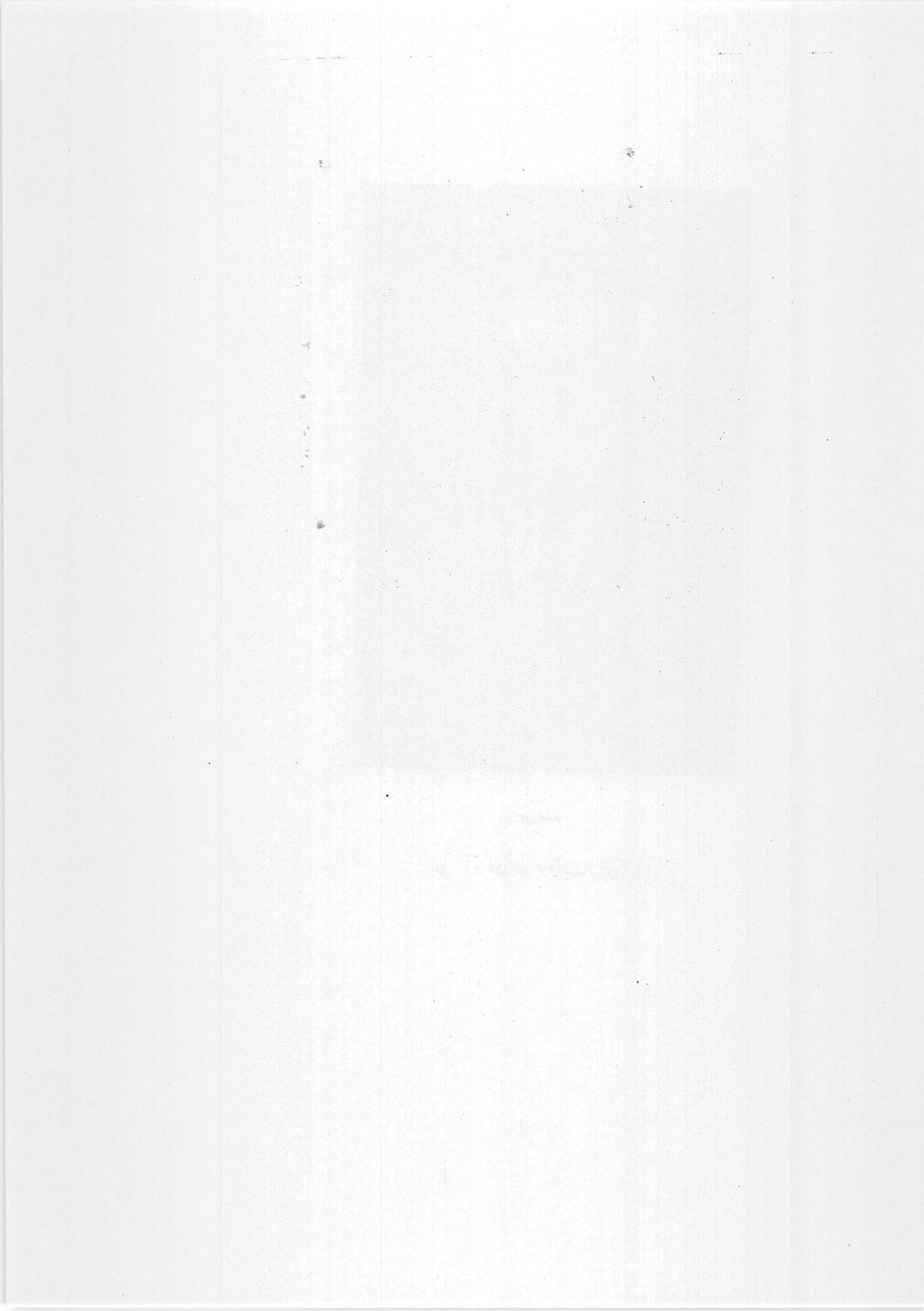
# پیش لفظ

زمانۂ طالب علمی اور مابعد ملازمت کے دوران بھی یہی امر پیشِ نظر رہا کہ اپنے آباؤ اجداد کے بارہ میں تحقیق و تصدیق کے بعد اُن کی زندگی کے حقائق اور کارہائے نمایاں کو اُجاگر کیا جائے۔ اُن کی عظمت اور کامرانی کے اسباب کا احاطہ کیا جائے تاکہ اُن کی آیندہ نسلوں میں کچھ کر جانے کے جذبہ کو بیدار رکھنے اور نیک اُمنگوں کو پروان چڑھانے کی دُھن کو پکا کیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اچھے لوگوں کا کردار اور گذربسر کا منفرد انداز اُن کی آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا اور اُن کی پیروی میں اُن کے ورثا نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں زندگی کے سرد و گرم سے بخوبی عہدہ برا ہو کر اپنی نسلی اور قومی جبلت کے مخصوص خصائل کی نشاندہی کچھ اس طرح کی کہ اُن کی یہ انفرادی خصوصیت اجتماعی قومی فطرت قرار پائی۔

چنانچہ اُسی اقتدار کی روشنی میں وہی صاحبِ کردار اور آہنی عزم کے حامل افراد اپنی وفات کے صدیوں بعد بھی اُسی طرح محبوب و محترم گردانے گئے جس طرح وہ اپنی حیات میں تھے۔ ان میں سے چند ایک خوش نصیب کسی قومیت یا گوت کی اساس ٹھہرے۔ جن میں سے ہمارے مورثِ اعلیٰ راجہ منگھر پال بھی تھے جو قوم منگرال راجپوت کے بانی قرار پائے۔

قوم منگھرال کے کچھ ایسے سپوت بھی تھے جو اپنی قوت، جبروت، مخصوص عادات، خصائل، کردار اور تخلیقات کی بنا پر دوسروں سے متمیز ہوتے۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی سے مختلف بادشاہوں اور طالع آزماؤں نے مختلف اقوام اور گوتوں کے حوالہ سے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کیں اور بعض ایسے بھی تھے کہ ؎

پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی

کچھ ایسے بھی صاحبِ سخن و گفتار ہوتے کہ زندگی بھر فن کے موتی بکھیرتے رہے اور جب اُن کے قدرداں ہی موجود نہ تھے تو خود ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوتے اپنی انا کی تسکین یوں کر گئے کہ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" مرزا غالب ؔ کو ہی لیجیے آج وہ اپنے وقت کے قادر الکلام اور نغز گو شاعر مانے جاتے ہیں لیکن جب تک زندہ رہے عسرت میں گزر بسر کی اور اُن کا سو پشت تک کا پیشۂ آباء سپہ گری بھی کچھ کام نہ آیا، بادشاہِ وقت ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر کہ علم و فن کا جوہری تھا سے یہی گذارش و استدعا کرتے رہے کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!

آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

اس لیے ایسے زیرک، صاحبِ سیف و قلم، وضع دار اور ہمہ صفت موصوف اصحاب کو بھلا دینا اور قعرِ گمنامی کے سپرد کر دینا کس قدر ظلمِ عظیم کے مترادف ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کی متقاضی ہے۔ جہانِ بے ثبات کو چھوڑنے سے مفر نہیں لیکن اس کے باوجود صاحبِ ادراک اور ہوسِ زندگی کے اسیر اپنے لیے راہیں متعین کرنے کی آڑ میں نگارشات، تخلیقات اور مصوری کے فنون میں پناہ لیتے ہیں اور یوں کتابی صورت میں، مناظر کشی میں، خوشنویسی اور کتابت میں، مجسمہ سازی

میں اور دیگر باقی رہنے والی اصناف میں جو اُن کی حیاتِ مستعار کے کچھ
عرصہ یا ایک زمانہ تک اُن کی یاد دلاتی رہیں ایسے اقدام کر جاتے ہیں چنانچہ
متعدد ذہنی کاوشیں، تاریخی کتب اور تحقیقی لٹریچر آج کی متمدن دُنیا کا بہت بڑا
اور قیمتی سرمایہ ہیں - آج کی متمدن اور مہذب دُنیا ان نوادرات کو اپنے
زر و مال کے خزانوں سے کہیں بڑھ کر اہمیت دیتی ہے - یہی وہ احساس
تھا جس نے ہمارے مفکرِ اعظم اور قومی شاعر کی زبانِ شیریں بیان سے بصد
درد و کرب کہلوایا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

بزرگانِ سلف کے کارنامے آیندہ نسلوں کے لیے باعثِ عبرت و
تقلید ہوتے ہیں - جس قوم کی کوئی تاریخ نہ ہو وہ مردہ قوموں میں شمار ہوتی
ہے - تاریخ نگارستانِ کشمیر کے مصنّف نے کس قدر صحیح فرمایا ہے -

"خوش قسمت ہے وہ ملک جس کی صحیح تاریخ مرتب ہو جائے
اور خوش قسمت ہے وہ تاجدار جس کے دستِ کرم سے
یہ اہم خدمت سرانجام پائے۔"

راقم اس سلسلہ میں اس قدر عرض گزار ہے کہ خوش نصیب ہے وہ قوم جس
کے اکابرین دگزشتگان کے اوصافِ حمیدہ اور بلند کرداری کی داستانیں
زینتِ قرطاس بن جائیں اور شرفِ دوام حاصل کر کے آیندہ نسلوں کے راسخ
لائحہ عمل کی نشاندہی کرنے میں ممد ثابت ہوں - اُن کے زرین کارہائے نمایاں کو
زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ایک طرف تو یہ عمومی نظریات تھے جو راقم کے ذہن کا احاطہ کیے ہوئے تھے اور دوسری جانب ایک خاص مقصد میرے دماغ کے ایک گوشہ میں محفوظ تھا کہ کیا کسی طرح ہر دو اطراف یعنی ریاست کشمیر اور گجرات پنجاب کے رشتہ دار جو صدیوں سے ایک دوسرے سے کٹ چکے ہیں آپس میں مل سکتے ہیں یا کم از کم دونوں جانب اپنائیت کا احساس اُجاگر کیا جاسکتا ہے اور کیا میری حقیر سی کوشش سے قومی یکجہتی کی بنا ر ڈالی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو سکا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ آج کل مختلف طبقات کی باہمی آمیزش اور اختلاط کی عالمگیر کوششیں جاری ہیں اور ہماری دُنیا جو ایک زمانہ میں نئی اور پُرانی دُنیا کے چکر میں بٹی تھی سمٹ رہی ہے۔ مخالف اور متحارب بلاک ایک دوسرے کے خیالات میں ہم آہنگی کے لیے کوشاں ہیں۔ اِسلام جو عالمی بھائی چارہ اور مساوات کا داعی ہے بھی ہم سے مقتضی ہے کہ ؎

رشتۂ اُلفت میں جب اِن کو پرو سکتا تھا تُو<br>
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

انہی جذبات اور تاثرات کے تانے بانے اگرچہ عرصہ سے شعور کی پہنائیوں میں گم رہے لیکن کسی آن بھی معدوم نہ ہوتے۔ عہدِ تعلیم میں ذہن کی ناپختگی اور ملازمت کے دوران یکسوئی کا فقدان اور عدیم الفرصتی آڑے آئی۔ بالآخر اوائل جنوری ۱۹۷۴ء میں ملازمت سرکار سے سبکدوشی کے بعد پورے انہماک سے اِس عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سلسلہ میں کنک لائبریری گجرات، پنجاب لائبریری لاہور۔ جناب محمد الدین فوق صاحب کی متعدد کتب دربارہ اقوام ریاست کشمیر۔ ریکارڈ مال ضلع گجرات۔ موجود بزرگوں سے اکتساب اور ہر ممکنہ ذرائع سے جو کچھ مہیا ہو سکا اس کا نچوڑ اس حقیر سی نگارش میں ہدیۂ ناظرین ہ

قارئین ہے۔ اپنی اس کاوش کو جاذب نظر اور دلچسپ بنانے کے لیے قومیت کا تخیل۔ اسلام میں قوم اور وطن کا تصور۔ لفظ راجپوت کا مفہوم اور گوتوں کا ارتقا ریاست کشمیر کا پس منظر و مختصر جائزہ۔ گجرات کی مختصر تاریخ جیسے موضوعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ تالیف ہذا کے علاوہ خاندان منگھرال راجپوت گجرات کا نامکمل شجرۂ نسب جو منشی محمد اشرف صاحب کی تحویل میں تھا اور جس میں میاں کمال الدین اور اُن کے ورثا کو شامل نہیں کیا گیا تھا کو بھی مکمل کر کے بعد تصدیق افسران ضلع گجرات شائع کرا دیا گیا ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ تاریخ نویسی کبھی بھی میرا شعبہ نہیں رہا لیکن سکول اور کالج کی زندگی میں تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے اور پھر اقوامِ عالم بالخصوص تاریخِ اسلام کے عمیق مطالعہ نے مجھے علمِ تاریخ کی اہمیت سے کماحقہ روشناس کرایا۔ زمانہ طالبعلمی میں فارسی اور اُردو شاعری سے لگاؤ نے اِس تالیف میں ادبی مزاج پیدا کرنے کی اُپج کو فروغ بخشا اور اسے جاذب توجہ بنانے کے لیے جہاں اور جس مقام پر بھی حوالہ کے لیے کسی مصرع یا شعر کا وجدان ہوا میں نے بلا تکلف لکھ دیا۔ اور پھر جبکہ ایسی نگارشات میں واقعات کی رنگینی، مطالعہ کی تشنگی کو بڑھانے کی داعی بن جاتی ہے غیر متعلقہ اصحاب اور قارئین کی بوریت کے احساس کو کم کرنے کے لیے میری یہ منفرد طرزِ نگارش نگاہِ شوق پر تازیانے کی محرک بن کر رہے گی۔ اور ویسے بھی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یقینِ واثق ہے کہ میری یہ ناچیز کاوش قوم منگھرال راجپوت کے حلقۂ ارادت سے باہر بھی قارئین کے لیے دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب بنے گی اور

آنے والی نسلوں میں گجرات کے منگھرال خانوادہ کے بارے میں ایک معتبر دستاویز کے طور پر دیکھی اور سمجھی جائے گی۔

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں اُن کے دامن کیلئے

زیرِ نظر تالیف میں گجرات کی خاک میں آسودہ جن جن بزرگ اصحاب قوم منگھرال کی تصاویر مہیا ہو سکی ہیں شامل کر دی گئی ہیں۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں برادرِ عزیز میجر بشیر الحسن صاحب پاکستان پوسٹل سروس حال پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور سرکل و میاں فیاض اصغر چیئر مین و ٹیکنیکل ڈائریکٹر درسی ادارہ لمیٹڈ گجرات کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے مختلف ذرائع سے متعلقہ کتب کی فراہمی کا بندوبست فرمایا۔ اور پوری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ موخر الذکر نے اپنے زیرِ تحویل مصدقہ شجرۂ نسب قوم اور شاہی دستاویزات کا عکس عطا کر کے تکمیلِ شجرۂ نسب اور کتاب کی افادیت کا سامان مہیا کیا۔ راقم جناب شریف کنجاہی صاحب کا بھی ممنونِ احسان ہے کہ اُنہوں نے اس کتاب کا تعارف رقم کیا اور جناب میاں محمد آفتاب اصغر کا بھی سپاس گزار ہوں کہ اُنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس حقیر سی پیشکش کا مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا۔ برادرِ بزرگ حاجی شیخ محمد ایوب صاحب ڈپٹی سیکرٹری (مالیات) حکومتِ پاکستان (ریٹائرڈ) نے بھی بکمالِ مہربانی مسودہ کتاب ہذا کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ فرمایا اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے مستفیض فرمایا اللہ کریم اُنہیں سعادتِ دارین سے نوازیں۔ آمین۔

حصّہ خواتین کی ترتیب کے لیے غالب حصّہ معلومات کی بہم رسانی کے لیے اپنی والدۂ محترمہ بیگم اقبال بی صاحبہ کا مرہونِ منّت ہوں۔ محترمہ فرخندہ اختر صاحبہ دخترِ میاں محمد سردار خان (ماموں زاد) کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے ذاتی تگ و دو

سے بیش قیمت معلومات مہیا فرمائیں۔

میں نے آغازِ تالیف سے اختتام تک میانہ روی کو شعار بنانے کی کوشش کی ہے کیونکہ میرے خیال کی پہنائیوں میں ایک یہی جذبہ اور نظریہ کارفرما رہا کہ ؎

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے

اس کے باوجود اگر کسی فردِ قوم پر میری تحریر کے کسی گوشہ سے گرانی کا احساس اُبھر آئے تو اسے میری کم فہمی اور علمی بے بضاعتی پر محمول کرتے ہوتے عفوودرگزر سے کام لیں۔ میرا ایمان ہے کہ ؎

نہ رنجی تا نہ رنجانی کسے را
برنجی چوں برنجانی کسے را

منزلِ اعجاز بالمقابل ریکس سینما
کچہری روڈ۔ گجرات
۱۵، اپریل ۱۹۷۷ء

اعجاز نبی

# تعارف

ہست و بود کے مصنف میاں اعجاز نبی صاحب کے ساتھ میرے روابط طالب علمی کے رفاقت طلب ایام سے ہیں۔ جن میں ایک قدرِ مشترک شعر و ادب سے دونوں کی دلچسپی تھی اور یہی قدر ہمیں زندگی کا بیشتر حصّہ "از دیدہ دُور" گزارنے کے باوجود ایک دوسرے سے "از دِل دُور" نہ کر سکی۔ اور جب وہ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر گجرات آگئے اور مطالعہ کے شغلِ دیرینہ کے ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا تو اپنی اوّلین تخلیق کا تعارف کروانے کا شرف مجھے بخشا۔

میں میاں صاحب کو بحیثیت شاعر کے تو جانتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کا اشہبِ قلم نثر کی وادیوں میں بھی اُسی رفتار کے ساتھ چلتا ہے اور دونوں اصناف میں اُن کا مقصد و منتہا وُہی ہے جس کا خلاصہ اُن کی وہ نظم ہے جو کتاب کے آغاز میں درج ہے۔ اس نظم اور اس نثر کے مطالعہ سے جو بات فوری طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ میاں صاحب اُن نیک طبع لوگوں میں سے ہیں جو مستقبل کو گرم و تابناک دیکھنے کے لیے ماضی کی راکھ میں سے چنگاریاں اکٹھی کر کے حال کی گیلی سوکھی لکڑیوں کو الاؤ میں تبدیل کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ نیک طبع کی توصیفی ترکیب میں نے اس لیے اضافہ کی ہے کہ دوسروں کے مستقبل کے بارہ میں فلاحی جذبے کے ساتھ سوچنا اس جوہر کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ گلی میں کسی

بچے کو دُکھی دیکھ کر ہر کوئی اُس کے پاس نہیں رُک جاتا اور جو رُک جاتا ہے اس کے شیشۂ دِل میں ضرور نیک طبعی اور انسان دوستی کی پری مکین ہوتی ہے۔ آخرِ عمر کا خاصا حِصّہ گزارنے کے بعد بلا وجہ تو اُن کو یہ خیال نہیں آگیا تھا کہ اپنے اسلاف کی داستانِ جدوجہد سے نوجوانوں کے قلوب کو گرمایا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میاں صاحب جب تک ملازمت میں رہے وہ صلہ رحمی کے اجمال کی تفصیل بنے عزیز و اقارب کی بساط بھر خدمت کرتے رہے۔ لیکن اب ریٹائر ہونے کے بعد اسی کارِ خیر میں حِصّہ لیتے رہنے کی خواہش اُن کو اس طرف لے آئی کہ اپنے ان شعوبی نونہالوں کو جو اثر پذیر سن و سال کے ہیں یہ باتیں بتائیں کہ ان کے بزرگوں نے کارزارِ حیات میں جسم و جاں کے کس رویہ کو اپنا امتیاز ٹھہرایا۔ اور اسی کے مطابق جزا و سزا کے پھول اور کانٹے دامن میں سمیٹتے گئے۔ اس ضمن میں ان کی یہ بات بڑی وزنی ہے کہ "محنت کے خوگر کے لیے بھوکا رہنا کسی دَور میں بھی مقدر نہیں ہوا کرتا" اقبالؒ نے اِسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے کہ ؎

گر زیک تقدیر خُوں گردد جگر
از خُدا می خواہ تقدیرِ دِگر

ذہن میں یہ سوال ضرور اُٹھتا ہے کہ مصنّف نے منگرال راجپوتوں کی سرگزشت ہی کو کیوں مشعل بنانا چاہا۔ بظاہر اس کی یہی وجہ نظر آتی ہے، کہ میاں صاحب کے سامنے پُوری "ملّتِ اسلامیہ" یا "ملّتِ پاکستانیہ" نہیں تھی۔ اپنی مختصر سی "نسلی ملّت" تھی جس کی روح کو ولولۂ تازہ دینے کے لیے اسی نسل کے اجداد کی داستانِ فتح و شکست ہی مفید رہ سکتی تھی جس کی میزان میں منگرال قوم سے تعلق رکھنے والا ہر فرد اپنے آپ کو تول کر گرانی و سبکی کا

اندازہ لگا سکتا تھا۔ اپنے بچوں کو اچھا شہری بننے کی تلقین کرنے والا باپ بھی وہی کام کر رہا ہوتا ہے جو ملک و قوم میں شہریت کے بہتر احساسات بیدار کرنے والا ریفارمر یا حاکم کر رہا ہوتا ہے اور عنداللہ دونوں ایک سے ماجور کہ ایک کے تعاون کے بغیر دوسرے کا کام دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح منگرال قوم کے نوجوانوں کو مصارفِ زندگی میں مردانہ وار قدم رکھنے کی ترغیب دینے کے لیے اس قوم کے بزرگوں کی زندگیوں کے مواقع اُن کے سامنے پیش کرنا جیسا کہ مصنّف نے خود بھی کہا ہے بجا طور پر ملی اور اسلامی خدمت ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید نفسیاتی حقیقت ہے کہ میاں محمد اعظم۔ میاں نور دخاں اور میاں رسول بخش کی زندگیوں کے نشیب و فراز منگرال قوم کے نونہالوں کے لیے کشور کشایانِ جہاں سے زیادہ اثر انگیز اور نقش ریزہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں ایک ذاتی حوالہ شامل ہے۔ وہی حوالہ جس کی بنا پر پنجابی اور پاکستانی ہوتے ہوتے میں اپنے آپ کو کنجاہی کہتا ہوں۔

جیسا کہ میاں صاحب نے خود بھی لکھا ہے منگرال قوم پر اس سے پہلے کسی نے ڈھب سے قلم نہیں اُٹھایا اس لیے ہر ایسے نقشِ اوّل کی طرح یہ نقش بھی نقشِ ثانی کی ضرورت کا جہاں اعلان ہے وہاں اس کام کو سہل کر جانے کا سہرا بھی زیبِ سر کیے ہوتے ہے۔ ہو سکتا ہے میاں صاحب ہی کل منگرال قوم کو بالخصوص اور ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے دیگر اہلِ ذوق کو بالعموم جن کا تعلق "کھوئے ہوؤں کی جستجو" سے ہے کوئی اور ایسی تالیف دے کر ممنون کر دیں جس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ پتہ چل سکے کہ یہ لوگ ابتداً کہاں آباد تھے۔ کہاں کہاں نقل مکانی کر کے آئے اور کیوں۔ ان کے نام کا لسانی اعتبار سے کیا مفہوم ہے اور راجہ ہانی ریونے اپنے بیٹے کا نام منگرال رکھا تھا تو کس بنا پر۔

یوں بھی ممکن ہے کہ اس کتاب سے جسے مصنف نے اپنے مخصوص غیر مبہم
اور عام فہم انداز میں جگہ جگہ ادبی چاشنی دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کسی اور
گنج کار کو تحریک ہو اور وہ اس کام کو اور آگے بڑھائے کہ تحقیق و تجسس کے
ایوان میں دئیے سے دیا جلتا آیا ہے۔

شریف کنجاہی

گجرات

۱۲، اپریل ۱۹۷۷ء

---

# مُقدمہ

علم تاریخ دُنیا کے قدیم ترین اور مفید ترین علوم میں شمار ہوتا ہے اور جامعۂ انسانی کے انفرادی اور اجتماعی اعمال و افعال اور کردار کا آئینہ دار خیال کیا جاتا ہے اگرچہ تاریخ، جس کا بنیادی مقصد اسلاف کے خوشگوار اور ناخوشگوار تجربات اور اُن کے بُرے یا بھلے نتائج کو اخلاف تک پہنچا کر اُن کو کجروی سے بچانا اور راہِ راست پر چلانا ہوتا ہے۔ مختلف شعبہ ہائے حیات میں گذشتہ نسلوں کے تجربات آیندہ نسلوں تک نہ پہنچائی تو شاید کوئی ملک، کوئی خاندان یا کوئی فرد ترقی کی منازل طے نہ کر پاتا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس کے توسط سے مختلف اقوام و افراد اور خانوادے ماضی کے تجربات کی روشنی میں اپنے حال کو حسبِ منشاء ڈھال سکتے ہیں، اور مستقبل میں ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعادہ نہ کرکے اُن کے ناخوشگوار نتائج سے بچ سکتے ہیں۔

بزرگوارم جناب میاں اعجاز نبی پی۔سی۔ایس (ریٹائرڈ) نے جو کہ گجرات (پنجاب) کے قدیم اشرافی خاندان منگرال راجپوت کے چشم و چراغ ہیں تاریخ کی اسی ضرورت، اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اپنے معزز و محترم خاندان کی یہ مختصر سی "تاریخ" قلم بند فرمائی ہے۔

میاں صاحب موصوف نے تاریخِ منگرال گجرات لکھ کر محض اپنا خاندانی فرض

ہی ادا نہیں کیا ہے بلکہ اپنی اس خدمتِ عظیم سے خاندانِ منگرالاں کے فرد فرد کو اپنا رہینِ احسان بھی بنالیا ہے۔

اب تک خانوادہ منگرالاں گجرات کے موجودہ افراد کے پاس جناب میاں محمد اشرف صاحب مرحوم کے مرتب کردہ مستند اور مصدقہ نسب نامہ کے سوا اور موثق تاریخی ماخذ موجود نہ تھا اور اُن کی تاریخ سرکاری دستاویزات، قبائل و عشائر کی تواریخ اور بزرگوں کے حافظوں میں محفوظ چلی آرہی تھی بزرگوں کے تیزی کے ساتھ اس دُنیا سے فانی سے اُٹھتے چلے جانے کے باعث یہ خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں اس تاریخی خاندان کی تاریخ حوادثِ روزگار کا شکار ہو کر تلف نہ ہو جائے۔ زیرِ نظر کتاب کے مصنف بجا طور پر اپنے اہلِ خاندان کے تشکر و امتنان کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے بروقت اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اُس تمام پراگندہ اور منتشر مواد کی جمع آوری کی طرف توجہ کرکے اس کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے اور اپنے خاندان کو قعرِ گمنامی میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ اُن کی مساعیٔ جمیلہ اور مخلصانہ کاوش و زحمت کشی کے باعث گجرات کے منگرال راجپوت خاندان کے مختلف افراد کی جہد للبقا اور شاندار ارتقاء کی قابلِ فخر تاریخ جو کہ گردشِ لیل و نہار کی گرد سے اَٹی پڑی تھی اور ماہ و سال کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی تھی، کافی حد تک روشنی میں آگئی ہے اور ماضی کی یہ روشنی جو بلاشبہ اُن کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے یقیناً منگرالوں کی نژادِ نو کے مستقبل کو روشن تر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

یقینِ کامل ہے کہ منگرالوں کا یہ تذکرہ اسلاف و اخلاف اُن کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے تمام افراد کے لیے نہ صرف یہ کہ مشعلِ راہ اور کتابِ راہنما

کا کام دے گا بلکہ اُن میں احساسِ خود شناسی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کے مختلف حصّوں میں پھیلے ہوئے اور قرابتداری کے باوجود ایک دوسرے سے دُور اور بیگانہ افرادِ خاندان کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے، آپس میں مربوط کرنے اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کو وحدت و یگانگت کی لڑی میں پرونے کا باعث بنے گا۔ کیونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فاضل مؤلف نے اس کے باوجود کہ تصنیف و تالیف اور خاص طور پر تاریخ نویسی اُن کا اصل میدان نہیں ہے، اس تاریخی تصنیف میں اپنے غیر معمولی تاریخی شغف کا مظاہرہ کیا ہے اور دادِ تحقیق و تفتیش دیتے ہوئے اس کو مفید سے مفید تر تاریخی دستاویز بنانے کی سعی فرمائی ہے۔ اعماقِ قلب سے یہ دُعا نکلتی ہے کہ خداوندِ قادر و توانا منگرال خاندان کے اس مایۂ ناز فرزند اور عظیم محسن کو صحت و سلامتی کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور اُس کو اپنے تاریخی خاندان کی قدیم تاریخ کے تاریک گوشوں کو اُجاگر کرنے کی مزید توانائی عطا فرماتے۔

اُمیدِ واثق ہے کہ یہ تاریخ نہ صرف یہ کہ خانوادۂ منگرال کی نشاۃِ ثانیہ کی راہ ہموار کرے گی بلکہ خود مؤلف کو اس خاندان کی تاریخ میں بقائے دوام سے ہمکنار کر دے گی۔

ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر ایم اے پی ایچ ڈی (تہران)
اُستاد شعبۂ فارسی، دانشگاہ پنجاب، لاہور

۴۹۴۔ شادمان کالونی، لاہور
۲۰ مئی ۱۹۷۷ء

# نوجوانانِ قوم کے نام

نقشِ پا اِس ڈھب سے دُنیا میں جماتے جایئے
راہبروں کو راہ منزل کی دکھاتے جایئے

کار فرما تُم باذن اللہ کی تفسیر ہے!
وحدتِ ملّی سے گرتوں کو اُٹھاتے جایئے

پھر خلوصِ دل سے ہو تقلیدِ رسمِ اہلِ حق!
پھر مئے توحید عالم کو پلاتے جایئے

ضبطِ آہ ہو یا تو متحمل سکوت وصبر کی
ہو فغاں تو ایک بستی کو جگاتے جایئے

"لن ترانی" کی ندا سے مطمئن ہونا بھلا
"ربِ ارنی" کہہ کے غش ہرگز نہ کھاتے جایئے

انفرادیت سے گھبرایئے غلامی ہے یہی
قطرہ کو دریا کی نوعیت بناتے جایئے

رُوحِ قربانی سے زندہ ہے جوانمردوں کا نام
ہو کٹھن منزل سرِ راہ مُسکراتے جایئے

زندہ قوموں کی متاع اُن کے جوانانِ غیور
مثلِ شاہیں وُسعتِ گردوں پہ چھاتے جایئے

اِتحاد و ضبط و نظمِ قوم سے اعجاز آج
کُفر کی اقتدار مٹی میں مِلاتے جایئے

اِعجاز نبی اِعجاز

باب اوّل

# ظہورِ انسانیت و قومیّت کا تخیّل

ذاتِ حق نے عالمِ موجودات کی تشکیل سیدنا حضرت آدم علیہ السّلام سے فرمائی جن سے موجودہ نسلِ انسانی کا ظہور ہوا۔ اوائل ہی سے فطرتِ انسانی میں انفرادیت، نمو، اور بقائے دوام کا جذبہ کارفرما ہوا۔ ہابیل اور قابیل فرزندانِ سیدنا آدم علیہ السلام کی باہمی کشمکش ہابیل کے قتل کا محرک بنی۔ چنانچہ اسی جبلّی احساسِ خود بینی کی نشو و نما نے خود ستائی اور ذاتی نمو کا جذبہ پیدا کیا جو بعد میں گروہ بندی، قبیلہ سازی اور فرمانروائی کا باعث بنا۔[1]

برِّ صغیر پاک و ہند میں بھی جو برِّ اعظم ایشیا کا ایک نمایاں خطہ ہے تاریخ انسانی کا آغاز پتھر اور دھات کے زمانہ سے ہوا۔ انسان مختلف ادوار سے گزرا۔ تاریخی شواہد کے مطابق شمال مغرب سے آریاؤں کی یلغار اس ملک کے قدیم باشندوں کول، بھیل، دراوڑ وغیرہم کو جنوب اور جنوب مشرق کی جانب دھکیلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس طرح یہاں پر نووارد اقوام کی حاکمیت قائم ہوئی۔ جنہوں نے یہاں مستقلاً قیام کر کے ایک سیاسی

---

[1] سورۃ مائدہ قرآنِ حکیم

کو جنم دیا۔ چونکہ وہ سب پاکیزگیٔ خون کے تحفظ کے داعی اور ذاتی برتری
کے جنون کے حامل ہونے کے باوصف گروہی کامرانی کے دائمی فروغ
کے متمنی تھے اس لیے انہی خیالات اور نظریات نے منوجی کو "منوسمرتی"
کی تحریر پر اکسایا چنانچہ منوجی نے اپنے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر
انسانوں کو پانچ مختلف زمروں میں تقسیم کر دیا۔ اور سب سے پہلے اس ملک
میں یہیں سے ذات پات کی ابتدا ہوئی۔ اس درجہ بندی نے "برہمن"
کا طبقہ اعلیٰ تشکیل کیا جس کا منصبِ علم و تدریس کے علاوہ مذہبی راہنمائی
اور رسوماتِ مذہبی کی سرانجام دہی کے باعث جلیل القدر مانا گیا۔

دوسرے نمبر پر "کشتری" رہا۔ جس کو مخالف اقوام سے جنگ اور دفاعِ
ملک کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔

تیسرے نمبر پر "ویش" کو رکھا گیا اور اس کے ذمہ کھیتی باڑی کا کام لگا۔

چوتھے نمبر پر "شودر" کی تشکیل عمل میں آئی۔ اور اس کو دستکاری کے
علاوہ بطورِ خادم کام سرانجام دینے کی ڈیوٹی ملی۔

سب سے نیچ طبقہ "چنڈال" کہلایا جس کو چوہڑے ۔ چمار کا کام دیا گیا
اور یہ طبقہ اس مفتوحہ مقامی آبادی پر مشتمل تھا جو آریاؤں کی لشکر کشی پر
اپنے وطنِ عزیز کی حفاظت کرنے سے قاصر رہی۔ چنانچہ یہ طبقاتی تقسیم ہندوستان
میں اشاعتِ اسلام تک مروج رہی۔ "تا آنکہ مختلف ادوار مابعد میں متعدد
فاتح اس برِ صغیر میں آئے جن کی اکثریت اسی سرزمین میں مستقلاً آباد ہو گئی
جس سے نہ صرف قدیم فرسودہ نظام تغیر پذیر ہوا بلکہ اسلامی نظریۂ حیات
کو عام شرفِ قبولیت ملا۔ قدیم سوسائٹی کے محاسن اور اسلامی نظریات کی
آمیزش کے نتیجہ میں مسلمان حکمرانوں نے اپنی اخلاقی اقدار اور باہمی خاندانی

ارتباط سے اس ملک کی جدید سوسائٹی کی تشکیل کر کے روابطِ آقا و رعایا
میں ایک حسین امتزاج پیدا کر دیا۔

شدہ شدہ اس خطۂ ارضی میں کئی اقوام ایسی صفات کی حامل اُبھریں
جن کے منفرد طالع آزمائی۔ جنگجوئی۔ شجاعت۔ مردانگی منفرد شخصی و ذاتی
اور علاقائی اوصاف کی بنا پر سرگروہ یا سردارِ کنبہ ہونے کی وجہ سے کسی
قوم کی خاص گوت کا آغاز ثابت ہوئے۔ یوں مختلف اقوام شیخ۔ سیّد۔
مغل۔ خلجی۔ لودھی۔ افغان۔ ترکمان۔ چدہان۔ درانی۔ راجپوت۔ کشمیری۔
جاٹ۔ گوجر وغیرہ میں "گوت" کا نیا تصوّر اُبھرا۔

---

باب دوم

# وطنیّت اور قومیّت کا تصوّر
## نظریۂ اِسلام کی روشنی میں

دُنیا کے مختلف ممالک میں نسل، گروہ، چھوٹی متعلقہ داریوں ریاستوں کے انتظام و انصرام کی اکائیوں یا کسی سربراہ کنبہ اور اُس کے ورثاء کو ایک دوسرے سے متمیز کرنے کا رواج قدیم ایّام سے چلا آرہا ہے۔ علاقائی سیادت و قیادت کے علاوہ انبیاء کرام کی مختلف اقوام کی ہدایت کے لیے بعثت قومیت اور محدود وطنیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی اخوّت و بھائی چارہ ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے۔ ہادیٔ برحق صلعم نے جو مکارم اخلاق و باہمی اخوّت کے امین اور سراجِ منیر ہیں اپنی عملی زندگی میں اکثر و بیشتر یہی تلقین فرمائی کہ ؎

ہے ساری مخلوق کُنبہ خُدا کا

اس کے باوجود مختلف مکاتیبِ فکر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اپنے نظریات کی تشہیر میں سرگرمِ عمل ہیں اور رہیں گے۔ تاہم نظریۂ قومیّت اور وطنیت کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ہمیں کلام اللہ اور سنتِ نبیٔ مکرم صلعم سے استنباط کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اسلام میں

نظریۂ وطنیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔
خود سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلعم کا اپنے مولدِ پاک مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں ہجرت فرما کر مستقلاً آباد ہونا اور صحابہ کرامؓ کا اپنے اپنے وطن کو اُن کی تقلید میں چھوڑ کر مدینہ معظمہ میں نقلِ مکانی کے بعد اکثر کا اُسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہونا۔ بلکہ اطرافِ عالم میں تبلیغ دین کے لیے مدینہ طیبہ کو بھی چھوڑ جانا، نظریۂ محدود وطنیت کی واضح الفاظ میں نفی کرتا ہے۔

صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے ادوار کے دوران اور بعدہٗ بھی ہجرت کا سلسلہ متعدد اقوام میں بالعموم اور اہلِ اسلام میں بالخصوص جاری رہا۔ طارق بن زیاد کا اُندلس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے سفینوں کو نذرِ آتش کر دینا بھی ثابت کرتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ؎

ہر مُلک مُلکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اس لیے اگر اسلام میں محدود وطنیت کا تصور مذہبی اساس کے طور پر موجود ہوتا تو صحابہ کرام اوّلاً مکہ مکرمہ سے اور ثانیاً مدینہ طیبہ سے دُنیا کے مختلف گوشوں میں دینِ حق کی تبلیغ اور سربلندی کے لیے نہ نکل کھڑے ہوتے۔ یہود کا سرزمین فلسطین میں چار دانگِ عالم سے ہجرت کر کے اکٹھا ہونا۔ اور پاک بھارت تقسیم کے نتیجہ میں آبادی کی منتقلی بھی نظریۂ وطنیت کی نفی کے کھُلے ثبوت مہیا کرتے ہیں۔

اگر اسلام میں ہجرت پر وطنیت کو برتری دی گئی ہوتی اور حضور نبی مکرمؐ اپنے مولد مکہ مکرمہ میں ہی رہائش پذیر رہتے تو اُمّتِ مسلمہ صرف ایک

خطّہ میں محدود ہو کر رہ جاتی اور اُن پر یہ حقیقت کسی طرح بھی آشکار نہ ہوتی کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں !

ہجرت بلاشبہ شرفِ انسانیت کے حصوُل کا زینہ ہے۔ اور سفر وسیلۂ ظفر۔ موجودہ سائنسی دور میں تسخیرِ کائنات کا محرک اور نئی بستیاں اور ویرانے تلاش کرنے کا جذبہ انسانی آبادکاری کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا احساس ہی تو ہے۔ ورنہ اگر انسان وطنیت کے چکر میں پھنس کر خود کو اپنی موجودہ سکونتی حدود میں مقید کر لیتا تو اُس کی زندگی کولھو کے بیل کی طرح ہی گزر جاتی۔ اُسے مختلف ممالک اور اقوام کی ترقیات اور اشیاء احتیاج سے قطعاً خبر نہ ہوتی اور اُس کی اپنی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتیں۔ ان شواہد سے یہ فطری نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اسلام میں مخصوص وطنیت کا کوئی کٹر نظریہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ جہاں بھی اُس کے پیرو اپنی زندگی خدا اور رسولِ مکرّم کے احکامات کی روشنی میں گزارنے کی آزادی سے ہمکنار ہو سکیں وہی اُن کا وطن ہے۔ اندریں حالات ہجرت ایک مستحسن اقدام ہے اور اسے مذہب اسلام کی نظریاتی اور عملی اعانت حاصل ہے۔ شاعرِ مشرق نے اِسی سلسلہ میں کیا خوب کہا ہے ؎

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ مِلّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اب اسلام میں نظریۂ قومیّت اور اس کے رجحانات کا تجزیہ کیجیے۔ جس سے اس کتاب کی مذہبی نقطۂ نظر سے تدوین متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے اس اقدام و جسارت کی اساس سب سے پہلے اس دلیل

پر قائم ہے کہ خود خالقِ حقیقی نے مختلف ادوار میں مختلف اقوام میں علیحدہ علیحدہ اور فرداً فرداً انبیاء و رسول مبعوث فرمائے۔ اگر قومیت کے نظریہ کا فروغ مشیتِ ایزدی کے خلاف ہوتا تو تمام ہستی کے لیے ایک ہی "ملتِ آدم" تخلیق ہوتی اور حضرت نوحؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت داؤدؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور خود سرورِ دوعالم حضرت محمد رسول اللہ صلعم (فداہ ابی و امی) علیحدہ علیحدہ خطۂ ارضی اور اقوام میں نہ بھیجے جاتے۔ اور مختلف آسمانی کتابیں اور صحیفے مختلف ادوار میں مختلف اقوام کی اصلاح کے لیے قادرِ مطلق کی طرف سے وحی نہ کیے جاتے۔ خود رسولِ معظمؐ کے دورِ نبوت میں مہاجرین کی جانب سے شاہ نجاشی کے دربار میں یہودِ مکہ کے اعتراضات کے جواب میں حضرت جعفرؓ کا تاریخی خطبہ اسی حقیقت کی کھلے دربار میں نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ پاک نے "ہماری قوم" میں ایک نبی مبعوث فرمایا۔ گویا اللہ کریم نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے اُن کی قوم میں سے اپنا پیامبر اور نبی انتخاب فرمایا۔ قوموں کے وجود اور امتیاز تشخص کو ظاہر کرنے کے لیے قرآنِ حکیم کے پارہ ۲۶ کی ذیلی سورۃ الحجرات ایک قطعی اور واضح شہادت کے طور پہ پیش کی جاسکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ :- اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہارے قبیلے اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت

کرسکو۔ تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو صاحبِ تقویٰ اور زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اس آیۃ کریمہ میں خداوندِ بزرگ و برتر نے قومیت اور برادری کی تشکیل کی وجہ مختلف قوموں کی باہمی شناخت بیان فرمادی۔ لیکن شرافت کی اساس تقویٰ اور پرہیزگاری متعین فرمائی۔ لاریب اپنی نسل۔ خاندان اور قوم پر بے جا فخر۔ کسی دوسرے خاندان۔ قوم کنبہ یا نسل کے فرد یا افراد کو نسلی عصبیت کی وجہ سے کمتر یا اپنے سے حقیر تصور کرنا تقویٰ اور پرہیزگاری کے منافی فعل قرار دیا گیا۔

خود پیغمبرِ اسلام جو تمام دُنیا کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمائے گئے نے اپنے عظیم مشن کا آغاز اپنے اہلِ خانہ، اہلِ کنبہ اور اہلِ قوم سے کیا۔ اور مشیّت ایزدی بھی یہی تھی۔ مذہب اسلام میں اُمتِ واحدہ کا تصوّر بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور اسی نقطہ کو حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

بتانِ رنگ و بُو کو توڑ کر ملت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

یہ اکائی کیسے عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ اس کی واحد صُورت مختلف گروہ۔ قومیتوں اور زمروں میں بٹے ہوئے افراد کی فرداً فرداً اور قومیت وار اصلاح تھی۔ اور یہ مختلف قومیتیں احکامِ خداوندی کے تابع ایک دوسرے کی پہچان کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھیں۔ اس لیے قومی اور قومیتوں کی تاریخ محض جاننے اور پہچاننے کی حد تک محدود ہے۔ اور یہ نظریہ کسی صُورت میں بھی ملت اسلامی کی تشکیل کے عمل سے متصادم نہیں ہے۔

اِسلام نے نسب کی حفاظت کی مخالفت میں کچھ نہیں کہا۔ بلکہ باہمی جان پہچان اور تعارف کی غرض سے کنبوں اور قبیلوں کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ اپنے اپنے نسب سے آگاہ رہنے کی تاکید میں ترمذی کی اس حدیث سے استفادہ اس حقیر سی تصنیف کی افادیت کا ضامن ہوگا۔ ارشادِ رسول صلعم ہے۔

"تعلموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم فان صلۃ الرحم محبۃ فی الاھل مثراۃ فی المال منسأۃ فی الاثر۔ (حدیث ترمذی)

ترجمہ: تم اپنے نسبوں کا علم سیکھو تاکہ اس کے ذریعے تم اپنے رشتے ملاؤ۔ بے شک اپنے اقربا سے سلوک رکھنا کنبے میں محبت پیدا کرتا ہے اس سے مال میں زیادتی ہوتی ہے اور عمر بڑھتی ہے۔

چنانچہ اس زمرہ میں ہادیٔ برحق کی زندگی اور سیرت ایک کھلی کتاب ہے۔ آپ کی مکی اور مدنی زندگی کے سینکڑوں واقعات اور شواہد ان خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ذیل میں چند ایک مثالیں قارئین کے لیے باعثِ دلچسپی اور آگہی میں ممد ثابت ہوں گی۔

ایک موقع پر بنو ثقیف کا ایک[1] وفد جو اس قوم کے معززین پر مشتمل تھا۔ نبی مکرم کی خدمتِ اقدس میں باریاب ہوا۔ یہ وفد مدینہ طیبہ میں ۹ھ میں حاضر ہوا تھا۔ مغیرہ بن شعبہؓ نے عرض کی کہ یہ میری "قوم" کے افراد ہیں اگر اجازت ہو تو انہیں خاطر مدارات کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لوں۔ جواباً حضور نے ارشاد فرمایا۔ "میں تمہیں اپنی "قوم" کی تعظیم و تکریم سے منع نہیں کرتا۔ لیکن انہیں ایسی جگہ اُتارو جہاں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑے۔"

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۱۶

چنانچہ جناب مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنی قوم کے ان افراد کی حتی المقدور تکریم و تحریم کی۔

غزوۂ بدر کے اسیروں میں حضور نبی معظمؐ کے حقیقی چچا سیدنا عباسؓ بھی شامل تھے۔ وہ ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ دیگر اسیرانِ مکہ کے ہمراہ اُن کی مشکیں بھی کس دی گئیں اور اسی حالت میں وہ رات بھر درد کی شدت سے کراہتے رہے۔ حضورؐ رحمتِ دو عالم اُن کی آواز سُن کر بےچین ہو گئے اور آپ نے اُس وقت تک آرام نہ فرمایا جب تک کہ حضرت عباسؓ اور اُن کے طفیل جملہ اسیران کی مشکیں ڈھیلی نہ کر دی گئیں اور اس طرح قرابت داروں سے صلۂ رحمی کی مثال قایم فرمائی گئی جو حضور کی شفقت اور سراپا رحمت ہونے کی بھی دلیل تھی۔ حالانکہ وہ سب لوگ مکہ سے دینِ اسلام اور اُس کے پیروکاروں کا قلع قمع کرنے آئے تھے۔ اپنوں سے صلہ رحمی کا ایک اور واقعہ فخرِ موجودات صلعم کے اپنے خانوادہ سے وابستہ ہے۔ آپ کے داماد ابو العاصؓ حالتِ کفر میں حمالِ تجارت مدینہ طیبہ میں گرفتار ہوئے۔ مہاجر و انصارِ مدینہ نے اُن کا مال و اسباب آپس میں بانٹ لیا۔ حضور کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو فرمایا "ابو العاص کا تعلق جو مجھ سے ہے وہ تم سب کو معلوم ہے (وہ حضور کی صاحبزادی حضرت سیدہ بی بی زینبؓ کے شوہر تھے) اُس کا جو مال تمہیں ملا ہے وہ بیشک اللہ کی دین ہے لیکن اگر یہ مال تم اسے لوٹا دو تو میں اِسے پسند کروں گا۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کرنا چاہو تو تم اس مال کے زیادہ حقدار ہو"۔

چنانچہ حضورِ اکرم کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے صحابہ نے اسی آن تمام کا تمام چھینا ہوا مال اُنہیں واپس کر دیا۔

انھیں ابوالعاص کی آزادی کی خاطر اُن کی منکوحہ بنتِ رسول صلعم حضرت بی بی زینبؓ نے اپنی ماں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی طرف سے دیا گیا جہیز میں ہار فدیہ میں بھجوایا تو حضور سردارِ دوجہاں کے دل میں اپنی محبوب زوجہ کی یاد تازہ ہو گئی اور فرطِ غم سے حضور آبدیدہ ہو گئے۔ یوں آپ کے اس داماد کو جو ابھی حالتِ کفر میں ہی تھے نہ صرف رہائی مل گئی بلکہ وہ طلائی ہار بھی سیدہ بی بی زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔ حضورؐ کے عہد کے یہ واقعات اپنوں سے صلۂ رحمی اور محبّت کا واضح ثبوت مہیا کرتے ہیں، اور ہمارے لیے اپنوں سے اظہارِ وفاداری اور صلۂ رحمی کی راہیں متعین کرتے ہیں۔

اسی طرح فتح مکہ کے موقعہ پر فخرِ موجودات سرورِ کائنات نے قریشِ مکہ اور دیگر مفتوحین سے نیک برتاؤ اور صلۂ رحمی کی جو اساس مہیا فرمائی وہ حضور صلعم کی رحمت للعالمین عفو اور جود و سخا پہ دلالت کرتی ہے۔ قیامت تک کے لیے اپنوں اور غیروں سے فیاضانہ سلوک کی مقتضی ہے۔ فتح مکہ کے لیے لشکرِ اسلامی ترمیت وار ترتیب دیا جاتا ہے اور اپنی اپنی قوم کے سرداروں کی زیرِ قیادت اسی ترتیب سے مکہ معظمہ کی طرف رواں دواں ہے یوں اسلامی سیادت میں اس قومی یکجہتی کا مشاہدہ حضرت عباسؓ کی وساطت سے ابوسفیان سردارِ قریش کو کرایا گیا جس سے اُس کے دل میں اسلامی عظمت نقش ہوئی۔ لشکرِ اسلام کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ قبیلہ بنو سلیم اپنے سردار عباس بن مرداس سلمی کی قیادت میں سرتاپا آہن پوش بطور مقدمۃ الجیش۔ بنو جہنیہ کی اسلامی پلٹن اپنے سردار عقبہ بن عامرؓ الجہنی کی سرکردگی میں۔ قبیلہ مزینہ کی فوج ظفر موج اپنے

سردار نعمان بن منذرؓ کی راہنمائی میں بنو تمیم اپنے سردار اقرع بن حابس تمیمی کی قیادت میں اور بنو حمیرا اپنے سالار دحیہ کلبیؓ کی کمان میں کفارِ مکہ کی سرکوبی کے لیے بنو کندہ اپنے سردار مقداد بن اسود کی راہنمائی میں اور بنو عبس اپنے سردار عمار بن عیسیٰ کے زیرِ علم خود بنو ہاشم اپنے سردار فضل بن عباسؓ کی قیادت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر قبائل عرب جو بھی دین اسلام کی برکتوں سے مشرف ہو چکے تھے اپنے اپنے ہم قوم سالاروں کی نگرانی میں مکہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔

لشکرِ اسلام کا قومیت وار ترتیب دیا جانا بھی اہلِ اسلام کو اس بات کی تعلیم دینا مقصود تھا کہ جس طرح مختلف ندی نالے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے کسی دریا میں خود کو ضم کر کے اپنے لیے نیا نام اختیار کر جاتے ہیں اور مختلف دریا باہم دِگر مل کر یا علیحدہ علیحدہ سمندر میں جا گرتے ہیں اسی طرح مختلف قومیت، رنگ و نسل کے افراد اپنی اپنی حیثیت تعارف کی حد تک برقرار رکھتے ہوئے سوادِ اعظم کے جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ملتِ واحدہ میں ضم ہو کر ملتِ اسلامیہ کہلائیں گے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

آخر میں ایک اور مثال بیان کر کے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ مکہ فتح ہو چکا ہے۔ مشرکینِ مکہ جن میں اکثریت قریش اور خانوادۂ بنو ہاشم کی بھی ہے۔ بطور مفتوحین خمیدہ سر موجود ہیں۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر ہجرت سے پہلے اور بعد بھی لاکھوں ستم ڈھائے تھے اور وہ بھی ہیں جنہوں نے خود رسولِ اکرم صلعم اور اُن کے خانوادہ کو مشقِ ستم

بنایا تھا۔ حالتِ نماز میں حضورؐ کے جسدِ اقدس پر گندگی رکھنے اور رکھوانے والے۔ جنگِ اُحد میں دندانِ مبارک شہید کرنے والے۔ آپ کی دُختر نیک اختر بی بی زینبؓ کو نیزہ مار کر زخمی حالت میں اُونٹ پر سے گرانے والے۔ آپ کے عزیز ترین شجاع چچا سیدنا حمزہؓ کو دھوکہ سے وحشی کے ذریعہ اُحد میں شہید کرنے اور کرانے والے۔ اُن کی نعش کا مُثلہ کرنے والے اور اُن کا کلیجہ دانتوں میں چبانے والی ہندہ۔ غرض کس کس کا ذکر کیا جاتے۔ جب حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوئے تو ایک عظیم فاتح کی حیثیت میں بھی آپؐ نے صرف اس قدر ہی جامع الفاظ ارشاد فرماتے۔ "جاؤ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے تم سب آزاد ہو۔"

سرورِ کونین کی پاک تعلیمات عالمِ انسانیت کے لیے رہتی دُنیا تک روشنی کا مینار ہیں۔ ان کی روشنی میں باہمی یگانگت، بھائی چارہ، اُخوت اور قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہی حاصلِ زندگی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا انسان کو!
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

قدیم ساکنانِ کشمیر میں تحفظِ ریکارڈ اور انفرادیت کی خو بدرجۂ اُتم موجود تھی۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ضعف قوت اور سابقہ اقدار سے لاپرواہی نے اُنہیں اسلاف کی یاد سے بھی یکسر محروم کر دیا یہاں تک کہ وہ اُن کے عظیم کارناموں سے قطع نظر اُن کے نام تک بھول گئے۔ اس کا منطقی نتیجہ اس صورت میں یہی نکلا کہ کشمیری مسلمانوں کی قدیم ذاتوں اور گوتوں کو یُوں فراموش کر دیا گیا کہ جیسے اُن کا وجود تک نہ تھا اور خطابی۔ القابی۔ اعزازی۔ صفاتی۔ نسبی۔ کاروباری۔ پیشہ ورانہ۔ عُرفی

اور تخلصی نام نئی ذاتوں اور گوتوں کے مبداء و محرک ٹھہرے۔ چنانچہ منگرال قوم بھی راجہ منگرپال کی نسبی رعایت کی مرہون معلوم ہوتی ہے۔

ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی یکجہتی ہی ہر ایک سچے مسلمان کا عقیدہ ہونا چاہیئے اور راقم بھی اسی میں یقین رکھتا ہے لیکن مجھ ایسے ہیچمدان اور بے سروسامان انسان کے لیے اکیلے اس عظیم قومی فریضہ سے عہدہ برا ہونا ممکنات میں سے نہ تھا۔ چنانچہ اپنی اس حقیر پیشکش سے اس سلسلہ میں صرف ابتدا کرنا مقصود تھی کہ یوں اگر اپنے اس مختصر گروہ میں یکجہتی نام کی چیز پیدا کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہو سکتا ہے۔ کہ میری اس پرخلوص کوشش سے قوم منگرال کے باہمی روابط استوار ہو کر سوادِ اعظم کا جزو بن جائیں اور یہی حقیر سعی مشکور ہو کر میری نجات کا باعث ہو جائے کیونکہ ؎ رحمتِ حق بہانہ می جوید

---

باب سوم

# لفظ راجپوت کا مفہوم اور ابتدائی حالات منگرال قوم

قدیم ہند کے مختلف صوبہ جات اور ریاستوں کے چھوٹے چھوٹے سردار اور حکمران اپنے اپنے حلقۂ اقتدار میں راجہ کہلاتے اور ان پر اقتدارِ اعلیٰ کے حامل نے خود کو مہاراجہ کے لقب سے ملقب کیا۔ چونکہ یہ راجے خود کو اپنے پیش رو راجہ کا پوت کہلاتے تھے اس لیے یوں لفظِ راج پُوت (یعنی راجہ کا پُوت یا لڑکا) کی تشکیل ہوئی۔ ویسے لفظِ راجپوت کا لغوی اور معنوی سرچشمہ منوجی کا فکری مجوزہ لفظ "کشتری" ہے جو قدیم بھارت میں بہادر اور جنگجو فرقہ کے لیے مستعمل تھا۔ اور جو مرورِ ایام سے بگڑ کر "کھتری" ہو گیا۔ دراصل یہ "کھتری قوم" راجپوت قوم ہی سے تعلق رکھتی ہے

اس حقیقت کی تصدیق جناب ایچ۔ اے۔ روز صاحب نے اپنی کتاب گلاسری آف ٹرائبز پنجاب و سرحد کی جلد سوم کے صفحہ نمبر ۲۷۴ تحتی ضمن قوم راجپوت میں یوں یہ صراحت کی ہے کہ راجپوت اور کھتری ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ہندو محققین[1] کے مطابق سری رام چندر جی بنسی شاخ سے تھے جبکہ کورو اور پانڈو چندر بنسی شاخ سے ہیں۔ ہر دو شاخیں برہما

---

[1] تاریخ اقوام پونچھ حصہ اوّل از محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۷۴

کے ایک پوتے بسیوان جس کا نام سورج بھی تھا اور دوسرے پوتے چندرمان جس کو سوم بھی کہتے ہیں سے معرضِ وجود میں آئیں۔

راجپوت قوم کی کم و بیش ۳۶۸۴ بڑی شاخیں ہیں[1] جبکہ ان شاخوں کی ۶۰۰۰ کے لگ بھگ گوتیں ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی ابتدائی اصل ذاتوں اور گوتوں میں انقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمران طبقہ میں مختلف القاب، عہدوں اور مخصوص امور کی سرانجام دہی کرنے والوں نے اپنے اپنے مناصب کے عنوان کو اپنی ذات اور گوت قرار دیا اور یوں نسلاً بعد نسلاً بزرگوں کا پیشہ یا عمل آنے والی نسلوں کی قومیت اور گوت قرار پاگیا۔ کشمیر کے وید بھاشا جاننے والے پنڈت کہلاتے تھے جبکہ مسلمان علماء، خواجہ، شیخ، ملّا، سیّد، پیر، قاضی وغیرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ذاتی خصوصیات بھی گوت کی صفت میں ڈھل کر مختلف طبقاتِ آبادی میں مختلف گوتوں کو جنم دے گئیں۔ مثلاً مسکین (غریب)۔ ریشی (عابد)۔ درویش (فقیر)۔ پہلوان (ورزش کرنے والا)۔ بڈا (بوڑھا) بازاری۔ وچاری (سوچ بچار کرنے والا)۔ سپرو (پڑھنے میں پہل کرنے والا) تنتران (مضبوط اور بھاری جسم والا)۔ رگھو (سخی)۔ شالا (گورا آدمی)۔ لونگر (لنگڑا)۔ سُم جی (سمجھدار)۔ کھتورہ (بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا) کنہ (کان کٹا)۔ ڈود (جلی ہوئی پسلی والا)۔ ٹنگرو (غریب)۔ ناوچود (کشتی بان)۔ ٹھانٹھر (بزاز)۔ کرال (کمہار) ۔ ثیٹھو (مٹی کے برتن بنانے والا) چاٹی گسرو (زیور کا دھاگہ ڈالنے والا)۔ بخشی (محکمہ دیوانی کا افسر) نوطہ دار (خزانچی)

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم، کشمیری ذاتوں کے عجائبات از محمد عبداللہ قریشی صفحہ نمبر ۳۶۲

خرابو (ٹکسال کا افسر)۔ ناظر (مہتمم لنگر)۔ مشکی (سقہ)۔ واز (باورچی)۔ بہرو (بہروں کے میر منشی یعنی پنچبال نویس)۔ آگاہ (سبزی فروش)۔ آرم (سبزی کاشت کرنے والا)۔ کھنڈواو (پشمینہ کاتنے والے)۔ ڈگرو (چرخہ سے ریشم کاتنے والا)۔ کھار (لوہار)۔ چھان (نجار)۔ صرافِ پوٹور (ریشم نکالنے والا) شوش (کلیجی بیچنے والا)۔ وانگن (بینگن بیچنے والا) وکیل۔ باہر سے آنے والے یا اندرونِ ملک وقصبات سے آنے والوں کے گاؤں یا جگہ کی نسبت سے پکارے جانے والے بھی اُسی نام کی رعایت سے ایک مخصوص گوت کے حامل ٹھہرے۔ ریاست کی سال ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ذیل کی نئی گوتوں کا اضافہ ہوا۔ حکیم (حکمت کرنے والے)۔ قلمدانی (دیکھنے والے)۔ حاجی (حج کی سعادت سے مشرف ہونے والے)۔ شاہ (سید)۔ حافظ (قرآنِ پاک زبانی یاد کرنے والے)۔ پٹواری (محکمہ مال کے اہلکار)۔ شاعر۔ دیو۔ سلطان۔ قاضی۔ سال ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں مسلمان ذاتوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے متجاوز تھی۔ ان میں سے کم از کم ایک ہزار ذاتیں ایسی تھیں جن کا وجود خطہ کشمیر سے ناپید تھا۔ ان ذاتوں میں مکار۔ زنگی۔ جوان۔ گنذاری۔ صابن۔ تمباکو۔ بدرو۔ خوش رُو۔ لُچا۔ شہدہ۔ بیٹھ بکس۔ زار (قمار باز)۔ لچر۔ عارف۔ عنی۔ نمدہ۔ افیم۔ زرد (بہرہ)۔ گنجو (گنجا)۔ دالال (دلال)۔ موزہ۔ اولاد۔ تنخواہ۔ کلیجہ۔ گشتابہ۔ انار۔ مرچ۔ ٹھول (انڈہ)۔ مصالحہ۔ کاو (کوا)۔ ککڑ (مُرغ)۔ کھر (گدھا)۔ حلوہ۔ کوتر (کبوتر)۔ کانز (چڑیا)۔ شال (گیدڑ)۔ کبو (کبڑا)۔ واند (بیل)۔ گاڑہ (مچھلی) ذکر (مکڑی)۔ نول (نیولا)۔ کچلو (بکرا)۔ بُلبل۔ بجلی۔ گگُر (چوہا)۔ ستنت (ہُد ہُد) وونٹھ (اونٹ) بطورِ عرفِ عام یا ال جس کو انگریزی میں NICK NAME کہتے ہیں کی وجہ سے مروّج ہوگئیں۔ اور یوں نئی ذاتوں اور گوتوں کا ارتقا ہر

ہوتا رہا۔

اسی طرح مخصوص ابتدائی ذاتوں کا بھی معرضِ وجود میں آنا بآسانی سمجھا سکتا ہے۔ چونکہ یہاں صرف راجپوت قوم اور اُس کی گوت منگرال کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس لیے اس ذات کی نسبت ہی تحقیق کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔

ابتداً راجپوت خود کو سورج بنسی۔ چندر بنسی اور اگنی کھنڈ کے تین زمرں میں شمار کرتے تھے۔ اور برصغیر ہند میں اُن کی غالب اکثریت اجودھیا کے راجہ دھسرت کے پسر سری رامچندر کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتی تھی۔ چندر بنسی راجپوتوں کی متعدد گوتوں میں سے ایک گوت منگرال راجپوت بھی ہے جس کا تذکرہ اس تالیف میں مقصود ہے۔

ابتدائی تصدیق[1] کے مطابق اجودھیا کے راجہ ہرلیش چندر کے لواحقین میں سے ایک راجہ بیکانیر کی ریاست کا حکمران ہوا۔ جس کے جانشین پانچ پشت تک وہاں حکمران رہے اس خاندان کا آخری حکمران ھانی دیو تھا۔ جو ترکِ سکونت کر کے سیالکوٹ آگیا۔ یہاں اُس کے ہاں ایک فرزند منگر پال تولد ہوا۔ جب وہ عنفوانِ شباب کو پہنچا تو اُس کا والد انتقال کر گیا۔ راجکمار منگر پال نے جو جواں سال اور فنِ سپہ گری میں مشاق تھا۔ مہم جوئی کے لیئے ریاست جموں و کشمیر

---

[1] کوائف پر مصدقہ شجرہ نسب ابتدائی زیر تحویل میاں فیاض اصغر و شجرہ نسب بندوبست اراضیات موضع بانٹھ تحصیل گجرات مرتبہ سال ۱۸۶۸ء

کے علاقہ میرپور کی تحصیل کوٹلی کی راہ لی - یہاں کی آب وہوا اور قدرتی مناظر سے وہ اس قدر مرعوب ہوا کہ اُس نے واپسی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے یہیں[1] اپنی حکومت قائم کرنے کی ٹھانی - چنانچہ اُس کی وفات کے بعد اُس کا واحد پسر راجہ ہند دیو سریر آرائے مملکت ہوا - راجہ ہند دیو ایک دھرم وید اور رعایا پرور راجکمار تھا - وہ ایک صاحبِ اقبال راجہ تھا - موضع کوٹلی گمرالاں بھی اُس کے والدِ گرامی کے نام پہ آباد ہوئی تھی - اور یہی اُن کی حکمرانی کے دوران اُن کی ریاست کا پایۂ تخت تھا - اُس کی وفات پہ اُس کا ہونہار ولی عہد[2] سہنس پال گدی کا وارث بنا - یہ نوجوان بھی اپنی حکمتِ عملی - فراخ حوصلگی اور سخاوت کی بناء پہ اپنی رعایا میں خاصا مقبول تھا - اُس نے اپنے دورانِ اقتدار میں موضع سہنسر ساوہ اپنے نام پہ آباد کیا اُسے گیان دھیان اور دھرم دیتا اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی - چنانچہ اس نے اس بارہ میں اپنے رجحانات کے پیشِ نظر تحقیق وتدقیق جاری رکھی - ۱۳۲۶ء کے لگ بھگ ہندوستان دینِ اسلام کی ضیا پاشیوں سے منوّر ہو چکا تھا - ریاست کشمیر چونکہ ہندوستان کے شمال مغرب میں تھی اور دور اُفتادہ تھی اس لیے اس میں اسلام کی تعلیمات ۱۳۲۹ء کے قریب پھیلنا شروع ہوئیں جبکہ رینچن شاہ نے تبت سے وارد کشمیر ہو کر بلبل شاہ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر کے بطور صدرالدین حکمران ہو کر راجہ سہدیو کی حکومت کا خاتمہ کیا - جس کے نتیجہ

---

[1] تاریخ اقوام پونچھ حصہ دوئم صفحہ نمبر ۱۸ مؤلفہ محمدالدین فوق

[2] تاریخ اقوام پونچھ حصہ دوئم صفحہ نمبر ۱۸ مؤلفہ محمدالدین فوق

میں اُس کی رعایا کی غالب اکثریت نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ سُلطان سکندر شاہ معروف بہ بُت شکن کے دورِ حکومت میں ریاست جموں کشمیر میں اشاعتِ اسلام کا کام پورے انہماک سے ہوا۔ اور اس طرح ریاست کے ہر حصّہ میں حکمران طبقہ کی پیروی میں اُن کی رعایا بھی جوق در جوق مسلمان ہوتی گئی۔ راجہ سہنس پال اور اُس کے اہلِ خاندان نے بھی دینِ اسلام قبول کر لیا۔ اور یوں[1] یہ حکمران خاندان اپنے علاقہ کوٹلی اور گرد و نواح میں اسلامی روایات کا امین بن گیا۔ منگرال مسلمان اس زمانہ میں بڑے صاحبِ اقبال تھے۔ بعد میں افغانوں کی یلغار اور ریاست پر ان کی بالادستی کی بناء پر منگرال قوم اپنی سکونتی تحصیل کوٹلی میں عام حیثیت میں آباد رہی۔ تا آنکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پنجاب پر حاکمیت قائم ہو گئی۔ ضلع گجرات پر مہاراجہ کا تسلط ۱۸۰۹ء میں ہوا۔ اور اُس نے اپریل ۱۸۱۱ء[2] میں پہلی بار ریاست جموں کشمیر کے علاقہ بھمبر اور راجوری میں فوج کشی کی۔ پھر سال ۱۸۱۲ء[3] میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ولی عہد کنور کھڑک سنگھ کی سرکردگی میں ایک مہم راجہ سلطان خان حکمرانِ بھمبر اور راجوری کے خلاف روانہ کی۔ اس مہم میں سکھوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن سکھ فوج کی واپسی کے بعد افغان سردار نے پھر سے

---

[1] تاریخ راجگان جموں و کشمیر صفحہ نمبر ۱۳-۸۴ مصنفہ ٹھاکر کاہن سنگھ

[2] THE PUNJAB SERIES VOLUME II YEAR 1897.

[3] ORIGIN OF THE SIKH POWER IN THE PUNJAB BY HENRY. T. PRINSEP — PAGES 63, 67, 72.

اُٹھایا اور اپنے سابقہ علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک لشکرِ جرار زیرِ نگرانی مصر دیوان چند ترتیب دیا اور ۲۳ جون ۱۸۱۹ء کو علاوہ علاقہ راجوری و پونچھ سلسلہ پیر پنجال کی جملہ پہاڑیوں اور جنوبی دروں پر تصرف اور تسلط حاصل کر لیا۔ بعدہٗ ۵ جولائی ۱۸۱۹ء کو افغان فوج کو شکست دے کر مہاراجہ کی افواج نے تمام وادی کشمیر پر قبضہ کر لیا اور خان محمد اعظم کے مقرر کردہ گورنر کشمیر جابر خان کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے موتی رام پسر دیوان محکم چند کو گورنر کشمیر تعینات کیا۔ اور یوں یہ علاقہ مکمل طور پر اُس کے زیرِ نگیں آ گیا۔

راجہ اگر خان آف راجوری کو گرفتار کرنے کے عوض سردار گلاب سنگھ برادر میاں دھیان سنگھ ڈیوڑھی والہ کو علاقہ جموں میں جاگیریں عطا کی گئیں۔ جون ۱۸۲۰ء میں موتی رام کو عہدہٴ گورنری سے معزول کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہری چند نلوہ کو گورنر کشمیر مقرر کیا۔ لیکن اُس کی سخت گیری اور رعایا کو ہراساں کرنے کی پاداش میں دسمبر ۱۸۲۰ء میں اُسے بھی معزول کر کے پھر سے دیوان موتی رام کو ریاست کا گورنر بنا دیا گیا۔

ان ایّام میں ریاست کی حدود میں عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

---

۲۸ک تاریخ اقوامِ کشمیر جلد سوئم صفحہ نمبر ۹۸ از محمد الدین فوق

THE PUNJAB SERIES VOLUME II OF YEAR 1897. ORIGIN OF THE SIKH POWER IN THE PUNJAB PAGE 97,98, BY HENRY T. PRINSEP.

سکھ فوج کی مسلسل یلغار۔ چھینا جھپٹی اور سابق افغان حکمرانوں کی وفاداری کی پاداش میں شرفا اور سابقہ ذی اثر خانوادوں کی رسوائی روزمرہ کا معمول تھی۔ یہ سلسلہ انگریزوں کے پنجاب اور ریاست جموں کشمیر پر مکمل قبضہ تک جاری رہا۔ آئے دن کی بے اطمینانی بہت سے ریاستی باشندوں کی نقل مکانی کا موجب بنی اور انہیں ایام میں راجپوت منگرال قوم کے خانوادہ کے چشم و چراغ راجہ عبدالحکیم کو اپنا وطنِ عزیز معہ اپنے جملہ افرادِ کنبہ چھوڑنا پڑا گویا

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آتے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

---

## بابِ چہارم

# ریاست جموں کشمیر کا تاریخی پس منظر اور مختصر جائزہ

کشمیر کی تاریخ قریباً پانچ ہزار ایک سو سے زائد سالوں پر محیط ہے۔ قدیم کتابوں[1] نیلمت مصنفہ پنڈت نیل ناگ۔ راج ترنگنی مصنفہ کلہن پنڈت وزیر و مشیر خاص راجہ جے سنگھ وایلے ریاست کشمیر۔ پوران۔ رامائن۔ مہابھارت۔ برہت کتھا۔ بھگوت گیتا۔ شاد کا مہاتم۔ وید شاستر اور دیگر کتب جو برِ صغیر پاک و ہند میں تصنیف و تالیف ہوئیں سے کشمیر کی ہیئت۔ محل وقوع اور زندگی کے ارتقاء کے بارہ میں مستند حالات کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

چونکہ ریاست کی تقدیر غیر منقسم ہندوستان سے اوائل سے ہی وابستہ تھی اس لیے نہ صرف شمالی ہند سے بلکہ ہندوستان کے متعدد علاقوں سے زمانۂ قدیم کے طالب حقیقت رشی منی قدرتی مناظر۔ پہاڑوں۔ غاروں اور جنگلوں میں یکسوئی اور گیان دھیان کی منزلوں کو دنیا کی شور و شر سے دور طے کرنے کے لیے گوشہ ہائے عافیت کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ہندوستان میں مہذب انسانی زندگی کا ارتقاء منو جی کے دھرم شاشتر کے مطابق برہما سے ہوا۔ اُس کے دو پسر دچھ یعنی

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق جلد اوّل د آئینہ کشمیر مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ایران کبیر و ایران صغیر صفحہ نمبر ۱۵

سورج اور اَترا یعنی سوم یا چندرما کے جنم سے سورج بنسی اور چندر بنسی یا چاند بنسی اقوام کی ابتدا ہوئی اور یوں ابتدائی طور پر ایک دوسرے کی پہچان کے احساس نے اس خطہ کے انسانوں کو دُنیا داری اور حکمرانی کے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ برہما کے ہاں اور بھی اولادیں تھیں۔ اُس کے پسر مریچ کے لڑکے کیشپ کی تیرہ رانیاں تھیں۔ اُن میں سے پہلی اور سب سے بڑی رانی اوِتی کے ہاں بارہ فرزند تولّد ہوئے جن میں سب سے بڑے لڑکے کا نام بسوان تھا۔ جو سورج کے نام سے بھی مشہور تھا۔ ایک روایت کے مطابق سورج بنسی راجپوت قوم کا آغاز اس کے ہی نام سے ہوا۔ کیشپ گیان دھیان کا رسیا تھا اور تپسیا میں ہی لگا رہتا تھا۔ ریاست کشمیر میں آبادی کا آغاز اُسی کی کوشش اور روحانیت کی صفات کی وجہ سے ہوا۔

تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ آغاز میں کشمیر کا خطہ[1] ستی سر نامی جھیل کی صورت میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں پانی اور برف کے سوائے کچھ نہ تھا۔ کیشپ[2] رشی عبادت اور یکسوئی کے لیے کوثر ناگ پہاڑ کی چوٹی پر براجمان ہوا۔ اور یہاں کافی عرصہ قیام کیا۔ حتیٰ[3] کہ اِردگرد سے کچھ لوگ اُس کا شہرہ سُن کر اُس کی خدمت میں آنا شروع ہو گئے۔ اور اپنی تکلیفات کے مداوا کے لیے اُس کی اعانت کی استدعا کرنے

---

[1] تاریخ راجگان جموں و کشمیر مؤلفہ ٹھاکر کاہن سنگھ صفحہ نمبر ۴۲

[2] مہاراجہ گلاب سنگھ بہادر مؤلفہ پنڈت سالگرام کول صفحہ نمبر ۳۹

[3] مکمل تاریخ کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۳

گئے۔ اُن کی سب سے بڑی مصیبت ستی سر کے بڑے تالاب میں جلد بھو نامی آدم آزار دیو کی موجودگی تھی جس کو برہما کی دُعا تھی کہ جب تک وہ اس تالاب کے پانی کے اندر رہے گا اُس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ اور نہ ہی وہ ہلاکت سے دوچار ہوگا۔ لوگوں کی آہ و زاری۔ نالہ و شیون سے متاثر ہو کر رِشی کیشپ نے اُن کو تسلی دی اور وعدہ کیا کہ وہ اس دیو کا ناش کر کے اُن کو اُس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائے گا۔ چنانچہ رِشی کیشپ نے بمقام ہیرہ پور قیام فرمایا اور کئی برس ریاضت اور دُعا میں گزارے۔ بالآخر مہادیو کو اُس پر رحم آگیا اور اُس نے برہما اور بشن دیو کو اُس دیو کو ختم کرنے پر مامور کیا۔ چونکہ برہما ہی کی دُعا سے اُسے جھیل کے اندر اور پانی کی موجودگی میں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا اس لیے برہما کی آگیا سے بشن دیو نے بارہ مولا کے قریب سے پہاڑ کو کاٹ کر جھیل ستی سر کا پانی ندی نالوں کی صورت میں بہا دیا۔ اور رفتہ رفتہ نیچے سے زمین نکل آئی لیکن اب بھی جھیل کے ایک طرف زمین کی گہرائی کی وجہ سے پانی بدستور کھڑا رہا جس میں اُس عفریت نے پناہ لے لی۔ اس پر بشن دیو نے کوہ شیر سے ایک بڑا مٹی کا تودہ اُٹھا کر اس گہری جگہ کو بند کر دیا جس سے جلد بھو دیو دب کر ختم ہوگیا۔ یوں یہ جھیل خشک خطہ ارضی میں تبدیل ہوگئی کیشپ رشی نے اس جگہ اردگرد کے علاقوں سے برہمنوں اور اپنے ہم خیال لوگوں کو لا بسایا۔ اور اُس کے ہی نام پر اس آبادی کا نام کیشپ میر یا کشمیر پڑگیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق کیشپ نامی ایک دیو حضرت سلیمان

---

ل مکمل تاریخ کشمیر جلد اوّل مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۷-۲۸

علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سیر و تفریح کے لیے جب ادھر آ نکلے تو انہیں ستی سر جھیل اور اس کے ارد گرد برف پوش پہاڑ بہت بھلے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اس جگہ لوگوں کو آباد کرنے کی ٹھانی۔ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے کیشپ دیو کو جھیل ستی سر کا پانی خشک کرنے کا حکم دیا۔ جس نے بارہ مولا کے مقام سے پہاڑ کو کاٹ کر متعدد جگہوں سے جھیل کا پانی مختلف ندی نالوں میں بہا دیا اور اس طرح لوگوں کو اس خشک خطۂ ارضی پر آباد کیا گیا۔

اس کے برعکس کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ایک دیو کشف نامی میر نامی پری پہ فریفتہ تھا۔ جو اس کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس نے اس بارہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں استدعا کی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو دوران سیاحت اس دلفریب خطہ کو دیکھ چکے تھے اس دیو سے فرمایا کہ اگر تم جھیل ستی سر کے پانی کو ختم کر دو تو تمہیں گوہر مقصود مل جائے گا۔ چنانچہ کشف دیو نے پہاڑ کاٹ کر جھیل کا تمام پانی بہا دیا اور اس سرزمین پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے انسانی آبادی معرضِ وجود میں آگئی یوں کشف دیو کو میر پری کا وصال حاصل ہو گیا۔ جن کے ناموں کے ارتباط سے اس بستی کا نام کشف میر یا کشمیر پڑ گیا۔ مملکتِ کشمیر کا دار الخلافہ[1] سری نگر بعد ۳۰۰ کے لگ بھگ راجہ پرورسین نے آباد کیا تھا۔

واقعہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس حقیقت پر سبھی کا اتفاق ہے کہ

---

[1] حکایاتِ کشمیر مرتبہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۴۲

کشمیر آغاز میں ایک وسیع و عریض جھیل ستی سر کے نیچے تھا جس کے خشک ہونے کے بعد کیشپ رشی نے برہمنوں اور پاکش قوم کو ملحقہ علاقوں سے لاکر یہاں آباد کیا۔ برہمن لوگ دھرم اور گیان کے کاموں میں لگے رہتے تھے جبکہ پاکش پستہ قد کے تنومند۔ جنگجو۔ عالی ہمت اور طاقتور لوگ تھے اور اپنی عسکری قوت کے مظاہرے میں منہمک رہتے۔ برہمن اُن سے ہمیشہ خوف کھاتے اور اُنہیں اکثر نذرانے اور تحائف پیش کیا کرتے تاکہ وہ اُن کی حفاظت کرتے رہیں۔ چنانچہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود اب بھی کشمیری پنڈت گھرانوں میں وہی کردار بطور رسم قدیم یوں زندہ رکھا جاتا ہے کہ ہر سال پندرھویں ماہ پوہ کو کھچڑی پکا کر ایک کوری ہنڈیا میں ڈال کر سرِ شام گھر سے باہر کہیں رکھوا دی جاتی ہے تاکہ اُن کی یہ بھینٹ پاکش قوم قبول کرلے اور دُنیاوی آفتوں اور بلاؤں سے برہمن اور اُن کے گھرانے محفوظ و مامون رہیں۔[1]

یوں اس خطہ میں انسانی آبادی کی ابتدا ہوئی۔ ریاست میں آغازِ انسانیت سے ۱۳۲۲ء تک ہندو مت کے پیروکار کم و بیش اکیس[2] خاندانوں کے ۲۳۷۵ بادشاہ حکمران رہے۔ سال ۱۳۲۳ء میں پہلی بار ذوالقدر تاتاری نے ستر ہزار فوجِ جرار کے ساتھ اس علاقہ کی طرف پیش قدمی کر کے اسے قتل و غارتگری اور لوٹ مار کی آماجگاہ بنایا۔ اور

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد سوئم مؤلفہ محمد الدین فوق اور کشمیری ذاتوں کے عجائبات از محمد عبداللہ قریشی صفحہ نمبر ۳۰۷

[2] تاریخ کشمیر جلد اول حالاتِ راجگانِ ہنود مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۷۷

ہنگامہ آرائی کے بعد یہاں سے چلتا بنا۔ بعدؔ سال ۱۳۲۴ء میں یہاں کے
شکست خوردہ راجہ سہدیو نے تاتاریوں کے مبینہ دوبارہ حملہ کے خوف
سے اپنے معتمد وزیر رام چند کی معیت میں اپنے دیگر بہی خواہوں کے
ہمراہ دار السلطنت چھوڑ کر پہلے پہاڑوں میں رُوپوشی اختیار کرلی۔ اور
پھر کشتواڑ چلا گیا۔ اسی زمانہ میں ملحقہ ریاست تبت سے دو افراد کس
مپرسی کی حالت میں سرزمینِ کشمیر میں وارد ہو چکے تھے۔ ان میں سے
ایک ریچن شاہ تھے جو اپنے مختصر سے ہمراہیوں کے دستہ کے
ساتھ آئے تھے جب اُنہوں نے سہدیو اور اُس کے معتبرین کو غائب پایا تو
پہلے دارالخلافہ پر متصرف ہوتے اور بعدؔ زمامِ حکومت سنبھال کر پورے
ملک پر حکمرانی کرنے لگے۔ اس طرح ریاست پر پہلی بار ملک کے باہر سے
آنے والا ایک غیر ملکی بدھ حکمران بنا۔ ریچن شاہ مذہب کے بارہ میں متجسس
رہا کرتا تھا۔ سچائی کی جستجو نے ایک شام اُس کو ایک نیا عزم دیا۔ اُس
نے اپنے دِل سے عہد کیا کہ اگلی صبح جو کوئی بھی سب سے پہلے اُسے
نظر آیا وہ اُسی کا مذہب اختیار کرلے گا۔ خدا کی قدرت کہ صبحدم اُس
کی نظر اپنے محل کے جھروکہ سے دریا کی جانب پڑی جہاں کنارۂ دریا
پر اُس نے ایک آدمی کو عجیب طریقہ سے عبادت کرتے ہوتے پایا۔ اپنے
چوبدار کو بھیج کر ریچن شاہ نے اُس آدمی کو بلایا اور اُس سے اُس کے
عقیدہ اور مذہب کے بارہ میں متعدد سوالات کیے۔ یہ آدمی ایک
کریم النفس بزرگ صاحبِ طریقت۔ زاہد و متقی جناب شرف الدین عرف

---

لہ تاریخ کشمیر جلد اوّل مؤلفہ محمد الدین فوقؔ صفحہ نمبر ۲۷۴
ٓلہ ایرانِ کبیر و ایرانِ صغیر مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ ۱۹

بلبل شاہ تھے جنہوں نے بادشاہ کو اسلام کے زرین اصولوں کی تبلیغ کی اور اُن کے دستِ حق پرست پر رینچن شاہ مشرف بہ اسلام ہوگئے بادشاہ کا اسلامی نام صدرالدین شاہ رکھا گیا۔ بادشاہ کے قبولِ اسلام کے بعد اُس کے اُمراء و وزراء نے بھی اس سعادتِ دارین سے اپنے قلوب منوّر کیے۔ اور رعایا کی ایک بہت بڑی تعداد حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی۔ اس طرح ریاستِ کشمیر میں سال ۱۳۲۴ء میں اسلام شاہی مذہب کے طور پر اُبھرا۔

بُلبل شاہ نے اپنی زاہدانہ زندگی کے بقیہ سال صدرالدین شاہ کی معیّت میں گزارے اور سال ۷۲۷ھ (مطابق ۱۳۲۶ء) یعنی صرف دو سال بعد تک بقیدِ حیات رہ کر اس عالمِ فانی سے کُوچ کیا۔ اس صُوفی منش مبلغِ اسلام کی سعی سے ریاستِ کشمیر میں اسلامی مملکت کا ظہور ہوا اور صدرالدین شاہ کی حکومت کے بعد ۱۸۱۹ء تک کل ۴۹۴ سال مسلمان حکمران ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ اُنہوں نے اپنی رعایا سے پُورے اخلاص و رواداری سے بلا لحاظِ ملک و ملت ترجیحی سلوک کیا۔ اُن کے ہر دُکھ درد میں شریک رہنے کی بناء پر لوگوں کے دلوں پر حکومت کی اور اُس وقت تک اس سلطنت کو زوال سے دوچار نہ ہونا پڑا جب تک اس کے کرتا دھرتا عیش و عشرت، بے راہ روی، ظلم و تشدّد اور تعصب کا شکار نہ ہوگئے۔

رینچن شاہ کے ساتھ جو دوسرا شخص ریاستِ کشمیر میں وارد ہوا وہ علاقہ سوادکنیر کا ایک سیّاح شاہ میر نامی تھا۔ وہ گو جملہ علوم

---

۱؎ تاریخِ کشمیر جلد اوّل طبقہ دوئم مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۷۴

سے واقف تھا اور علم اور فضل کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھا لیکن
غریب الوطنی اور ناواقفیت کی بنا پر چند سے سرگرداں پھرا۔ آخر اُس
کے بخت نے یاوری کی اور صدر الدین شاہ کی مردم شناس طبیعت نے
اس جوہرِ قابل کی عزت افزائی کرتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ ملا لیا
اور حکومت ملنے پر اپنے نابالغ بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ جو نہ صرف
بادشاہ کے شہزادوں کی تربیت کرنے لگا بلکہ بادشاہ کو بھی امورِ سلطنت
میں صائب رائے دیتے دیتے اُس کا غایت درجہ معتمد بن گیا۔ صدر الدین
شاہ سال ۷۴۷ھ مطابق ۱۳۴۶ء میں وفات پا گیا۔ اُس کے ورثا میں
سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا جو سلطنت کی باگ ڈور سنبھال سکتا۔ چنانچہ اپنی
شہرت۔ تدبر اور حکمتِ عملی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شاہ میر نے
تاج و تخت پر قبضہ کر لیا اور شہمیری خاندان کی حکومت بنا ڈالی۔ اس
خاندان نے کشمیر پر سال ۹۷۸ھ (مطابق ۱۵۶۵ء) تک حکومت کی اور
بہت ہی زیرک۔ مُہم جُو۔ صاحبِ فہم و فراست۔ روادار اور بہادر بادشاہ پیدا
کیے۔ شہمیری حکمرانوں میں سب سے نامور سلطان شہاب الدین گزرا
ہے جس کے دورِ حکومت کو کشمیر کا زریں زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اُس
کے عہد میں شیر اور بکری ایک ساتھ اور ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔
رعایا خوشحال تھی۔ اشیاءِ خوردنی اور صرف بہتات سے اور وافر مقدار
میں دستیاب تھیں۔ تمام ریاست میں امن و امان تھا ریاست کشمیر کی
انتظامیہ مستحکم تھی۔ ملک کی خوشحالی کا دُور دُور چرچا تھا حکیم الاُمت حضرت
علامہ اقبالؒ نے اس سلطان کے بارہ میں کس قدر واضح خراجِ تحسین یوں
ادا کیا ہے کہ ؎ خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

خاندانِ شہمیری کا دوسرا قابلِ ذکر اور مشہور سلطان سکندر خان المعروف بُت شکن گزرا ہے۔ جس کا دورِ حکومت سال ۷۹۶ھ (مطابق ۱۳۹۳ء) لغایت ۸۱۹ھ (مطابق ۱۴۱۶ء) تھا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ۔ انصاف پسند صُلح جُو اور فراخ حوصلہ حکمران تھا۔ اُس کا عہد بھی کشمیر میں فتوحات اور خوشحالی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ راعی اور رعایا ہر دو انتہائی مسرت اور شادمانی سے گزر بسر کرتے تھے اور بے چینی نام کی کوئی شئے اس خطہ کے باسیوں کے پاس نہ پھٹکنے پائی تھی۔

اسی خاندان کا آخری بطلِ جلیل اور نامور بادشاہ جو عرفِ عام میں بڈشاہ (بڑا شاہ) یا بھٹ شاہ (ہندوؤں کا راجہ) پکارا جاتا تھا سُلطان زین العابدین تھا جو سکندر شاہ بُت شکن کا لڑکا تھا۔ وہ اپنے حُسنِ کردار نیک سیرت۔ تعمیراتی ذوق۔ انتظامِ مملکت۔ رفاعِ عامہ کے امور۔ فنونِ لطیفہ کی ترویج اور متعدد خوبیوں کی بنا پر عوام و خواص میں غایت درجہ مقبول تھا۔ اس کے دور میں انصاف کا دور دورہ تھا۔ اُس کا قابلِ ذکر کارنامہ زینہ لنک نامی جزیرہ کا وُلر جھیل میں بنوایا جانا تھا جس کی تعمیر کے لیے اُس نے ضلع گجرات (پنجاب) سے معمار اور کاریگر منگوائے اور اُنھیں سرکاری ملازم رکھ کر کشمیری عوام کو اُن سے تربیت دلائی۔ اس سُلطان کا زرین زمانہ سال ۸۲۳ھ (مطابق ۱۴۲۰ء) تا ۸۷۵ھ مطابق ۱۴۷۰ء) تھا۔ اُس کی وفات پر شہمیری خاندان زوال پذیر ہو گیا۔ ملک

---

۱؎ حکایاتِ کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۸۹

۲؎ مکمل تاریخِ کشمیر حصّہ دوئم مرتبہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۴

میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا۔ مملکت کا شیرازہ بگڑتے دیکھ کر
شہنشاہِ ہندوستان محمد ظہیر الدین بابر کے خالہ زاد بھائی میرزا حیدر
دوغلات نے کشمیر پر ہلّہ بول دیا۔ اور ریاست پر متصرف ہوگیا۔ چند سال
وہ اس خطۂ جنت نظیر پر حکمران رہا لیکن اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں
کا شکار ہو کر انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اور ایک دفعہ پھر ریاست
میں ایک غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اس دفعہ ایک طالع آزما۔
جنگجو سردار غازی چک کی قسمت نے یاوری کی اور اس نے اپنے ہمراہیوں
کی مدد سے بزورِ شمشیر اس خطۂ ارضی پر چک خاندان کی حکمرانی قائم کر دی۔
چک حکمران متعصب شیعہ عقیدہ کے حامل تھے۔ وہ جبر و تشدد سے
لوگوں کو اپنا ہم مشرب بناتے اور دوسرے فرقوں سے انتہائی سفاکانہ
سلوک روا رکھتے۔ اُن کے دورِ حکومت میں کسی غیر شیعہ کی عزت و
ناموس محفوظ نہ تھی۔ وہ ملکی معاملات میں بھی انتہائی سخت گیر تھے۔
اُن کی جابرانہ اور ظالمانہ طرزِ حکومت سے تنگ آکر رعایا کی اکثریت
جو سُنّی العقیدہ تھی ریاست سے ہجرت پر مجبور ہوگئی اس خاندان کا
ایک انتہائی منہ زور اور بدکردار اور ظالم حکمران یعقوب چک تھا جس
نے اپنی حکومت کے دوران قاضی موسیٰ نامی سُنّی بزرگ کو شیعہ
عقاید قبول کرنے اور اپنے مفید مطلب فتویٰ دینے پر مجبور کیا لیکن یہ
صوفی منش انسان حکومت کے ناجائز دباؤ میں نہ آیا۔ اس پر یعقوب
چک نے اس پر اپنے خلاف شمس چک اور مغل حکمران ہندوستان کے

---

؎ مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۵۷

ساتھ سازباز کا جھوٹا الزام لگا کر شہید کروا دیا اور اسی پر بس نہ کی بلکہ اُن کی برہنہ نعش کو ہاتھی کی دُم کے ساتھ باندھ کر تمام شہر میں تشہیر کرائی گئی۔ قاضی موسے شہید سنّی عقیدہ کے حامل ملک کے قاضی القضات تصوّر ہوتے تھے۔ اُن کا قصور صرف اس قدر تھا کہ اُنھوں نے یعقوب چک کے ایما کے مطابق یہ فتوےٰ دینے سے انکار کیا کہ موذن لوگ اذان میں کلمہ "علی ولی اللہ" شامل کیا کریں کیونکہ وہ ایسا کرنا خلافِ شرعِ محمدی سمجھتے تھے۔ چک حکمرانوں کے بڑھتے ہوئے ظلم و استبداد سے تنگ آکر کشمیر کے دو فرزند بابا داؤد خاکی اور شیخ یعقوب صرفی آخری سُلطان یوسف شاہ چک کے زمانہ میں سال ۱۵۸۵ء میں دربارِ دہلی کے مغل فرمانروا شہنشاہ جلال الدین اکبر بادشاہ کے پاس پہنچ کر فریادی ہوئے اور سنّی مُسلم رعایا کشمیر کی داستانِ خونچکاں اور اُن کی تحقیر کے متعدد واقعات بادشاہ کے گوش گزار کیے۔ جس سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اپنے سردار راجہ مان سنگھ کو ریاست پر فوج کشی کا حکم دیا۔ لیکن یہ مہم کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔ اس کے بعد مغل شہنشاہ نے دوسری مہم میر قاسم بحری اور میرزا یوسف کی سرکردگی میں بھجوائی جس نے فتح حاصل کرکے خاندانِ چک کی ستائیس سالہ حکومت کے جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا۔ ان مغل سرداروں نے دہلی واپس پہنچ کر کشمیر کے قدرتی مناظر۔ حُسن اور صحت بخش آب و ہوا کا کچھ ایسے دلفریب انداز میں تذکرہ کیا کہ شہنشاہِ اکبرِ اعظم کو اس خطۂ جنت نظیر کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق

---

۱ حکایاتِ کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۹۷
۲ مکمل تاریخِ کشمیر جلد دوم مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۷۵

ہوا۔ چنانچہ وہ پہلی بار سال ۱۵۸۷ء میں پھر سال ۱۵۹۰ء میں اور تیسری بار سال ۱۵۹۵ء میں کشمیر کی سیاحت اور لطف اندوزی کے لیے گیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے ولیعہد شہزادہ سلیم کو بھی لیتا گیا۔ اپنے قیامِ کشمیر کے دوران ہر بار شہنشاہ نے وہاں جدید تعمیرات باغات اور بارہ دریاں بنوانے کا اعادہ کیا۔ اور رفاعِ عامہ کے کام کیے۔ اکبرِ اعظم کی وفات کے بعد شہزادہ سلیم بطورِ شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر تختِ دہلی پر رونق افروز ہوا۔ اپنے عہدِ سلطنت میں وہ چار مرتبہ عازمِ کشمیر ہوا۔ پہلی مرتبہ وہ مارچ ۱۶۲۰ء میں کشمیر گیا۔ پھر سال ۱۶۲۳ء میں دوسری مرتبہ کشمیر کی سیر کی۔ تیسری دفعہ وہ سال ۱۶۲۵ء میں یہاں فروکش ہوا۔ اور چوتھی اور آخری بار شہنشاہ جہانگیر نے سال ۱۶۲۷ء میں کشمیر کی یاترا کی اس بار سفر سے واپسی کے دوران اس کی طبیعت یکلخت بگڑ گئی اور بمقامِ[1] راجوری اُس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُس کا مقولہ تھا کہ کشمیر بادشاہوں کے لیے گلشنِ عشرت غُربا اور درویشوں کے لیے خلوت کدۂ دلکشا ہے۔ وہ اکثر کشمیر کے تصوّر سے شاد کام رہا کرتا اور دہلی کے قیام کے دوران بھی اُس کا دِل کشمیر کے سبزہ زاروں۔ پہاڑوں اور دریائی آبشاروں کے علاوہ اس کے حُسن و ظُرفہ آب و ہوا کی طرف مائل رہتا۔ اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ[2]

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم مؤلفہ محمدالدین فوقؔ صفحہ نمبر ۱۹۲
[2] مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم از محمدالدین صفحہ نمبر ۱۹۷

راجوری میں شہنشاہ جہانگیر کی نعش کو ایک صندوق میں بند کر کے ایک تابوت کی صورت میں لاہور لایا گیا اور اُس کی ملکہ نورجہاں نے اُسے شاہدرہ میں مقبرۂ جہانگیر (جسے موجودہ صورت میں اُس کے لڑکے شاہ جہان نے تعمیر کیا) میں آسودۂ خاک کیا۔ مغلیہ دور میں کشمیر میں خاصی تعمیراتی اور ملکی انتظام و انصرام میں ترقی ہوئی۔ سلطنتِ دہلی کی طرف سے یہاں بذریعہ تقرری صوبیداران حکومت کی جاتی تھی۔ اور اِسے مملکتِ ہند کا ایک صوبہ شمار کیا جاتا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کی وفات کے بعد شہزادہ خرّم بطور ابوالمظفر شہاب الدین شاہجہان شہنشاہ ہند ہوا۔ اُس نے اپنے دورِ حکومت سال ۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء میں چار مرتبہ کشمیر کی سیاحت کی۔ پہلی مرتبہ وہ سال ۱۶۳۴ء میں۔ دوسری مرتبہ سال ۱۶۳۸ء میں۔ تیسری دفعہ سال ۱۶۴۲ء میں اور چوتھی اور آخری بار وہ ۱۶۵۰ء میں رونق افروزِ کشمیر ہوا۔ وہ تعمیرات کا دلدادہ تھا۔ اُس نے یہاں متعدد باغ لگوائے۔ محلات۔ حمام۔ بارہ دریاں وغیرہ تعمیر کروائیں اور اپنے اجداد کی تعمیرات کی مرمّت اور اُن میں توسیع کروائی۔ اپنے جمالیاتی ذوق کی وجہ سے بھی یہ مغل تاجدار بہت نیک نام ہے۔ اسی نے بیس کروڑ کی لاگت سے تختِ طاؤس بنوایا تھا اور اُسی نے دُنیا کا آٹھواں عجوبہ تاج محل آگرہ میں اپنی چاہیتی ملکہ ممتاز محل کی وفات پر بطور نذرانۂ محبت و عقیدت تعمیر کرایا تھا۔

شہنشاہ شاہجہان کی وفات پر اُس کا نہایت درجہ کریم النفس۔ عادل۔

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم از محمدالدین فوق صفحہ نمبر ۲۰۲

منصف مزاج متقی اور دیندار[1] بیٹا محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ سریر آرائے سلطنتِ دہلی ہوا۔ وہ صرف ایک بار ہی سال ۱۶۶۵ء میں واردِ کشمیر ہوا۔ اُس کے عہد کا معتبر ترین اور قابلِ ذکر واقع جو کشمیر کے متعلق ہے وہ سرورِ دو جہان۔ آقائے کائنات۔ فخرِ موجودات حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں گیسو کے موئے مبارک کا اس سرزمین میں لایا جانا اور عوام و خواص کی زیارت کے لیے رکھا جانا ہے۔ اجمال اس واقعہ کی یہ ہے کہ گیارہویں[2] صدی ہجری کے نصف آخر میں دربارِ رسالت مدینہ منورہ کے مجاور سید عبداللہ سے سُلطانِ وقت کسی بات پر سخت ناراض ہو گئے اور اُنہیں ضبطی جائیداد کے بعد ملک بدر کر دیا گیا۔ اُن کی تحویل میں صرف تین تبرکات رہنے دیئے گئے جن میں سے ایک تو حضور سرورِ کائنات صلعم کا دائیں گیسوِ مبارک کا ایک بال تھا۔ دوسرا حضورِ پُر نور کا عمامۂ پاک اور تیسرا تبرک سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ کی سواری کی زین تھی۔

سید عبداللہ اپنے حبشی نژاد غلام سید انس کی معیت میں ان تبرکات کو لے کر مغل شہنشاہ ہند شاہجہان کی خدمت میں دہلی وارد ہوئے۔ بادشاہ اُن سے بکمالِ عقیدت و مروّت پیش آئے اور بیجاپور کے نواح میں مختصر سی جاگیر گزارہ کے لیے سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ سید صاحب اب سرزمینِ ہند میں رہائش پذیر ہو گئے اور یہاں پر شادی کر کے مستقلاً

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم از محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۱۸

[2] آئینۂ کشمیر مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔

مغلیہ خاندان سے ارادت مندی کے مراسم سے سرفراز رہے۔ اُن کے صاحبزادوں نے شہزادہ داراشکوہ سے مصاحبت کا رشتہ استوار کر لیا اور یوں وہ اس دیار میں پھولتے پھلتے رہے۔ سید صاحب کی وفات کے بعد یہ تبرکات اُن کے صاحبزادوں کی تحویل میں آ گئے۔ شاہجہاں کی وفات پر اُس کے شاہزادوں کے مابین تختِ دہلی کے حصول کی جنگ ہوئی جس میں داراشکوہ کی شکست اور محی الدین اورنگ زیب کی کامرانی نے حالات کا پانسہ بدل دیا۔ داراشکوہ کے ساتھ سید زادوں کی مصاحبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ چنانچہ شہزادہ کے ساتھ ساتھ اُس کے اُن مصاحبوں کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ اُن کی جائیداد بیجاپور بھی ضبط کر لی گئی اور اس طرح سید زادوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ اُنھوں نے جائیداد کی بحالی کے لیے دہلی کا رُخ کیا لیکن مغل دربار میں اُن کی ایک نہ چلی۔ اسی دوران اُن کی ملاقات ایک کشمیری تاجر مقیم دہلی خواجہ نورالدین ایشہ بری سے ہو گئی جس سے اُنھوں نے اپنی حالتِ زار بیان کی اور امداد کے طالب ہوئے۔ اب وہ اس تاجر سے وقتاً فوقتاً قرض لیتے رہے اور اپنی گزران نہایت عُسرت سے کرتے رہے۔ شدہ شدہ یہ رقم اس قدر زیادہ ہو گئی کہ اس کی ادائیگی سید زادوں کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔ اپنے محسن کے احسان کے بدلہ کے طور پر سید زادوں نے خواجہ نورالدین ایشہ بری کی خدمت میں موئے مبارک کا تحفۂ عظیم منتقل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ خواجہ صاحب اس شرف سے پھولے نہ سماتے اور کمال اشتیاق اور احسان مندی کے جذبہ سے اس سعادتِ دارین کو معہ حبشی غلام سید انش نامی

---

ے راہنمائے کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۶

جو اس کی حفاظت پر مامور تھا اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور اس کے فوری بعد دہلی سے براستہ لاہور ریاست کشمیر کا رُخ کیا۔ تاکہ اس گراں قدر عطیۂ غیبی کو اپنے اہلِ خاندان اور اہلِ کشمیر کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ خواجہ صاحب کی دہلی سے روانگی کے کچھ دن بعد ہی پرچہ نویسوں نے اس اہم واقعہ کے بارہ میں دربارِ دہلی کو مطلع کر دیا۔ جس پر شہنشاہ نے حکم صادر فرمایا کہ خواجہ نورالدین ایشہ بری کو معہ موئے مبارک جلد از جلد جہاں کہیں بھی وہ ہو دربارِ شاہی میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ شاہی فرستادے خواجہ صاحب کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ خواجہ صاحب سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے لاہور پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ سرکاری گماشتے بھی جلد ہی لاہور پہنچ گئے اور خواجہ نورالدین ایشہ بری کو معہ حبشی غلام اور موئے مبارک ساتھ لے کر شہنشاہِ ہند کی خدمت میں دہلی پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب اس صدمہ کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کر گئے شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے انتہائی شوق اور عقیدت و احترام سے موئے مبارک کی زیارت کی اور حکم دیا کہ اس نایاب عطیۂ الٰہی کو بصد احترام درگاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ بمقام اجمیر شریف لے جا کر خلقِ خدا کی زیارت کے لیے محفوظ کیا جائے۔ شاہِ وقت کے احکام کی فی الفور تعمیل کی گئی۔ لیکن موئے مبارک کو اجمیر شریف پہنچے ابھی نو ہی دن گزرے تھے کہ شہنشاہ نے خواب میں حضور صلعم کی زیارت کی اور آپ نے حکم دیا کہ موئے مبارک فی الفور کشمیر بھیج دیا جائے۔ خواب سے بیدار ہوتے ہی شہنشاہ نے اس فرمانِ نبوی کی تعمیل میں حبشی غلام کو خلعت سے نوازا اور شاہی خدام کی معیت میں بکمال شان و شوکت و بصد احترام موئے ـــــ

---

لہ رہنمائے کشمیر مؤلفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۶۱

مبارک ایک مرصع صندوقچہ میں ریاست کشمیر کی جانب روانہ کر دیا اور ایک روایت کے مطابق خواجہ نورالدین ایشہ بری کی نعش بھی ساتھ ہی کشمیر روانہ کر دی گئی۔ راستہ بھر خلقِ خدا درود و سلام کا ورد کرتی اور موئے مبارک کی زیارت کی سعادت سے مشرف ہوتی رہی۔ بالآخر ایک جمِ غفیر کی موجودگی میں ہیراپور سے ریاست کشمیر کے روحانی پیشوا شیخ محمد چشتی رادھو نے صندوقچہ کو اپنے سر پر اُٹھا لیا اور ایک عظیم الشان جلوس کے جلو میں اُسے خانقاہ حضرت شاہ نقشبند تک پہنچایا جہاں اُسے زیارتِ عوام و خواص کے لیے وقتی طور پر رہنے دیا گیا۔ بعد میں ریاست کے عمائدین کی مشاورت سے مغل ناظمِ کشمیر فاضل خاں نے صادق خان کے وسیع و عریض باغ میں جو جھیل ڈل سرینگر کے مغربی کنارہ پر واقع تھا ایک قطعہ اراضی بطورِ ہبہ حاصل کیا اور وہاں درگاہ حضرت بل کی تعمیر کروائی جس کی تکمیل پر موئے مبارک یہاں منتقل کر دیا گیا۔ شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے اس درگاہ کی خدمت اور انتظام کے لیے تین دیہات بطورِ جاگیر وقف کیے اور یہ جاگیر سکھ عملداری کے دوران بھی برقرار رہی۔ شیخ محمد چشتی رادھو اپنی حیات بھر اس درگاہ کے متولی رہے۔ اُن کی وفات کے بعد خواجہ نورالدین ایشہ بری کے داماد شیخ محمد بلاق بانڈے متولی بنے اور یہ منصب نسلاً بعد نسلاً اُن کی اولاد میں چلا آ رہا ہے۔ درگاہ حضرت بل سرینگر میں ہر سال ربیع الاول کی بارہویں (۱۲)، تیرہویں (۱۳)، خلفائے راشدین کے ایامِ عرس، ماہِ رجب کی چھبیسویں (۲۶) اور ستائیسویں (۲۷) و جمعہ ما بعد کے علاوہ ہر جمعہ کو موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے بعد شہزادہ محمد معظم

اپنے بھائیوں محمد اعظم اور کام بخش سے نبرد آزمائی کے بعد تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اپنی حکومت کے دوران وہ کشمیر کی سیاحت کے لیے اوائل سال ۱۷۱۲ء میں دہلی سے عازم لاہور ہوا جہاں پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا اور اس کے تھوڑے سے دنوں بعد ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو وفات پا گیا۔ بعدہٗ جہاندار شاہ اور فرخ سیر مملکتِ ہند کے تاجدار بنے لیکن اُن کی حکومت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اس طرح مغل دورِ حکومت زوال پذیر ہوا۔ جس کا مکمل خاتمہ نادر شاہ کے حملہ ہند سے ہوا۔ نادر شاہ سال ۱۷۴۷ء میں مارا گیا اور اُس کی جگہ احمد شاہ ابدالی نے لی۔ اُس[1] زمانہ میں کشمیر کی نظامت صفدر جنگ کے پاس تھی۔ اُس کے بعد نواب اللہ قلی خان ناظم بنے اور اُن کے نائب میر مقیم کنٹھ بنے جنہوں نے ملکی اخراجات میں کفایت شعار کرتے ہوئے نہ صرف افواجِ کشمیر میں کمی کر دی بلکہ اُن کی تنخواہوں میں بھی معتدبہ کمی کر دی۔ جس سے افواج بددل ہو گئیں اور انہوں نے سردار ابوالقاسم کی سربراہی میں بغاوت کر دی اس کے نتیجہ میں اُس نے ریاست کے انتظام و انصرام پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ اور یوں مرکزِ سلطنت دہلی سے کشمیر کے روابط مکمل طور پر منقطع ہو گئے۔ اُن ایام میں احمد شاہ ابدالی لاہور میں مقیم تھا۔ وہ کشمیر کے حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے رعایا کی اکثریت کے رجحان سے آگاہی پاتے ہی عوامی بے چینی سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور اپنے افغان سردار عبداللہ خان ایشک کی سرکردگی

---

[1] آئینہ کشمیر مرتبہ محمد عبداللہ قریشی

میں سال ۱۷۵۲ء میں ایک مہم ریاست کے علاقہ بھمبر پر لشکر کشی کے لیے روانہ کی۔ جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اس طرح ریاست کشمیر افغانوں کے قبضہ میں آگئی۔ کشمیر کو فتح کرنے کے بعد سردار عبداللہ خان ایشک اپنے نائب سُکھ جیون مل کو کشمیر کا ناظم مقرر کر کے خود کابل واپس چلا گیا۔ سُکھ جیون مل نے ریاست پر سال ۱۷۵۴ء سے سال ۱۷۶۲ء تک حکمرانی کی۔ ریاستِ کشمیر کا آخری افغان حکمران سردار عبدالجبار خان سلطنتِ کابل کے وزیر کا حقیقی بھائی تھا۔ وہ انتہائی عیاش، جابر، ظالم، سخت گیر اور درندہ صفت انسان تھا۔ رعایا کا ہر طبقہ اُس سے ہراساں تھا اور اُس کے پنجۂ استبداد سے گلوخلاصی کا دل سے خواہاں تھا۔ بالآخر کشمیری پنڈت بیربر کی سربراہی میں ایک وفدِ کشمیر سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس لاہور دربار میں حاضر ہوا اور افغان حکمران کی چیرہ دستیوں سے خلاصی کیلئے امداد کی استدعا کی اور ریاست کے عوام کی طرف سے بھی ہر قسم کی امداد کی یقین دہانی کرائی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہوسِ ملک گیری اور مال و زر کے حصول کی اُمید میں فی الفور امداد کی حامی بھر لی اور اپنے ایک سردار دیوان چند ظفر جنگ کی سرکردگی میں تیس ۳۰ ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج بہ امدادِ راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ (جس نے سال ۱۸۱۸ء سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج میں ملازمت اختیار کر رکھی تھی)۔ راجہ ہری سنگھ نلوہ۔ سردار جوالا سنگھ۔ سردار حکم سنگھ چھٹی اور دیگر سرداران اٹاری کشمیر کی تسخیر کے لیے بھجوا دی۔ اس فوج نے ۱۱ رمضان ۱۲۳۴ھ کو ریاستِ کشمیر کو مکمل

---

ف مہاراجہ گلاب سنگھ بہادر مولفہ پنڈت سالگرام کول صفحہ نمبر ۲

طور پر فتح کر کے اسے سکھ دربار کی ذیلی ریاست بنا دیا۔ سکھ سرکار لاہور
کی جانب سے مختلف ادوار میں یکے بعد دیگرے نو (۹) صوبیدار کشمیر پر
حکمران رہے۔ جن میں سے مصر دیوان چند۔ دیوان دیوی داس۔ دیوان
موتی رام۔ شہزادہ[1] شیر سنگھ (سال ۱۸۳۲ء تا سال ۱۸۳۴ء)۔ دیوان
ہری سنگھ نلوہ۔ دیوان کرپا رام شرادی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا
خوبرو اردلی بھیمہ سنگھ قابلِ ذکر ہیں[2]۔ موخر الذکر کو سال ۱۸۳۱ء میں صوبیدار
کشمیر مقرر کیا گیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ خوبصورت اور قد آور افراد
کی قدر کرتا تھا۔ غالباً یہی سبب اُس کے اردلی کے صوبیدار کشمیر بننے کا بنا۔
دربارِ لاہور کی طرف سے کشمیر کا سکھ اقتدار سال ۱۸۱۹ء تا سال ۱۸۴۶ء
پر محیط ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سال ۱۸۳۹ء میں مر گیا۔ اس کے مرنے
کے بعد اُس کی رانی راجکور کے بطن سے اُس کا فرزند شہزادہ کھڑک سنگھ
سال ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۰ء بطور مہاراجہ تخت نشین ہوا۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ
۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو مر گیا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کا عیاش۔ لاپرواہ
اور نافرمان ولیعہد کنور نونہال سنگھ وارثِ تخت تھا۔ لیکن وہ اپنے
صدقِ عشق و ایثار پیشہ سورگ باشی پتا کا نااہل فرزند تھا۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ
کی وفات کے بعد اُس کے ولیعہد نونہال سنگھ کے ساتھ عجیب و غریب واقعات
پیش آئے۔ جب اُسے اپنے والد کی موت کی اطلاع ملی تو وہ روتا ہوا

---

۱ مکمل تاریخ کشمیر حصہ سوئم مولفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۳۱
۲ مکمل تاریخ کشمیر حصہ سوئم مولفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۹
۳ مکمل تاریخ کشمیر حصہ سوئم مولفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۵۱ تا ۵۲

حویلی کی دوسری چھت پر چڑھ گیا جہاں کسی نامعلوم ہستی نے اُسے دھکا رسید
کیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر سہارا لیتے ہوئے نیچے اُترا لیکن باوجود تلاشِ بسیار
دھکا مارنے والے کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ بعد میں وہ باپ کی ارتھی کے ہمراہ
جمِ غفیر کی موجودگی میں قلعہ لاہور سے روانہ ہوا۔ ٹکسالی دروازہ کے عین نیچے
کسی نامعلوم فرد نے اُسے پوری طاقت سے پیٹھ پر لکڑی کی ضربِ شدید
لگائی جس سے شہزادہ غایت درجہ ہراساں نظر آنے لگا۔ اُس فرد کو
پکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ مجمع میں سے کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ شمشان
بھومی میں مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوہ کو ستی ہونے سے پہلے راجکمار
نونہال سنگھ کو اشیرباد دینے کو کہا گیا اور مہاراجہ کا تاج اُتار کر اُسے
پہنانے کی استدعا کی گئی۔ لیکن رانی نے صرف اتنا کہا کہ "کرنی بھرنی ہے"
اور تاج بجائے ولیعہد کے سر پر رکھنے کے زمین پر پھینک دیا۔ کنور نونہال
سنگھ کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی اس لیے باپ کی ارتھی ابھی پوری طرح
جلنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ شمشان بھومی سے واپس لوٹ آیا اور مہاراجہ
رنجیت سنگھ کی سمادھی کے پاس پہنچتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُسے
بہ ہزار دقت ہوش میں لایا گیا اور مذہبی مروجہ رسم کے مطابق دریائے
راوی پر اشنان کے لیے لے جایا گیا۔ ابھی ڈیرہ گوردوارجن دیو کے قریب
ہی پہنچے تھے کہ ایک بہت بڑا اور تن آور درخت ہولناک دھماکہ کے
ساتھ جڑ سے اُکھڑ کر گر پڑا۔ اس ناگہانی بھیانک آواز سے کنور نونہال سنگھ
کے اوسان خطا ہو گئے۔ غایت جبر و صبر سے اُس نے دریا پر اشنان کیا۔
اور راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے پسر اودھم سنگھ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
ہوتے وہ واپس محل کی طرف لوٹا۔ جب وہ دونوں روشنائی دروازہ کی

چھت کے عین نیچے پہنچے تو چھت کا کچھ حصہ اُن دونوں اور اُنکے دیگر ہمراہیوں پر آ گرا۔ اودھم سنگھ تو موقعہ پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ کنور نونہال سنگھ کو زخمی حالت میں قلعہ میں لایا گیا۔ جہاں اُس کی موت واقعہ ہو گئی۔ اور یوں ایک نافرمان بیٹا اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

کنور نونہال سنگھ کی موت کے بعد مہارانی جنداں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے شہزادے دلیپ سنگھ کو سکھ دربار لاہور سے حکمران تسلیم کروا کر خود اتالیق بن کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ لیکن مختلف سکھ سرکش سردار کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ نیز اُن کی باہمی رقابت۔ ہوسِ اقتدار اور ریشہ دوانیوں سے سکھ مملکت کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ اُدھر انگریز حاکم جو ستلج پار سے اپنی حریص نظروں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ سکھ مقبوضہ پنجاب اور اس سے ملحقہ زرخیز علاقہ کو اپنی مملکت میں توسیع کر کے شامل کر لیں۔ مہارانی جنداں کو بھی سکھ سرداروں کی سرکشی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اُس نے ان عناصر کا قلع قمع کرنے کے لیے پہلے تو چکنی چپڑی باتوں سے اُنہیں شیشے میں اُتارا اور پھر یہ تجویز اُن کے سامنے رکھی کہ انگریز اُن کے ملک پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے درپے ہیں اور بہادر سکھ قوم کے لیے وقت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ستلج پار کر کے انگریزوں سے پنجاب کے ملحقہ علاقے چھین کر سکھ حکومت میں شامل کر لیں۔ چنانچہ سکھ سرداروں نے انگریزی

---

ADVENTURES OF AN OFFICER IN THE SERVICE OF RANJIT SINGH. BY H.M.L. LAWRENCE (1845). لے

(رنجیت سنگھ کے حضور ایک افسر کی خدمات مصنفہ مسٹر ایچ۔ ایم۔ ایل لارنس سال ۱۸۴۵ء)

جمعیت کا غلط اندازہ کرتے ہوئے اپنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت مہیا کیا اور دسمبر ۱۸۴۵ء میں انگریزی مقبوضہ علاقہ پر ہلہ بول دیا - اس زمانہ میں انگریزی مقبوضہ علاقہ کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے - بالآخر انگریزی فوج نے سکھوں کو بمقام سبراؤں شکست فاش دی اور سکھ سُورما سر پہ پاؤں رکھ کر دارالسلطنت لاہور کی طرف پسپا ہوئے - اُن کے تعاقب میں انگریزی افواج بھی پنجاب میں گھس گئیں بالآخر ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء کو صلح نامہ تحریر ہوا جس کی رُو سے لاہور میں لارڈ ہنری لارنس کو برطانوی ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا اور گورنر جنرل کے بھائی لارڈ جان لارنس کو جالندھر دوآب کا کمشنر بنایا گیا - یہ علاقہ سکھوں سے اسی عہدنامہ کی رُو سے انگریزی عملداری میں شامل کرایا - سکھ افواج میں کمی کر کے ۲۰ ہزار پیادہ اور ۱۲ ہزار سوار کر دی گئی - اور اُن کے خلاف ۱½ کروڑ روپیہ بطورِ تاوانِ جنگ ڈالا گیا - خزانہ چونکہ بالکل خالی تھا اس لیے تاوانِ جنگ کی ادائیگی سکھ حکومت کے لیے ایک بہت بڑی دردِ سری تھی - اس موقعہ پر سردار گلاب سنگھ ڈوگرہ کی ابن الوقتی عیاری اور پیش بینی کام آئی - مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں بطور سپہ سالار حکمرانی کا نشہ اور فرمانروائی کا چسکہ حصولِ مقصد کے لیے اسے انگریزوں کی خوشنودی میں نظر آیا - اُس نے انتہائی چاپلوسی اور عیاری سے اُن سے معاہدہ امرتسر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء طے کیا اور ۷۵ لاکھ روپیہ نانک شاہی کے عوض ریاستِ جموں و کشمیر کے اقتدارِ اعلیٰ کا پروانہ حاصل کر لیا - اور یوں ایک نام نہاد جمہوریت اور سچائی پسند انگریز حکمران قوم جنہوں نے ریشہ دوانیوں ، سازشوں اور پھوٹ ڈالنے سے مسلمانوں

کی حکومت کا ہندوستان میں قلع قمع کیا تھا اس غالب مسلم اکثریت کے خطۂ جنت نظیر کو سودا بازی سے بغیر عملی تسلط حاصل کیے سکھ ڈوگروں کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر دیا اور بقول حضرت اقبالؒ ؎

دہقان و کشت و جُو و بیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اب مہاراجہ گلاب سنگھ ریاست جموں و کشمیر کا بلاشرکت غیرے مالک اور اس میں آباد ۹۵ فیصد مسلم آبادی کا مختار کل تھا ۔ مسلمانوں کے لیے گاؤکشی ، آزادانہ ادائے فرائض مذہبی اور حکومتی کارکنوں کی ستم رانی کے خلاف آواز بلند کرنا قطعی بند تھا ۔ بے گار اور محنت کی اُجرت کی عدم ادائیگی حکمران طبقہ کے حقوق میں شامل تھی ۔ رعایا کی عفت و عصمت حکمران ٹولہ کے رحم و کرم پر تھی ۔ مسلمانوں پر ٹیکس کی شرح غیر مسلموں سے دہ چند تھی ۔ مسلم کسان سال بھر محنت کرنے کے باوجود خود پیٹ بھر غلہ اور شالی حاصل کرنے سے قاصر تھا ۔ اور ہر کس زبانِ بے زبانی سے یوں گویا تھا کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مہاراجہ گلاب سنگھ کی عملداری کے دوران ریاست کا حدود اربعہ کچھ یوں تھا ۔ شمال میں کوہ کیدان و کوہ قراقرم کے علاوہ علاقہ ترکستان ، جنوب میں پنجاب کے اضلاع جہلم ، گجرات ، سیالکوٹ ، گورداسپور مشرق میں ریاست ہائے چمبہ ، تبت ، نیپال اور مغرب میں کوہ ہندوکش اور افغانستان ۔ ریاست کا کل رقبہ قریباً ۸۱ ہزار مربع میل تھا ۔ جس میں

لداخ اور گلگت کا ۱۳ ہزار مربع میل رقبہ بھی شامل تھا۔ پوری ریاست دو صوبوں جموں اور کشمیر میں منقسم تھی۔ صوبہ جموں میں اضلاع جموں۔ کٹھوعہ۔ اودھم پور۔ ریاسی اور میرپور شامل تھے جبکہ صوبہ کشمیر میں اضلاع سرینگر، اننت ناگ۔ بارہ مولا اور مظفر آباد تھے۔

ریاست کے دلفریب قدرتی نظاروں، مفرح آب و ہوا اور دیگر محاسن کے علاوہ شہنشاہ جہانگیر اپنی تزکِ جہانگیری میں رقمطراز ہے۔ کہ ملک کشمیر کے باشندے سادگی شعار۔ حاضر دماغ صحت مند حسین و جمیل فہیم اور ذکی الحس ہیں۔ کئی من وزن پشت پر اُٹھا کر ہر موسم میں پہاڑی اور خطرناک راستوں کو بہ آسانی عبور کرنے پر قادر ہیں۔ کسی قسم کی محنت و مزدوری کو عار نہیں سمجھتے۔ عورتیں اور مرد پشمینہ کے لمبے لمبے ملبوسات زیب تن کرتے ہیں جن کو ملکی زبان میں پٹو کہتے ہیں۔ یہاں پھلوں کی بہتات ہے۔ موضع پان پور کا زعفران ریاست کے علاوہ ملک سے باہر بھی مشہور ہے۔ نمک کمیاب ہے اور ہندوستان سے برآمد ہوتا ہے۔ قحط اور طغیانی کشمیر کا مقدر ہے۔ ہندو گھرانوں میں ہر سال ۱۳ بھادوں کی رات کو چراغاں کا خاص اہتمام ایک تہوار کی صورت میں کیا جاتا ہے کیونکہ عام روایت ہے کہ اُسی رات دریائے بہت (دریائے جہلم) پیدا ہوا تھا۔ کشمیر کی بہار کے علاوہ اُس کی خزاں بھی ایک منفرد شانِ دلربائی کی حامل ہے۔ شہنشاہِ اکبرِ اعظم[2] نے اسی موسم میں سرینگر کے باغات میں فصل سیب

---

۱ شاہی سیر کشمیر مرتبہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۱
۲ شاہی سیر کشمیر مرتبہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۲

شفتالو۔ انگور اور درختانِ چنار دیکھ کر کیا ہی خوب کہا ہے

ذوقِ فنا نیافتہ    ورنہ در نظر

رنگیں تر از بہار بود جلوۂ خزاں

لیکن اس جنتِ ارضی کو ڈوگرہ دورِ استبداد میں جس لوٹ کھسوٹ بیگار اور اخلاقی پستی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس نے ہر آنے والے حکمران کے نت نئے چرکوں کے لیے راہ ہموار کی اور اس طرح چوٹ پر چوٹ کھائے ہوئے مظلوم اور بے بس کشمیریوں کی عزتِ نفس بیدار ہوتی گئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت میں غیر مسلم رعایا سے امتیازی سلوک کیا جاتا کہ انہیں اول درجہ کا شہری شمار کیا جاتا جبکہ مسلمان رعایا جو غالب اکثریت میں تھی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی محنت اور خدمت پر مجبور تھی۔ اُن کی حیثیت ڈھور ڈنگر سے بھی کمتر تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی وفات سال ۱۸۵۷ء کے بعد اس کا پسر مہاراجہ رنبیر سنگھ گدی نشین ہوا۔ اس کے تین پسران پرتاپ سنگھ۔ رام سنگھ اور امر سنگھ تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ وہ بھی اپنے والد مہاراجہ گلاب سنگھ سے چنداں مختلف نہ تھا۔ رعایا بالخصوص مسلمان اس کے زرخرید غلام تھے اور ریاست کے سول انتظام یا فوج میں اُن کو کوئی قابلِ ذکر اقتدار حاصل نہ تھا۔ اُن کی عام حیثیت شودروں سے بھی کمتر تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بعد اس کا بڑا فرزند مہاراجہ پرتاپ سنگھ حکمران بنا۔ وہ ایک جابر۔ متعصب سخت گیر اور رعایا کا خون چوسنے والا راجہ تھا۔ وہ عیش پرست اور ہوسناک حکمران تھا۔ رعایا اس کے دستِ تطاول سے سخت نالاں رہی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں زیرِ زمین

سیاسی سرگرمیوں کا ڈوگرہ حکومت کے خلاف آغاز ہوا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ لاولد تھا۔ اُس کا دوسرا بھائی رام سنگھ بھی لاولد فوت ہوچکا تھا۔ البتہ تیسرے متوفی بھائی امر سنگھ کا ایک پسر ہری سنگھ نامی تھا۔ جو اپنے تایا کی وفات پر سال ۱۹۲۵ء میں گدی نشین ہوا۔

اسی زمانہ میں اندرونِ ریاست نیشنل کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جاچکا تھا جس میں علاوہ مسلم قوم کشمیری پنڈتوں کی بھی معتد بہ تعداد زیر قیادت پنڈت پریم ناتھ بزاز شامل تھی۔ جو کشمیر میں حقوقِ انسانی کے تحفظ اور شخصی آمرانہ حکومت سے آزادی کی جدوجہد شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں جاری رکھے ہوئے تھے۔ برصغیر کی تاریخ میں مسلم لیگ کی تنظیمِ نو اور قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں حصولِ پاکستان کی جنگ نے ریاستی مسلمانوں میں بھی جوش و اشتیاقِ آزادی پیدا کیا اب وقت کی ضرورت کے تحت مسلم کانفرنس کی بناء ڈالی گئی اور اہلِ کشمیر اپنے محبوب قائدین سردار عبدالقیوم، سردار محمد ابراہیم، چوہدری غلام عباس، مسٹر کے۔ ایچ خورشید، میرواعظ محمد یوسف، میرواعظ محمد فاروق وغیرہم کی قیادت میں کفن بردوش میدانِ عمل میں کود پڑے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے خاندانی نسخہ تشدد کو آزمایا۔ حریت پسندوں پر گولیوں کی بوچھاڑ متعدد بار اور مختلف مواقع پر کروائی لیکن اس سیلاب کے آگے حریت کا بند باندھنا ناممکن ہوگیا۔ پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی بھمبر، پونچھ، کوٹلی، گل پور، تھروچی اور ریاست کے غربی علاقوں کے فوجی تربیت یافتہ پنشن خوارانِ سرکارِ انگریزی افراد نے بزورِ شمشیر ریاستی بزدل ڈوگرہ افواج سے موجودہ آزاد کشمیر کا علاقہ چھین لیا۔ جب مہاراجہ

ہری سنگھ کو بزورِ شمشیر اپنی کامیابی ناممکن دکھائی دی تو وہ سرینگر سے فرار ہوکر جموں چلا گیا اور باوجود پاکستان سے معاہدۂ قائمہ کر لینے کے اپنے بھارتی غمگساروں سے ساز باز کرتا رہا - بالآخر رعایا کی غالب اکثریت کی خواہشات کے برخلاف اُس نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارت سے غیر فطری الحاق کی دستاویز پر دستخط کر کے فوجی امداد حاصل کی اور سنگینوں کے سائے میں اپنی عملداری سے راہِ فرار اختیار کر کے دہلی چلا گیا اور یُوں کشمیری مسلمانوں کے لیے ایک دائمی کربناک کیفیت کا اعادہ کر گیا ۔

غیر سے رسمِ وفا خُوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے مگر اُس میں وفا ہے تو سہی

ریاست جموں و کشمیر کی سال ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہر دو صوبہ جموں و کشمیر کی مجموعی آبادی ۴۰۲۱۶۱۶ تھی جس میں سے صوبہ کشمیر کی آبادی ۲۰۴۰۱۸۳ نفوس پر مشتمل تھی جبکہ صوبہ جموں میں کل ۱۹۸۱۴۳۳ نفوس آباد تھے ۔ صوبہ کشمیر کا رقبہ ۶۲۳۵۵۴ مربع میل اور صوبہ جموں کا رقبہ ۱۱۲۳۷۸ مربع میل ہے ۔

ریاست کشمیر کے روابط اقتصادی - معاشرتی - مذہبی - تجارتی - تمدنی - اور قدرتی آبی گذرگاہوں کی بنا پر پاکستان کے عین شمال میں ہونے کی بنا پر اظہر من الشمس ہیں ۔ اس کے دریاؤں کی گذرگاہیں پنجاب کی سرزمین سے ہوکر بھارت کی طرف مڑتی ہیں - دریائے سندھ تو قطعی پاکستان سے متعلق ہے ۔ جبکہ دریائے جہلم - چناب - راوی اور بیاس کا بھی پاکستانی علاقہ میں ہی بہاؤ ہے ۔ تقسیمِ ملک سے پہلے کشمیر کی تمام تر عمارتی لکڑی جہلم اور

چناب کے ذریعہ دریائی سفر طے کر کے ہندوستان مجھوائے جانے کے لیے پنجاب میں لائی جایا کرتی تھی۔ ریاست کا ریل کا واحد رابطہ ریاست جموں کے ساتھ بھی سیالکوٹ (پنجاب) پاکستان ہی کی طرف سے تھا۔ بڑی راستے بھی تمام تر صوبہ پنجاب سے ہی کشمیر کو باقی دُنیا سے ملاتے تھے جن سے کشمیر کی بیرونی دُنیا سے جُملہ تجارت کا راستہ سارا سال کھُلا رہتا تھا۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں[1]۔ راولپنڈی سے کوہ مری۔ یہاں سے کوہالہ۔ وہاں سے بارہ مُولا اور پھر سرینگر کل مسافت ۱۳۲ میل۔ اس کو بادشاہی راستہ یا پیر پنجال کا راستہ بھی کہتے ہیں۔ اب چونکہ ریاست دو ممالک میں عارضی انتظام کے تحت بطور آزاد کشمیر بٹ چکی ہے اور ابھی اس متنازعہ مسئلہ کا فیصلہ باقی ہے اس لیے اس شاہراہ سے استفادہ ممکن نہیں رہا۔ اس راستہ میں قدرتی مناظر۔ دریاؤں اور آبشاروں کے نظارے اور چشموں کے شفاف پانی کے نظاروں سے پاکستانی سیاح محظوظ ہونے سے قاصر ہیں۔ اس طویل پہاڑی سفر میں علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے پُلوں کے دو ہزار سے زائد بڑے پُل ندی نالوں پر بنے ہوتے ہیں۔

ریاست کشمیر میں گجرات (پنجاب) کی طرف سے جانے کا راستہ[2] گجرات سے بھمبر (۲۸½ میل)۔ بھمبر سے سید آباد (۱۴ میل)۔ سید آباد سے نوشہرہ (۱۲ میل)۔ نوشہرہ سے چنگس (۱۴ میل)۔ چنگس سے رام پور راجوری (۱۴ میل) راجوری سے تھنہ منڈی (۱۴ میل) وہاں سے بہرام گلہ (۱۰ میل)۔ بہرام گلہ

---

[1] راہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۳
[2] راہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۱۷ تا ۲۱

سے ہوشیانہ (۱۰میل)۔ ہوشیانہ سے علی آباد سرائے (۱۱میل)۔ علی آباد سرائے سے ہیرا پور (۱۳میل)۔ ہیرا پور سے شوپیاں (۵میل)۔ شوپیاں سے رامو (۱۲میل) اور رامو سے سرینگر (۱۸میل)۔

ایک اور راستہ راولپنڈی سے سہالہ سے کہوٹہ۔ کہوٹہ سے لچھمن پتن (۲۰میل)۔ لچھمن پتن سے پلندری (۱۵میل)۔ پلندری سے ہیلاں (۱۵میل) ہیلاں سے ہجیرہ (۱۲میل)۔ ہجیرہ سے پونچھ (۱۰میل)۔ پونچھ سے علیاباد (۱۶میل)۔ علیاباد سے اوڑی (۱۷میل)[۱] اوڑی سے رام پور (۱۳½میل) رام پور سے بارہ مولا (۱۴میل) اور بارہ مولا سے پٹن (۱۷میل)۔ پٹن سے سرینگر (۱۷میل)۔

[۲] اس کے علاوہ ایک راستہ سیالکوٹ سے بھی ریاست کو جاتا ہے۔ سیالکوٹ سے پہلے بذریعہ ریل جموں جایا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی علاقہ چک امرو (تحصیل شکرگڑھ ضلع سیالکوٹ) تک اب ریل جاتی ہے۔ سیالکوٹ سے چک امرو تک (۱۱۵میل)۔ چک امرو سے جموں اور پھر جموں سے ادھم پور (۴۰میل) ادھم پور سے بٹوٹ (۳۵میل) بٹوٹ سے رام سو (۳۲میل) رام سو سے ویری ناگ (۲۳میل) ویری ناگ سے اسلام آباد (۱۷میل) اور اسلام آباد سے سرینگر (۳۴میل)

[۳] ضلع جہلم سے بھی براستہ میرپور (۳۰میل)۔ میرپور سے کوٹلی منگرالاں (۲۴میل)

---

۱ رہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۲۲ تا ۲۶

۲ رہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۳۰

۳ رہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۳۶

اور کوٹلی سے پونچھ (۲۷ میل) اور پونچھ سے سہالہ ضلع راولپنڈی والے راستہ سے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے سرینگر پہنچ جایا کرتے تھے۔

لے راولپنڈی سے ایک آرام دہ اور قدرتی مناظر سے بھرپور راستہ ریاست کشمیر کو جاتا ہے۔ راولپنڈی سے بھارا کوہ (۱۳ میل)۔ بھارا کوہ سے ٹریٹ (۱۲ میل)۔ ٹریٹ سے کوہ مری (سنی بنک ۱۳½ میل) سنی بنک سے پھگواڑی (۱۴ میل)۔ پھگواڑی سے کوہالہ (۱۴½ میل)۔ کوہالہ سے دولائی (۱۲ میل)۔ دولائی سے دومیل (۱۱ میل) دومیل سے گڑھی (۱۴ میل) گڑھی سے چکوٹھی (۲۳ میل) چکوٹھی سے اوڑی (۱۳ میل) اوڑی سے رامپور (۱۳½ میل)۔ رام پور سے بارہ مولا (۱۴ میل)۔ بارہ مولا سے پٹن (۱۷ میل) اور پٹن سے سرینگر (۱۷ میل)۔

منگرال قوم کی تاریخ ماضی کے دھندلکوں اور وقت کی گرد سے اٹی پڑی ہے۔ اس قوم کے ذی مرتبت حکمرانوں نے دیگر سابقہ ریاستی سرداروں کی طرح اپنے بزرگوں کے شجرۂ نسب کی حفاظت کے لیے ریاست کے چیدہ چیدہ داستان گو اور میراثی قوم کے افراد کا انتخاب کیا۔ جنہوں نے شجرۂ قوم کو حفظ کرنے کے علاوہ اہمیت کے حامل شواہد کو کبت کی صورت میں اپنے سینوں میں محفوظ رکھا۔ ان میں سے سر فہرست رائے قادر میراثی اور رائے دتو میراثی ہیں جن کو منگرال راجاؤں نے

---

لہ راہنمائے کشمیر مصنفہ محمد الدین فوق صفحہ نمبر ۴۸

لے وادیٔ سہنہ تحصیل کوٹلی مضمون از راجہ محمد یعقوب خان ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میرپور در ماہنامہ "نظام تعلیم" سیالکوٹ اشاعت نومبر ۱۹۵۵ء

جاگیرات عطا فرمائیں اور جن کے بعد اُن کی اولادیں قدیم منگرال حکمرانوں کے نسب نامے اور متعدد واقعات ازبر رکھے ہوئے ہیں اور اپنے باپ دادا کی حاصل کردہ جاگیروں پہ آج بھی متصرف ہیں۔ اسی میراثی خاندان کے ایک فرد صاحب دین سے سال ۱۹۵۵ء میں میرپور کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز راجہ محمد یعقوب طارق نے (جو آج کل موضع لہری ضلع جہلم میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں) قوم منگرال راجپوت سکونتی علاقہ کوٹلی منگرالاں کے بارہ میں معلومات حاصل کر کے ماہنامہ نظام تعلیم سیالکوٹ کے شمارہ نومبر ۱۹۵۵ء میں ایک مضمون بعنوان "وادیٔ سہنہ تحصیل کوٹلی ضلع میرپور" شائع کروایا جس سے تاریخ منگرالاں پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ مؤلف نے بھی میرپور۔ گل پور۔ کوٹلی منگرالاں کا دورہ کیا اور منگرال قوم کی متعدد شخصیتوں اور معتبرین سے اس بارہ میں تصدیق و تحقیق کے بعد حقائق ذیل کا اعادہ کرنے کے قابل ہو سکا ہے۔ ان میں میجر الف خان صاحب سکنہ میرپور۔ راجہ محمد صدیق صاحب ایڈووکیٹ میرپور کرنل راجہ محمد محمود صاحب سکنہ کھڑی متصل گل پور لفٹیننٹ کرنل راجہ محمد سرور صاحب قابل ذکر ہیں۔

اُوپر بیان کردہ ماخذ کے مطابق منگرال قومیت کا آغاز اس کے مورث اعلیٰ راجہ منگر پال کے نام سے ہوا۔ جس کے آباؤ اجداد کا سلسلہ اجودھیا (بھارت) کے چندربنسی خاندان کے راجہ رامچندرجی سے جا ملتا ہے اس خاندان کے راجہ ہریش چندر کے لواحقین سے ایک جنگجو۔ ہمت جو اور بہادر راجہ بیکانیر (بھارت) پہنچا اور وہاں کا حکمران بنا۔ اس کے ورثا پانچ پشت تک بیکانیر میں حکمران رہے۔

آخری راجہ کے دو پسران نرمل دیو اور بالی دیو تھے۔ نرمل دیو تو ریاست بیگانیر سے ہی منسلک رہا لیکن اُس کا برادرِ خورد بالی دیو بارہویں صدی عیسوی میں سیالکوٹ (پاکستان) پہنچا۔ یہاں اُس کے ہاں منگرپال نامی فرزند تولد ہوا۔ یہ راجکمار شروع ہی سے چست و ہشیار، مضبوط قویٰ کا مالک اور حاضر دماغ نونہال تھا۔ عنفوانِ شباب کو پہنچتے ہی اُس نے دفاعی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتے ہوئے فنِ حرب و ضرب میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی۔ اور اپنے والد بالی دیو کی وفات پر سیالکوٹ کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے ہمراہیوں سمیت ریاست جموں کے علاقہ راجوری میں قسمت آزمائی کے لیے آنکلا آیا۔ یہیں پر اُس کے ہاں واحد پسر ہندو دیو تولد ہوا۔ راجہ منگرپال اپنی گوناگوں صفات شجاعت و مردانگی معاملہ فہمی۔ ادراک اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر اپنے بیگانوں میں یکساں مقبول تھا۔ راجوری میں ہندو اور مسلمان دونوں اقوام میں منگرال راجپوتوں کی موجودگی اس امر کی غماز ہے کہ راجہ منگرپال اس حصّہ ریاست میں اپنے دور میں ضرور بالضرور صاحبِ اقبال شخصیت تھا اور اگرچہ اُس کے واحد پسر ہندو دیو ہی کی نشان دہی ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ اُس کی اولادیں ایک سے زاید ہوں لیکن دوسروں کو غیر معروف گردانتے ہوئے ہمارے داستان گو میراثی اُن کا تذکرہ ارادتاً یا غیر ارادی طور پر چھوڑ گئے ہوں۔

---

ہ وادیٔ سہنسہ تحصیل کوٹلی مضمون از راجہ محمد یعقوب خان ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میرپور در ماہنامہ "نظامِ تعلیم" سیالکوٹ اشاعت نومبر ۱۹۵۵ء

بہرحال راجہ منگر پال کا پوتا راجہ سہنس پال راجوری سے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ریاست جموں کے ضلع میرپور کی تحصیل کوٹلی (حال ضلع کوٹلی) کے علاقہ ـ موضع ملوٹ میں نقلِ مکانی کر آیا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کچھ عرصہ قیام پذیر رہا اور کچھ جمعیت اپنے ساتھ ملالی۔ جب اُسے عوام میں ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تو اُس کی سیمابی اور مہم جُو طبیعت نے اُسے اور آگے بڑھنے پر اُکسایا بقولِ اقبالؒ ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!

اب اُس نے موضع ملوٹ سے جانبِ شمال غرب پہاڑی کے دامن میں موضع چھیدچھ سے ملحق موضع کوہرا کو آباد کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت بطور قبیلہ قوم منگرال بستی بسالی۔ اس قدیم بستی کے کھنڈرات اور آثار آج بھی زبانِ بے زبانی سے گویا ہیں کہ ؏

کبھی اِس راہ سے کوئی گیا تھا

اس بستی اور علاقہ سے ملحق موضع گُل پور۔ تھروچی اور اُنکورہ کا درمیانی خطہ ہندو بھاٹ یعنی مہتروں کی عملداری تھی جو آج کل وادی سہنسہ کہلاتی ہے۔ یہ علاقہ ہندو مہتروں کو راجپوت گکھڑ سرداروں کی طرف سے بعوض خدمت بطور جاگیر ملا ہوا تھا۔ جب ان ہندو مہتروں کو علم ہوا کہ اُن کی جاگیر سے ملحق اعلیٰ ہندو جاتی کا ایک راجہ اپنے ہمراہیوں کی معیت

---

ل مضمون "وادی سہنسہ تحصیل کوٹلی" از راجہ محمد یعقوب خان ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میرپور شائع شدہ ماہنامہ نظامِ تعلیم سیالکوٹ اشاعت دسمبر ۱۹۵۵ء۔

میں آباد ہوا ہے تو وہ اپنے روایتی انداز میں راجہ سہنس پال کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کورنش بجا لاتے۔ اس کے ساتھ ہی ملتجی ہوتے کہ اُن کی رکھشا کی جاتے اور اُن کی موجودہ و آیندہ تکالیف کا مداوا کر کے اُنہیں ترقی یافتہ عہد سے ہمکنار کیا جائے۔ راجہ سہنس پال ایک مدبر۔ پیش بین اور وسیع النظر انسان تھا۔ اُس نے اپنی خداداد فراست سے بھانپ لیا کہ قدرت اُس پر مہربان ہے اور تاجِ سلطانی کی راہیں اُس کے لیے خود بخود ہموار ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اُس نے کمال دانائی اور وقار سے مہتر سرداروں کو دان پُن کرتے ہوئے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اُنہیں ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ اُن کی مکمل طور پر رکھشا کرے گا۔ اُس نے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے موجودہ گاؤں میں اپنے کچھ ساتھیوں کو چھوڑ کر خود مہتر عملداری کے پہاڑی سلسلہ کے گاؤں مکہ ٹرانہ میں اقامت اختیار کر لے گا۔ اب وہ اس نئی جگہ پر معہ اپنے معتبر معتقدین آباد ہو چکا تھا۔

راجہ سہنس پال نے یہاں بھی اپنی روایتی رواداری۔ محبت و آشتی۔ راج نیتی اور داد و دہش سے اہلِ موضع اور اِرد گرد کے ساکنان علاقہ کے دلوں کو رام کر لیا اور جلد ہی عوام و خواص اُس کے گُن گانے لگے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ مہتر سرداروں کا اثر و رسوخ زائل ہوتا گیا۔ اب راجہ سہنس پال کسی مناسب وقت کی اِنتظار میں رہا کیونکہ اُسے علم تھا کہ گکھڑ سردار اپنے پروردہ مہتروں کے پُشت و پناہ ہیں۔ اسی دوران سُلطان محمد غوری اور سلطان قطب الدین ایبک نے دو مختلف اطراف سے گکھڑ سرداروں کی مملکت پر حملے کر دیئے۔ چنانچہ راجہ سہنس پال نے فی الفور مہتروں کی سرکوبی کر کے اُن کا اس علاقہ سے مکمل

طور پر قلع قمع کر دیا۔ اور اس پر مکمل دسترس حاصل کرتے ہوئے علاقہ کا خود مختار راجہ بن گیا۔
کیونکہ باوجود مہتروں کی استدعا کے گکھڑ سردار خود کشمکش حیات و موت میں گرفتار
ہونے کی وجہ سے اُن کی اِمداد کرنے سے قاصر رہے۔

اب راجہ سہنس پال نے موضع سائلہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہاں
آج بھی ایک پُرانی باؤلی اور بوسیدہ قلعہ کے کھنڈرات کے آثار موجود
ہیں قلعہ سے ملحق ایک بزرگ مستان شاہ ولی اللہ کا مزار ہے اور ایک
پُرانا بوہڑ کا درخت ایستادہ ہے جس کے نیچے ایک لمبا عمودی پتھر نصب
ہے جس پہ سیندور رکھ کر منگرال حکمران اور اُس کے ولی عہد کو ماتھے پر
تلک لگایا جاتا تھا۔ اُس عظیم راجہ کے وقت کے یہ آثار اُس کی شخصیت
عظمت اور راج نیتی کے شاہد ہیں۔ اس موضع سے چند فرلانگ دُور راجہ
سہنس پال نے اپنے نام پر سہنسہ نامی ایک بستی آباد کی جو ایک انتہائی
خوبصورت۔ سرسبز اور وسیع میدان پر بسائے جانے کی صورت میں ہر آنے
والے کی توجہ اپنی جانب متوجہ کراتی ہے ؎

کرشمہ دامنِ دِل می کشد کہ جا اینجا ست

آج بھی منگرال قوم کی غالب اکثریت وادی سہنسہ اور اس کے قُرب و
جوار میں اقامت گزیں ہے۔ یہ[1] علاقہ مشرق میں دریائے پونچھ اور
مغرب میں دریائے جہلم کے درمیان واقعہ ہے۔ اور شمال و جنوب کی
جانب جیلی دار سرسبز اور خوش منظر پہاڑوں اور وادیوں سے گھرا ہوا

---

[1] HISTORY OF THE PUNJAB HILL STATES VOLUME I
BY J. HUTCHISON AND J.P.H. VOGEL PAGE 48.

ہے۔ اس علاقہ میں کم وبیش اسی دیہات آباد ہیں جن کی غالب اکثریت کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اور جو قوم منگرال راجپوت سے تعلق رکھتی ہے۔ سال ۱۹۵۵ء میں اس علاقہ کی منگرال قوم کی آبادی پینسٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جبکہ اُسی سال کی مرتبہ فہرست ووٹران کے مطابق بالغ حق رائے دہی کی بنا پر قوم منگرال کے اکتیس ہزار ووٹر تھے اور اس طرح اس قوم سے اس علاقہ کے دو ممبران حکومتِ آزاد کشمیر کی اسمبلی میں نمائندگی کے لیے منتخب ہوتے۔ انتظامی امور کے تحت یہ علاقہ تین ذیلوں یعنی ذیل سہنسہ۔ ذیل کھوئی اور ذیل اُنکورڈہ میں منقسم کیا گیا ہے۔ سال ۱۹۷۲ء سے تحصیل کوٹلی منگرالاں کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا ہے جس سے قدیم کوٹلی منگرالاں سے ملحق نئی عمارات۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر اور دیگر سہولتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کے قیام کے بعد جہلم۔ منگلا۔ میرپور کے راستہ گل پور۔ کوٹلی۔ پتن۔ کھوئی رٹہ کے راستے سے اس علاقہ کو صوبہ پنجاب (پاکستان) کے دونوں اطراف سے بذریعہ پختہ سڑک ملا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ سڑک ٹوٹ چکی کی وجہ سے متعدد جگہوں سے مرمت طلب ہے لیکن پھر بھی اس علاقہ کو دوسری دنیا سے اور متعدد مقاماتِ ریاست جموں و کشمیر سے ملانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ موٹر۔ بس۔ ٹرک سے مسافر اور سامانِ تجارت کے جانے اور لے جانے کی سہولت بہم پہنچا دی گئی ہے جو بہر حال غنیمت ہے۔

راجہ سہنس پال جب امورِ سلطنت سے فارغ ہوا تو اُس نے ریاست میں ترویجِ دینِ اسلام اور عوام کے رجحانات کا بہ نظرِ عمیق جائزہ لینا شروع کیا۔ اسلامی بھائی چارہ۔ رواداری۔ تنظیم اور اخلاق نے اُسے انتہائی طور پر متاثر کیا۔ دن بدن غور و خوض اور دلچسپی نے اُسے دینِ برحق کی طرف

پُورے طور سے راغب کر دیا اور وہ کلمہ پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے دینِ اسلام قبول کرنے سے علاقہ کوٹلی کے تمام معتبرین نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔ راجہ سہنس پال نے باوجود مسلمان ہو جانے کے اپنا نام تبدیل نہ کیا۔ اب اُس نے اپنے مورثِ اعلیٰ راجہ منگر پال کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے کوہ تلی (پہاڑ کے نیچے) وادی میں کوٹلی منگرالاں نامی بستی آباد کی۔ اور پوری کوشش سے اپنی آیندہ نسلوں کے لیے مستقل دارالسلطنت کا انعقاد کیا۔ یہاں کی آبادی دن بدن بڑھتی گئی۔ راجہ سہنس پال کی وفات پر اُس کے چاروں شہزادوں راجہ دان خان۔ راجہ تاتار خان۔ راجہ قندھار خان اور راجہ جانب خان سلطنت کے مختلف اطراف وجوانب میں پھیل گئے۔ راجہ دان خان کے پسر راجہ پریتم خان اور اُن کے صاحبزادے راجہ سارا خان اور اُن کے فرزند راجہ صاحب خان اور پھر اُن کے بیٹے رائے گگڑ خان نے متعدد مواضعات اور بستیاں آباد کیں۔ تحصیل کوٹلی کا موضع گگڑ ناڑہ رائے گگڑ خان ہی کا آباد کردہ ہے۔ ان بستیوں میں مواضعات رام پتن بڑالی۔ کرتوٹ۔ چڑکی منگ۔ ہتھر نچ۔ برالہ۔ چنگ پور۔ خواص۔ اندرروٹ ٹُمرہادہ پنجیڑہ۔ تولی۔ نین سکھ۔ سیاہ۔ اودھے چھنی۔ سمہر منڈی۔ سرہٹا۔ کٹھار۔ سلام آباد۔ پچلاڑ۔ کھوٹیاں۔ گھروٹہ۔ گگڑ۔ دھڑہ۔ کھروٹ۔ پھچھ۔ اور نب قابلِ ذکر ہے۔

کوٹلی منگرالاں کے مضافات میں کرتوٹ اور اکھاڑی دو ایسی بستیاں ہیں

---

HISTORY OF THE PUNJAB HILL STATES VOLUME I&II

BY J. HUTCHISON AND J. P. H. VOGEL PAGES 46,49,59

جو کوٹلی کے آباد کیے جانے سے پہلے منگرال حکمرانوں کا پایۂ تخت تھیں یہیں کے راجہ شیر محمّد خان منگرال نے اپنے حلیف گکھڑانِ پھرہانہ کی اعانت میں ملک بالا بنگش (صوبہ سرحد) میں جا کر شہادت پائی۔ اُن کے پوتے راجہ محمّد یار خان منگرال بھی مملکتِ کوٹلی کے ایک نامور حکمران گزرے ہیں۔ اُن کے دیگر عظیم کارناموں میں جامع مسجد کوٹلی کی تعمیر بھی شامل ہے اس بستی کا ایک محلہ اُنہی کے نام سے موسوم ہے۔ اُن کے تعمیر کردہ محلات اور دیگر تعمیرات کے کھنڈر دریائے پونچھ کے اُس پار کوٹلی شہر کے مقابل نیرنگیئے فلک کے شاہد ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں سکھ دربار لاہور کی دست بُرد کے زمانہ میں مملکتِ کوٹلی منگرالاں کے حکمران راجہ محمّد یار خان کے فرزند راجہ شاہسوار خان منگرال تھے۔ سکھ افواج لاہور نے دیوان ہری چند کی زیرِ کمان اس علاقہ پر حملہ کیا۔ راجہ صاحب انتہائی بے جگری سے لڑے۔ دیگر منگرال سردار اپنی اپنی جاگیروں میں "آپ راجی" میں مگن تھے اور انہوں نے اجتماعی تحفظ کے احساس کی اہمیت کو فراموش کر رکھا تھا۔ چنانچہ دشمن کی چاروں اطراف کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکنے کی بنا پر یہ علاقہ سکھوں نے سال ۱۸۱۵ء میں فتح کر لیا اور راجہ شاہسوار خان قید ہو کر لاہور لائے گئے۔ جہاں سکھوں کی قید میں ہی وہ وفات پا گئے۔ اس طرح کوٹلی کے مرکزی مقام سے منگرال حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

---

HISTORY OF THE PUNJAB HILL STATES VOLUME I ؎

By J. HUTCHISON AND J.P.H. VOGEL PAGE 91.

منگرال قوم کی دوسری قابلِ ذکر مملکت تھروچی کا علاقہ تھی۔ جہاں تھروچی کا مضبوط قلعہ گل پور سے قریباً ۱½ میل اوپر عمودی پہاڑ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پہلے منگرال راجپوت قوم کی سربلندی کا امین تھا۔ اس علاقہ پر بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ والئی لاہور کی افواج نے سکھ سردار زور آور سنگھ کی سرکردگی میں حملہ کیا۔ منگرال سرداروں نے جن میں سردار رحمت خان۔ سردار کرم مدی خان ساکن بڑالی، سردار شادمان خان اور سردار ستار محمد خان شامل تھے مرزا ہاشم خان آف کنجلانی کی سربراہی میں سکھ افواج کا جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن وسائل کی قلت اور خوراک کی کمی کے علاوہ ارد گرد کے علاقہ پر سکھ قبضہ نے انہیں باہر سے امداد ملنے کی توقع سے ناامید کر دیا۔ چنانچہ منگرال فوج معہ اپنے مذکورہ بالا سرداران قلعہ بند ہو گئی۔ سکھ فوج نے محاصرہ جاری رکھا لیکن قلعہ تھروچی کی فصیل کی مضبوطی اور اس کی بلند پہاڑی پر موجودگی نے اس کی تسخیر کے تمام منصوبوں اور سکھ حربوں کو مٹی میں ملا دیا۔ سکھوں نے قلعہ کا محاصرہ جاری رکھتے ہوئے چالیس دن تک اُن کے باہر کی دُنیا سے رسل و رسائل اور خوراک کی ترسیل کے تمام ذرائع منقطع کر دیئے۔ جس پر مجبوراً اہلِ قلعہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یُوں بکرمی سمت ۱۹۰۸ میں منگرال حکومت کا یہ آخری نشان بھی ختم ہو گیا اور قوم کا ہر فرد حضرت علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تفسیر نظر آنے لگا

دلم بہ دوش و نگاہم بہ عبرتِ امروز  شہید جلوۂ فردا و تازہ آئینم

---

۱ مضمون "وادی سہنسہ تحصیل کوٹلی" از راجہ محمد یعقوب خان ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میرپور در ماہنامہ "نظامِ تعلیم سیالکوٹ" اشاعت نومبر ۱۹۵۵ء

اگرچہ ریاست میں سکھوں کا دورِ حکومت زوالِ سلطنتِ لاہور کے ساتھ ہی ختم ہو گیا لیکن معاہدۂ امرتسر نے ریاستِ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی غلامی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہوئے آقاؤں کی تبدیلی کا مقولہ ان پر ثابت کر دیا ۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی میرے اللہ نئی

مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ نے علاقہ کوٹلی کے مضبوط ترین قلعہ تھروچی کو اپنی صوابدید کے مطابق پھر سے درست کروایا اور اس کی جنگی اہمیت ۔ حکومت کی انتظامی گرفت کے پیشِ نظر اور منگرال قوم کو مطیع رکھنے کی غرض سے یہاں مضبوط فوجی چوکی قائم کی جو تقسیم پاک و ہند تک قائم رہی ۔ مملکتِ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر میں بھی تحریکِ آزادی نے انگڑائی لی اور ڈوگرہ غلامی کے جوتے کو اُتار پھینکنے کی جہد و جُہد زور شور سے شروع ہوئی منگرال راجپوت قومی غیرت اور انتقام کی آگ میں پچھلی صدی سے جل رہے تھے اور ریاست کی متحارب تحریکوں میں بساط بھر حصہ لیتے رہے تھے ۔ اُن کی بیشتر نفری انگریزی افواج میں بھرتی ہو کر لہو گرم رکھنے کے بہانہ عہدِ رفتہ کو آواز دیتی ہوئی وقت سے سمجھوتہ کیے ہوئے تھی ۔ اکثر فوجی پنشنر آتشِ زیرِ پا عزم کی مشعلیں روشن کیے ہوئے تھے ۔ کسے خبر تھی کہ قلعہ تھروچی جو سردار ستار محمد خان منگرال اور اُن کے جیالے ساتھیوں سے بزورِ شمشیر سکھوں نے حاصل کیا تھا ۔ اُن کے زیرک اور بہادر پڑپوتے کرنل راجہ محمد محمود خان کی حکمتِ عملی اور حسنِ تدبر سے اگست ۱۹۴۷ء میں

ہی ڈوگرہ حکمرانوں سے آزاد کروالیا جاوے گا اور قلعہ اور اس کا ملحقہ علاقہ معہ وادی سہنسہ منگرال راجپوتوں کی بہادری اور عزم راسخ سے بزورِ شمشیر ڈوگرہ حاکموں سے ـــــــ آزاد کراکے آزاد کشمیر گورنمنٹ کا بازدے شمشیر زن بنا دیا جائے گا۔ اس اجمال کی تفصیل خود کرنل راجہ محمد محمود خاں کی زبانی سُنیئے جو اُنہوں نے قلعہ تھروچی کے بالمقابل اپنی بہاڑی رہائش گاہ ڈھوک گوہڑہ بے حالیاں (موضع کھٹکلی) پر مؤلف کی اُن کی خدمت میں حاضری پہ بیان فرمائی۔

اپنے بارہ میں تفصیلات کے استفسار پہ کرنل صاحب نے فرمایا کہ وہ سال ١٨٩٣ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محض حروف شناسی تک تھی۔ قومی پیشہ سپہ گری اور راجپوتی اقدار کا تحفظ ہونے کے ناطے وہ حکومتِ ہند کی افواج میں فروری ١٩١٠ء میں بطور سپاہی بھرتی ہوئے۔ فوج میں ہی سیکنڈ انگلش آرمی کورس پاس کیا۔ اعلیٰ ڈسپلن۔ محنت اور حُسنِ کارکردگی کے حامل ہونے کی بنا پر سال ١٩٣٧ء میں صوبیدار میجر بنائے گئے سال ١٩٤١ء میں سیکنڈ لفٹیننٹ بنے۔ سال ١٩٤٢ء میں کیپٹن کے عہدہ پر ترقی یاب ہوئے۔ اور فسٹ فرنٹیئر فورس رجمنٹ (انفنٹری) سے منسلک کیے گئے۔ اپنی ملازمت کے دوران اعلیٰ کارکردگی اُن کا طُرّۂ امتیاز رہا۔ اگست ١٩٤٦ء میں یہیں سے بطور کپتان پنشن پر آئے اور موضع کھٹکلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں جموں و کشمیر میں پاکستان کے ساتھ الحاق اور ڈوگرہ استبداد سے نجات کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ کرنل صاحب کی معاملہ فہمی نے جلد ہی اُنہیں قومی شیرازہ بندی اور منگرال سابقہ فوجیوں اور فوجی پنشنروں کو ایک تنظیم کے تحت کام کرنے کے لیے

متحد کرنے کی اہمیت کا احساس دلایا اور انہوں نے دیگر منگرال سرداروں کے علاوہ علاقہ کے معتبرین کے ہمراہ جامع مسجد کوٹلی منگرالاں میں ایک میٹنگ بلائی اور جلسہ عام سے خطاب کر کے حاضرین کو علاقہ وار فوجی تنظیمیں بنانے کی افادیت سے آگاہ کیا۔ جلد ہی یہ تحریک عملی صورت اختیار کر گئی۔ علاقہ وار فوجی کمپنیاں بنائی گئیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں ۱۰ کوٹلی بٹالین معرض وجود میں آئی جس کے متفقہ طور پر کرنل اور سربراہ کرنل راجہ محمد محمود خان بنائے گئے اس بٹالین کے افراد اپنے اپنے علاقہ میں اپنی اپنی نفری کے مطابق علیحدہ علیحدہ پلٹنوں کی صورت میں دفاعی امور سرانجام دینے اور ایک دوسرے کی بوقت ضرورت امداد کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان فوجی سرگرمیوں کی اطلاع پا کر راجہ ہری سنگھ ڈوگرہ موقع پر حالات کا جائزہ لینے خود کوٹلی منگرالاں میں آیا۔ کرنل محمد محمود خان کو متفقہ طور پر سابقہ فوجیوں نے مہاراجہ سے گفتگو کرنے کے لیے منتخب کیا۔ اگرچہ مہاراجہ ہری سنگھ صرف درباری حیثیت میں کرنل صاحب سے علیک سلیک تک اپنی ملاقات محدود رکھنے کا متمنی تھا لیکن کرنل صاحب نے کمال دلیری اور بیباکی سے مہاراجہ کو بھرے دربار میں بتایا کہ منگرال قوم نے ریاست کی حکومت سے پچھلی صدی سے مکمل تعاون کیا ہے لیکن اب اُن کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ مہاراجہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق مملکت پاکستان سے کرے بصورتِ دیگر یہ غیور قوم مجبور ہو گی کہ اپنی آزادی کے لیے حکومتِ وقت سے ٹکرا جائے۔ یاد رہے کہ مہاراجہ اُس وقت برسرِاقتدار تھا اور کسی جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کے لیے کرنل راجہ محمد محمود خان جیسے جری اور مردِ آہن کی ضرورت تھی۔

کافر ہے تو شمشیر پہ رکھتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگرچہ راجہ ہری سنگھ نے اس مردِ حق گو کی بات پر ناک بھوں چڑھایا لیکن کرنل صاحب کی عسکری قوت، اثر و رسوخ اور وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوتے خاموش رہا اور بعد از ملاقات واپس سرینگر چلا گیا۔

جنگِ آزادی قلعہ ادین سے خوشحال خان ستی راجپوت کی قیادت میں اور آزاد پتن میں راجہ سخی دلیر منگرال کی سربراہی میں شروع ہوئی اور ہر دو جگہ ڈوگرہ فوج کا قلع قمع کر کے اُسے نیست و نابود کر دیا گیا۔ یوں ہر دو جگہوں پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔

دوسری جانب سہنسہ کی وادی اور قلعہ کھروچی کے علاقہ میں شورش برپا کی گئی۔ قلعہ کھروچی اور اس سے ملحق گاؤں کھروچی کے علاوہ اردگرد منگرال راجپوت قوم کی آبادی تھی جو فوجی تنظیم مرتبہ کرنل راجہ محمد محمود خان سے منسلک تھی۔

وادی سہنسہ میں صوبیدار پنشنر بارو خان سُدھن کی سرکردگی میں منگرالانِ علاقہ اور سُدھن قوم کے جری فوجیوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیتے۔ اور ڈوگرہ فوج کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ صوبیدار مذکور اسی جہاد کے دوران شہید ہو تے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

علاقہ کے فوجیوں نے ڈوگرہ سپاہ پر گھیرا تنگ کر کے اُنہیں ختم کرنا چاہا لیکن ڈوگرہ فوج کے مسلمان کرنل حمید خان نے مہلت طلب کر کے کمال

عیاری سے رات کے اندھیرے میں ڈوگرہ اور مسلم (ملی جلی) فوج کو یہاں سے نکال لیا۔

اب جہاد کا محور کرنل راجہ محمد محمود خان کا علاقہ گل پور۔ تھروچ اور کھٹکلی تھا جس کی حدود میں تھروچی کا مضبوط قلعہ ڈوگرہ حکومت کا اس علاقہ میں آخری استعماری نشان تھا۔ اس قلعہ میں دو پلٹن فورس تھی جس میں سے ایک پلٹن مسلمان سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل تھی جبکہ دوسری پلٹن گورکھا سپاہیوں کی تھی جس کی قیادت کیپٹن پریم سنگھ گورکھا کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن مسلمان پلٹن میں دو افسران کرنل محمد حسین اور کمانڈنٹ کرنل رحمت اللہ تھے۔ اس لحاظ سے ہر دو پلٹنوں کی اعلیٰ قیادت کرنل رحمت اللہ کے پاس تھی جس نے کرنل راجہ محمد محمود خاں کو قلعہ تھروچی میں طلب کیا۔ راجہ صاحب کرنل رحمت اللہ کو پہلے سے اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس لیے بلاخوف و خطر اُس کے پاس چلے گئے۔ اُس نے راجہ صاحب سے رسد اور خوراک کی فراہمی کی استدعا کی۔ جو اسلامی اخوت اور جذبۂ خیر سگالی کے تحت راجہ صاحب نے مہیا فرما دی۔ اس پر انہیں کہا گیا کہ وہ لوکل ہندو آبادی سے بھی فراہمیٔ خوراک کے سلسلہ میں رابطہ قایم کریں۔ چنانچہ اسی بہانہ وہ تمام علاقہ میں حالات کا جائزہ لیتے رہے اور اپنی تنظیم کی سرگرمیوں سے بھی حالات کے مطابق مناسب طور پر آگاہ ہونے کے بعد احکامات دیتے رہے۔ ایک دن وہ سہنسہ سے اپنی پوزیشن کے بارہ میں معلومات کرکے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں اُن کے ایک معتمد نے انہیں بتایا کہ دشمن تھروچی کا قلعہ خالی کرکے چلا گیا ہے۔ اُس وقت کرنل راجہ محمد محمود خان کے ساتھ صرف پانچ منگرال فوجی پنشنر تھے

وہ اپنے گھر موضع کھٹکلی جانے کی بجائے تھروچی کے پہاڑی قلعہ پر جنوبی جانب
سے چڑھ کر اندر داخل ہوتے تو سچ مچ قلعہ میں چند توپیں اور گولہ بارود کی تھوڑی
سی مقدار کے علاوہ کوئی متنفس نہ پایا۔ اُنہوں نے اِسے تائیدِ غیبی گردانتے
ہوئے نیک فال سمجھا اور فوراً ہی اپنی چادر کو پھاڑ کر جھنڈا بنایا اور اِرد گرد
کے ساتھیوں کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے اکیس توپیں سر کر کے اپنا جھنڈا
قلعہ پر لہرا دیا۔ اور ساتھ ہی اِن چھ جانبازوں نے آزادی کے پرچم کو سلامی
دی۔ ان توپوں کی گھن گرج سُن کر آزاد افواج سہنسہ سے صوبیدار خوشحال
خان اور میجر محمد حسین بھی تھروچی تشریف لے آئے اور قلعہ میں پہنچ کر کرنل صاحب
کو مبارک پیش کی۔ رات کو مخبری ہوئی کہ ڈوگرہ فوج جو شمالی علاقہ میں اپنی
پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے اپنی دانست میں قلعہ تھروچی کو محفوظ سمجھتے
ہوئے خالی چھوڑ گئی تھی توپوں کی گھن گرج سُن کر خطرہ بھانپتے ہوئے
تسخیرِ قلعہ کے لیے پورے ساز و سامان سے واپس آ رہی ہے۔ اُس
وقت کرنل صاحب اور اُن کے ہمراہی کل آٹھ آدمی قلعہ میں موجود تھے۔
اور اسلحہ بھی اُن کے پاس واجبی ہی تھا۔ افواج سہنسہ کے ہر دو افسران تو
یہ خبر سُنتے ہی سہنسہ واپس روانہ ہو گئے۔ اب کرنل صاحب نے اپنے
ہمراہیوں میں سے ایک منگرال فوجی کو یہاں سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر کوٹلی
منگرالاں میں مدد کے لیے روانہ کر دیا اور بقیہ پانچ افراد کا ٹولہ کرنل صاحب
کی قیادت میں قلعہ اور پرچم کی حفاظت کے لیے قیام پذیر رہا۔ صبحِ کاذب
کے آثار کے ساتھ ہی کرنل صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے دیکھا کہ دُشمن
کی دو کمپنیوں کے سپاہی اور افسران تین اطراف سے قلعہ تھروچی کے پہاڑ پر
چڑھ رہے تھے اور خاموشی سے اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شبخون

مارنے کے درپے تھے ۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کرنل صاحب کی چھٹی حِس نے اُنہیں اپنے ساتھیوں سمیت فی الفور قلعہ کی واحد خالی جانب سے فرار ہو جانے کا مشورہ دیا۔ جس پر اس صفائی سے عمل کیا گیا کہ ڈوگرہ فوج کو وہم تک نہ ہوا کہ کس نے قلعہ پر تصرف کر کے جھنڈا لہرایا تھا کرنل صاحب ملحقہ پہاڑی پر اپنے ڈیرہ ڈھوک گوہڑہ بے حالیاں (موضع کھٹکلی) میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بحفاظت صبح ہونے سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے ۔ اور وہاں سے دُشمن کی نقل و حرکت کا بخوبی نظارہ کر رہے تھے ۔ اس سے چند گھنٹے بعد کوٹلی منگرالاں سے ستائیس "۲۷" فوجی جوانوں کی کمک کرنل صاحب کے پاس محمد اقبال بٹ کی سرکردگی میں پہنچ چکی تھی ۔ لیکن چونکہ یہ جوان دیر سے پہنچے تھے اس لیے قلعہ کے دفاع اور جنگ و جدل کی صُورت پیش نہ آسکی ۔ اور اب کرنل صاحب کے پاس حکمتِ عملی اور موزوں وقت میں کسی مناسب اقدام کرنے کی صُورت کے علاوہ اور کوئی طریقہ کار نہیں رہا تھا کیونکہ اپنی تھوڑی سی نفری کے ساتھ اپنے سے کئی گنا ساز و سامان سے لیس فوج سے مقابلہ کرنا خود کو ہلاکت سے دوچار کرنا بلکہ خُودکشی کے مترادف تھا۔

قلعہ تھروچی پر مکرر قبضہ کر لینے کے بعد کرنل رحمت اللہ ڈوگرہ کمانڈر نے کپتان پریتم سنگھ سے صلاح مشورہ کے بعد علاقہ میں گشت کے لیے متعدد پلاٹون بنائیں اور کرنل راجہ محمد محمود خاں کی اقامت گاہ کے بالکل ملحق بلکہ گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر اپنی فوجی چوکی قائم کر دی تاکہ وہ کرنل صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکیں ۔ اس چوکی پر گورکھا سپاہی تعینات کیے گئے ۔ اب کرنل صاحب کے لیے صورتِ حالات

نہایت سنگین ہو گئی۔ اگلے دن جب اس چوکی کے سپاہی تبدیل کرنے کے سلسلہ میں کرنل رحمت اللہ بھی آئے تو کرنل راجہ محمد محمود خان نے اُن سے تخلیہ میں بات چیت کرنے کی استدعا کی۔ چنانچہ ہر دو نے تھوڑے عرصہ کے لیے بطورِ مُسلم برادران ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو ٹھنڈے دل سے سُنا۔ کرنل راجہ محمد محمود خان نے کرنل رحمت اللہ کو کہا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور ریاست کا حکمران سکھ ہونے کے باوصف اپنے آباؤاجداد سے ہی اہلِ اسلام کا دُشمن ہے۔ اگر اب ہم نے غیر مسلموں کی جابرانہ حکومت سے گلو خلاصی نہ کروائی تو اس سرزمین میں کشمیری عوام ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے اور ہمارے آنے والی نسلیں ہماری سرد مہری اور غلامی پر مطمئن رہنے کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ کرنل محمد محمود خان نے کچھ اس درد بھرے طریقہ سے اپنی دل کی بات کرنل رحمت اللہ سے بیان کی کہ وہ اُس پر گہرا نقش چھوڑ کر ہی رہی اور اُس نے کچھ دیر توقف کے بعد راجہ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اپنے دیگر مسلمان رفیقِ کار سے قلعہ میں بات چیت کر کے مناسب اقدام کرے گا۔ اس ملاقات کے خوشگوار نتیجہ کے طور پر یہ طے پایا کہ کرنل راجہ محمد محمود خان کی رہائش گاہ پر صرف مسلمان ڈوگرہ فوجی سپاہیوں ہی کی ڈیوٹی لگائی جائے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن تھا جبکہ کپتان پریتم سنگھ بھی اس پر متفق ہوتا۔ اس کے لیے ایک پلاٹ تیار کیا گیا۔ وہ یوں کہ دوسری صبح منہ اندھیرے ایک ڈوگرہ جتھہ بہ سرکردگی کیپٹن پریتم سنگھ بھیجا جاتے گا اور اُن کے پیچھے کرنل رحمت اللہ معہ چند مسلمان سپاہیوں کے اُن کی حفاظت کے لیے آئے گا۔ کرنل راجہ محمد محمود خان اپنے چند ہمراہیوں کو پہاڑی کے مختلف

جانب درختوں کی اوٹ میں چھپا کر فائر کھول دیں گے جس سے غیر مسلم ڈوگرہ
کپتان ہراساں ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ کے طور پر مسلمان سپاہیوں اور
کرنل کی کمپٹ یہاں رکھ دی جائے گی۔ اگلے دن یہی کچھ ہوا۔ ڈوگرہ کپتان
دیگر محاذوں پر بھی مسلمان فوجیوں کو اگلے مورچہ پر رکھوایا کرتا تھا۔ اب اس
نے خود ہی کرنل رحمت اللہ سے استدعا کی کہ سکھ ڈوگرہ فوجی تو قلعہ کی
حفاظت پر رہیں گے جبکہ مسلمان ڈوگرہ فوجی اس چوکی پر متعین کیے جاویں
اب کرنل راجہ صاحب اور ڈوگرہ فوج کے کرنل آپس میں آزادانہ صلاح
و مشورہ کرتے اور مسلمانانِ علاقہ کی آزادی کے لیے تدابیر اختیار کرنے
کے بارہ میں منصوبے بناتے۔ آخر وہ دن بھی آن پہنچا۔ جو علاقہ تھروچی
کی آزادی کا نقیب بنا۔ آپس میں طے شدہ سکیم کے مطابق رات کو
مکمل تیاری کر کے مسلمان ڈوگرہ پلٹن نے کرنل رحمت اللہ کی سربراہی میں
کرنل راجہ محمد محمود خان سے اشتراک کر کے ڈوگرہ سپاہیوں اور انکے
کپتان کو ٹھکانے لگانے کے لیے نصف شب کے قریب قلعہ تھروچی کی جانب پیش قدمی
شروع کی۔ سب سے پہلے کرنل رحمت اللہ قلعہ کی طرف اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ نکلے۔
قلعہ کی فوج بھی چوکس تھی۔ اُنہوں نے دریافت کیا کہ ایسے وقت میں کرنل رحمت اللہ کی
پلٹن کا اپنی چوکی چھوڑ کر آنے کا کیا سبب ہے۔ اس پر کرنل رحمت اللہ نے بتایا کہ اُنکی اطلاع
کے مطابق اگلی صبح قلعہ پر فوجِ آزادی کا حملہ متوقع ہے اسلیے وہ قلعہ کی فوج کی کمک کیلئے
آئے ہیں۔ کپتان پریتم سنگھ ایک عیار اور چالاک ڈوگرہ افسر تھا۔ اس نے فضا میں معاندانہ کارروائی کو
جیسے بھانپ لیا ہو نیچے اُتر آیا۔ ٹھیک اُسی وقت کرنل راجہ محمد محمود خاں کا دستہ بھی قلعہ میں
داخل ہو چکا تھا۔ اور کرنل رحمت اللہ کی مسلمان نفری کے ساتھ مل کر ڈوگرہ
فوج کا قلع قمع کرنے میں سرگرم ہو گیا تھا۔ اس طرح کپتان پریتم سنگھ

جو پہلے ہی قلعہ سے نکل گیا تھا کے علاوہ ریاستی حکمران فوج کی پلٹن کے تمام غیر مسلم سپاہی جو قلعہ تھروچی میں موجود تھے کھیت رہے۔ اور تائید ایزدی سے تھروچی کا قلعہ اور اُس کا اِرد گرد کا پہاڑی علاقہ آزاد کشمیر کی مملکت کا حصّہ بن گیا۔ کرنل رحمت اللہ اور اُس کے تمام مسلمان ساتھی اب مستقلاً ایک آزاد اور اسلامی مملکت کے جانثار اور محبِ وطن شہری بن چکے تھے۔ اور یہ سب کچھ اُس صاحبِ نظر، مخلص اور بہادر فوجی کرنل راجہ محمد محمود خان کی ایثار پیشہ جبلّت کا کرشمہ تھا جس میں منگرال راجپوت قومیّت کا غیور خون رواں دواں ہے اور جس کا نظریۂ حیات حضرت علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں کچھ یوں ہے کہ ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

تھروچی کا آہنی قلعہ آج محض بیرونی پتھریلی چار دیواری پر مشتمل ہے جس کی اندرونی عمارات ماسوائے بارود خانہ منہدم ہو کر ماضی کا افسانہ رہ گئی ہیں۔ منگرال سطوت اور ڈوگرہ جبروت کی علامت یہ قلعہ اب مقامِ عبرت ہے۔ اور یوں بھی موجودہ میکانکی دَور میں قلعوں کی فوجی اہمیت ختم ہو کر عجائب خانوں کی سی رہ گئی ہے ع

ہر کمالے را زوالے

مؤلف ریاستی علاقہ میرپور، ڈنگی پور اور کوٹلی منگرالاں کی یاترا کے دوران منگرال راجپوت قوم کی متعدد شخصیتوں سے ملا لیکن پھر بھی اس خطہ کی بہت سی برگزیدہ ہستیوں اور صاحبِ اقبالؒ بیش رو بزرگاں کے حالات وقت کی تنگ دامانی اور اُن سے متعلق ریکارڈ یا ذاتی روابط

کے فقدان کی وجہ سے حاصل کرنے سے قاصر رہا۔ بایںہمہ چند ایک بقید حیات افرادِ قوم کے حاصل کردہ مختصر احوال قارئین کے لیے باعثِ دلچسپی ہوں گے :۔

## میجر راجہ الف خان منگرال

آپ سال ۱۸۹۵ء میں راجہ طالع مہندی منگرال کے ہاں موضع فتح پور تحصیل وضلع میرپور میں تولد ہوئے۔ خاندان میں باوجود ریاستی وسائلِ تعلیم کی کمی اور ڈوگرہ حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے لیے محدود سہولتوں کے مہیا کیے جانے تعلیمی رجحان موجود تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سال ۱۹۱۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ اور عملی زندگی میں افواجِ ہند میں بطور سپاہی کلرک سال ۱۹۱۵ء میں شامل ہوئے۔ پڑھے لکھے تو تھے ہی اپنی محنت، دیانت اور اطاعت شعاری سے یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو فسٹ پنجاب رجمنٹ میں حوالدار نائک بنائے گئے۔ اپنی اعلیٰ فوجی استعداد اور فنی مہارت کی بنا پر حکومتِ برطانیہ کی طرف سے دو لیشت تک کے لیے مبلغ ۵ روپے ماہوار جنگی انعام حاصل کیا۔ اور یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو بطور جمعدار ترقی یاب ہوئے۔ اسی عہدہ سے ۲۴ فروری ۱۹۴۰ء کو ریٹائر ہوئے۔

لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۳۰ ستمبر ۱۹۴۱ء کو پھر فوج سے طلبی ہوتی اور انہیں فسٹ پنجاب رجمنٹ میں ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو بطور سیکنڈ لفٹیننٹ ترقی دی گئی۔ بعد میں مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو انہیں عارضی میجر بنایا گیا۔ اور بعد ۂ وہ اپنی سابقہ عہدہ کی پنشن پر ہی

واپس گھر آگئے۔

میجر راجہ الف خان باوقار اور پرکشش شخصیت کے حامل ہیں۔ اُنہیں اپنی پرانی خاندانی اقدار کے تحفظ کا شدت سے احساس ہے۔ اُنہوں نے ریاستی ریکارڈ کے عدم تحفظ اور اپنے آباؤ اجداد کے تہذیبی ورثہ کی تلفی پر انتہائی تشویش کا اظہار فرماتے ہوئے نومبر ۱۹۵۵ء کے ماہنامہ "نظامِ تعلیم سیالکوٹ" کا شمارہ پیش کیا جو اُن کی دانست میں اُن کے پاس اپنی خاندانی ابتدائی تاریخ کا واحد ماخذ تھا اور جس میں "وادی سہنسہ" پر ایک مضمون اُس زمانہ میں میرپور میں متعین ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکول کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

موجودہ دور میں جب کہ پرانی اقدار دم توڑ رہی ہیں میجر صاحب جیسے بزرگ غنیمت ہیں کہ اگلے وقتوں کے لوگ کہلاتے ہوتے بھی اپنے مخصوص زمرہ اور منفرد خصوصیات کے نشان ہیں اور قدیم عظمتوں کے داستان گو بھی کہ یہی حقائق تواریخِ عالم کی روح ہیں ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

میجر راجہ الف خان منگرال کے چار پسران راجہ محمد صدیق خان۔ راجہ محمد ریاض خان۔ راجہ محمد فیاض خان اور راجہ محمد الیاس خان ہیں۔

## راجہ محمد صدیق خان منگرال

آپ میجر راجہ الف خان منگرال کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آپ ۲۸ راکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں ہر طرح سے فراغت

اعزازی کرنل راجہ محمد محمود خاں صاحب

میجر راجہ الف خاں صاحب (ریٹائرڈ)

لفٹیننٹ کرنل راجہ محمد سرور صاحب

راجہ محمد صدیق صاحب ایڈووکیٹ میرپور

تھی۔ آپ بچپن سے ہی ایک ہونہار طالب علم تھے۔ ابتدائی تعلیم اور میٹرک پاس کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا۔ یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ بعد میں لاء کالج لاہور سے سال ۱۹۵۹ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل ضلعی صدر مقام میرپور میں سرکردہ ایڈووکیٹ ہیں۔ قانونی مشغلہ کے علاوہ قومی امور میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ روشن خیال اور پُرکشش شخصیت کے حامل فردِ قوم ہیں۔ اپنے سکونتی موضع فتح پور سے مستقلاً اپنی کوٹھی نمبر ۵۴ - B۲ کچہری روڈ میرپور میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اُن کے والدِ بزرگ بھی اُنہی کے پاس اقامت گزیں ہیں۔ راجہ محمد صدیق خاں کے واحد پسر راجہ محمد عمر ہیں۔

## راجہ محمد الیاس خان منگرال

آپ میجر راجہ الف خان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آپ ۱۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اُنہوں نے بی۔ اے گورنمنٹ کالج میرپور سے کیا اور لا کالج لاہور میں سال ۱۹۷۳ء میں داخلہ لیا۔ وہ بھی اپنے سب سے بڑے بھائی راجہ محمد صدیق خاں کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے متمنی ہیں۔ فارغ اوقات میں اُن کا مشغلہ کرکٹ کھیلنے کے علاوہ باغبانی بھی ہے۔ اس خاندان نے گدو بیراج سکھر میں بھی موضع بھٹہ تعلقہ پنو عاقل ضلع سکھر میں یکصد ایکڑ زرعی اراضی حاصل کر رکھی ہے۔ جہاں میجر الف خان کے دیگر دو پسران راجہ محمد ریاض خان اور راجہ محمد فیاض خان زمیندارہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ راجہ محمد ریاض خان بھی شادی شدہ ہیں اور اُن کے تین ۳

پسران راجہ قمر ریاض۔ راجہ طلعت ریاض اور راجہ عامر ریاض ہیں۔

## لفٹیننٹ کرنل راجہ محمد سرور منگرال

آپ مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۶ء کو راجہ نورداد خان منگرال کے ہاں پیدا ہوئے جن کی پہلی اولاد پنشنر صوبیدار راجہ الف خان منگرال تھے۔ لفٹیننٹ کرنل راجہ محمد سرور نے ابتدائی تعلیم کے بعد پہلے میٹرک اور سال ۱۹۵۹ء میں ایف اے پرائیویٹ طور پر کیا۔ اس سے پہلے وہ سال ۱۹۵۷ء میں کیڈٹ اکادمی کاکول میں داخل ہوئے جہاں سے سال ۱۹۵۹ء میں وہ ایک کامیاب کیڈٹ کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہوئے مورخہ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو وہ بطور سیکنڈ لفٹیننٹ ۲۰ پنجاب رجمنٹ میں متعینات ہوئے۔ سال ۱۹۶۱ء میں بطور لفٹیننٹ اُنہوں نے باجوڑ آپریشن میں نمایاں کردار ادا کیا اور وہ ایک فرض شناس، زیرک اور بہادر فوجی افسر کے طور پر اُبھرے۔ سال ۱۹۶۲ء میں وہ کپتان کے عہدہ پر ترقی یاب ہوئے۔ اس حیثیت میں بھی ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کشمیر میں اُنہوں نے انفرادی حیثیت کے حامل کردار کا مظاہرہ کیا اور نظم و نسق اور اعلیٰ فوجی مہارت کی مثال قایم کی۔ سال ۱۹۶۷ء میں انہیں میجر بنایا گیا۔ سال ۱۹۶۸ء میں اُنہیں سٹاف کالج کوئٹہ میں متعین کیا گیا۔ جنگ ۱۹۷۱ء میں وہ سلیمانکی سیکٹر میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اور متعدد معرکوں میں ہندوستانی افواج کے چھکے چھڑاتے سال ۱۹۷۴ء میں وہ لفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ آج کل وہ کمانڈنگ آفیسر ۴۷ پنجاب رجمنٹ لاہور چھاؤنی ہیں۔ کرنل صاحب ایک انتہائی دلیر

افسر۔ محبِ وطن پاکستانی۔ منکسر المزاج انسان۔ مخلص دوست اور ہمدرد قوم فرد ہیں۔ اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کے اپنے اور پرائے سبھی مدح خوان ہیں۔ منگرال قوم کو ان پہ بجا طور پر فخر ہے کہ وہ آبائی پیشہ سپہ گری کی آبرو کے نگہبان ہیں۔ اُن کے دو پسران راجہ ندیم سرور اور راجہ عثمان سرور ہیں۔

## صوبیدار پنشنر راجہ الف خان منگرال

صوبیدار پنشنر راجہ الف خان منگرال خانوادہ کے راجہ نور داد خان ولد راجہ حیدر خان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اُنہوں نے عملی زندگی کا آغاز سال ۱۹۴۰ء میں بطور فوجی سپاہی کیا۔ شروع سے ہی اپنے کارِ منصبی کو زندہ و قایم رکھتے ہوئے اپنے لیے ملکی دفاع کے زمرہ میں نام پیدا کرنے کی اُمنگ اُن کو ہر معرکہ حیات میں پیش پیش رکھنے میں ممد ثابت ہوئی۔ اپنی محنت۔ شرافت اور سچی لگن سے وہ شدہ شدہ ترقی یاب ہو کر سال ۱۹۶۹ء میں بطور صوبیدار فوج سے ریٹائر ہوئے۔ فوج سے سبکدوشی کے بعد بھی اُن کا جذبۂ خدمت جوان رہا۔ اور منگلا ڈیم پراجیکٹ کے سلسلہ میں سابقہ میرپور کی آبادی جھیل میں مدغم ہو جانے کے بعد جدید میرپور شہر میں اُنہوں نے صنعتی ایریا میں ریاست آزاد کشمیر کا اپنی نوعیت کا پہلا پرائیویٹ ادارہ "کشمیر آئل ملز میرپور" قایم کیا۔ اور یوں اپنے پیارے وطن کی صنعتی ترقی میں سرگرم کار ہیں۔ اُن کے تین پسران راجہ خالد جاوید۔ راجہ ساجد جاوید اور راجہ ماجد جاوید ہیں۔

## راجہ محمد غضنفر منگرال

آپ راجہ نورداد خان منگرال کے تیسرے فرزند ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے بعد بی اے (بی ایڈ) کیا۔ وطن میں ملازمت کرنا پسند نہ کیا۔ طبیعت میں جدوجہد کی رمق موجود تھی۔ سفر وسیلۂ ظفر کے مقولہ پر ایمان تھا۔ انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ وہاں محکمہ تعلیم میں اولاً ملازمت اختیار کی بعد میں وہاں کے محکمہ ڈاک خانہ سے منسلک ہو گئے۔ کنبہ کے جملہ افراد اُن کے پاس ہی ہیں۔ کبھی کبھار جب وطن کی یاد چٹکیاں لیتی ہے تو پاکستان آجاتے ہیں۔ اُن کے دو فرزند راجہ کامران خان اور راجہ عرفان خان ہیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا !

## راجہ محمد سلیمان خان منگرال

آپ راجہ نورداد خان کے چوتھے صاحبزادے ہیں۔ اپنے وطن میں میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی کے پاس انگلستان نقل مکانی کر گئے اور وہیں پر محکمہ ڈاک خانہ میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بھی شادی ہو چکی ہے اور ان کے دو پسران راجہ فیصل سلیمان اور راجہ عاقل سلیمان ہیں۔

## راجہ محمد ریاض منگرال

آپ راجہ نورداد خان کے سب سے چھوٹے نورِنظر ہیں۔ ابتدائی

تعلیم کے بعد بی۔ اے پاس کیا۔ ابتداً کوٹلی منگرالاں میں بطور نائب تحصیلدار تعینات ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد لندن جانے کی سوجھی اور دوسرے بھائیوں کے پاس دیارِ غیر میں جا بسے۔ آج کل وہاں عاصمہ ٹریڈنگ کارپوریشن کے نام سے ایک فرم کے مالک ہیں اور تجارت پیشہ سرگرمیوں میں قوتِ لایموت کما رہے ہیں۔

## راجہ محمد اسلم منگرال

آپ موضع براٹلہ تحصیل وضلع کوٹلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بی اے کیا اور پھر ایل۔ ایل بی کرنے کے بعد میرپور میں بطور ایڈووکیٹ عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ صوبیدار دوست محمد خان مرحوم کے پوتے ہیں۔ جو علاقہ کے ذی اثر فرد شمار ہوتے تھے۔ راجہ محمد اسلم حکومتِ آزاد کشمیر میں اپنے حلقہ پنجن سے ممبر لیجسلٹو اسمبلی منتخب ہوئے۔ وہ اس سے پہلے سٹیٹ کونسلر بھی رہ چکے ہیں۔ سیاسی شعور اور سماجی خدمت کی بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اپنے حلقہ اثر میں غایت درجہ مقبول و محترم ہیں۔

## راجہ سہیل خان منگرال

آپ بھی منگرال قوم کے نامور سپوت اور آزاد کشمیر کی اسمبلی کے حلقہ راولاکوٹ سے ممبر لیجسلٹو اسمبلی ہیں۔ سلجھے ہوئے مذاق کے حامل۔ ذی شعور اور ہر دلعزیز فردِ قوم ہیں۔ اپنے حلقہ کی نیابت غایت درجہ اخلاص اور تن دہی سے فرماتے ہیں۔ انتہائی شریف النفس۔ با اصول

پُر کشش شخصیت کے حامل ہیں۔

## راجہ محمد ایوب خان منگرال

آپ راجہ جیون خان منگرال کے فرزند ارجمند ہیں۔موضع پھیڑیاں تحصیل سہنسہ ضلع کوٹلی میں پیدا ہوئے۔آغاز میں ہی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔بی اے پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمہ انکم ٹیکس میں ملازمت سے کیا۔آج کل وہ حکومتِ آزاد کشمیر میں بطور ڈپٹی کلکٹر انکم ٹیکس راولاکوٹ متعین ہیں۔آپ ایک صاحبِ فراست۔فرض شناس۔مخلص اور تجربہ کار افسر شمار ہوتے ہیں۔عوام وخواص میں یکساں عقیدت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

## بریگیڈیئر راجہ محمد اکبر خان منگرال

آپ موضع پھگوش تحصیل وضلع کوٹلی میں پیدا ہوئے۔میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز فوجی ملازمت سے کیا۔اپنی خداداد قابلیت محنت اور اہلیت کی بناء پر ترقی یاب ہو کر بریگیڈیئر کے اعلیٰ منصب تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔آپ جذبہ حب الوطنی سے سرشار اخلاص و مروت کا پیکر ہیں۔اور منگرال قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اپنے پیشہ آبا سپہ گری کی منہ بولتی تصویر ہیں۔وہ عسکری زندگی میں اسلامی نظریہ کے اُس جذبہ کے امین ہیں جس کے تحت

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ایستادہ :- راجہ زرّین خان صاحب راجہ دانش خاں صاحب

بیٹھے ہوئے :- راجہ اکرا خاں صاحب

# منگرال نوابی

اپنے معزز و محترم بزرگوں کے بلند کردار کو اُجاگر کرنے اور کسی منفرد مقام کے حصول کی لگن نے افراد اور اقوام کو ہر زمانہ میں نئی نہج بخشی ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے متمیز کرنے اور بقائے دوام کی آرزو نے بھی افراد اور قوموں کی جُداگانہ تاریخ کا احیاء کیا ہے۔ غالباً یہی وہ جذبہ ہے جو منگرال راجپوت قوم کی ایک شاخ کے نوابی منگرال کہلانے کا محرک بنا۔ منگرال قوم کی یہ نو دمیدہ شاخ راجہ جنگ خاں منگرال کے ذی اقتدار پسر راجہ نواب خان کے نام سے اب اندرونِ کنبہ موسوم کی جا رہی ہے۔ جو موضع سرویہ تحصیل سہنسہ ضلع کوٹلی میں ایک معزز اور محترم شخصیت تھے۔ تمام گاؤں کی اراضی کے ملکیتی حقوق کے حامل۔ بادشاہ صاحب الرائے اور سرکاری دربار ی اثر و رسوخ کے مالک بزرگ ہونے کے ناطے سے اُن کے ورثا نے خود کو اُن کے نام پر نوابی منگرال کہلانا پسند کیا۔ راجہ نواب خان منگرال کے واحد پسر راجہ بدو خان بھی علاقہ کے زمیندار ہونے کے علاوہ ایک منجھے ہوئے شکاری تھے۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں وہ سرکاری افسران میں جنگلی شکار کے ماہر ہونے کی بنا پر بہت مقبول تھے۔ ڈوگرہ مہاراجہ کی تفریح اور شکار کی مہم میں شریک کیے جاتے اپنے علاقہ کے سردار گردانے جاتے تھے۔ اُن کی خدمات سرکار کے عوض انہیں ایک تلوار اور متعدد اسنادِ خوشنودی مزاج عطا ہوئیں۔ وہ خود تین ہزار کنال اراضی کے

واحد مالک تھے اور ریاست کے بڑے زمیندار وں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اُن کے دو پسران راجہ زرین خان اور راجہ اقرا خان تھے۔ سب سے پہلے غالباً راجہ اقرا خان کی اولاد نے ہی خود کو "نوابی" کہلانے کا آغاز کیا۔ کیونکہ لفظ "نوابی" اُن کی اولاد نے ہی اپنے ناموں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ راجہ اقرا خان کے سات فرزند علی الترتیب راجہ عجب خان نوابی۔ راجہ محمد رفیق نوابی۔ راجہ محمدؐ افضل نوابی۔ راجہ محمدؐ اقبال نوابی۔ راجہ طارق پرویز نوابی۔ راجہ سعید خان نوابی اور راجہ خلیق احمد نوابی ہیں۔ جن کا تفصیلاً تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اولادیں یہ حقیقت تک محو کر جائیں کہ وہ کبھی صرف منگرال راجپوت قومیت کے ہی حامل تھے اور یوں لفظ "نوابی" کی آنے والی نسل کے ناموں کے ساتھ تکرار اُنہیں محض "نوابی" قومیت کی آور د قرار دے گی۔

عذرا سے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

## راجہ عجب خان نوابی

آپ مقام سروٹہ تحصیل سہنسہ ضلع کوٹلی میں ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک اسلامیہ ہائی سکول جہلم سے سال ۱۹۵۹ء میں کیا۔ ایف اے سال ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جہلم سے بی اے سال ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم سے اور ایل ایل بی کی ڈگری سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سے سال ۱۹۶۵ء میں حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز سال ۱۹۶۶ء سے بطور ایڈووکیٹ کوٹلی کیا

راجہ عجب خاں صاحب منگھرال نوابی
پراسیکیوٹنگ انسپکٹر ، بھمبر

راجہ محمد رفیق خاں صاحب منگھرال نوابی
سب انسپکٹر پولیس، میرپور

راجہ لعل خاں صاحب منگھرال
سب پوسٹ ماسٹر شہر منڈی

جہاں انہوں نے سال ۱۹۷۴ء تک پرائیویٹ پریکٹس کی۔ سال ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء کے دوران وہ بطور عارضی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مظفرآباد (آزاد کشمیر) متعین رہے۔ اگست ۱۹۷۶ء سے وہ بطور پراسیکیوٹنگ انسپکٹر پولیس بھمبر تعینات ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت۔ محنتی۔ فرض شناس اور مقتدر پولیس افسر ہیں۔ طبیعت میں اخلاص، صلہ رحمی اور قومی اقدار کے تحفظ کا احساس نمایاں ہے۔ نہایت خلیق اور مروت پیشہ فرد قوم ہیں۔

## راجہ محمد رفیق نوابی

آپ سال ۱۹۴۴ء میں اپنے آبائی گاؤں سردبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سال ۱۹۷۳ء میں بی اے پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ اس سے بہت پہلے سال ۱۹۶۲ء کے اوائل میں جبکہ وہ ایف اے پاس کر چکے تھے بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس مظفرآباد تعینات ہوئے۔ اپنی محنت اور خداداد قابلیت کی بنا پر سال ۱۹۷۱ء میں سب انسپکٹر پولیس کے عہدہ پر ترقی یاب ہوئے۔ اپنی منفرد کارکردگی اور جرائم پیشہ افراد کی نفسیات کو سمجھنے کی غایت درجہ دسترس رکھنے کے باعث ان کا شمار ریاست آزاد کشمیر کے محدودے چند اچھے پولیس افسروں میں ہوتا ہے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں ان کو متعدد تعریفی سرٹیفکیٹ وقتاً فوقتاً دیئے گئے۔ آج کل وہ بطور سٹیشن ہاؤس آفیسر میرپور تعینات ہیں۔ ان کا واحد پسر عامر شہزاد ابھی نرسری کا طالب علم ہے۔

## راجہ محمد افضل نوابی

آپ سال ۱۹۴۶ء میں سروٹہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مڈل تک ہے۔ زمینداره کی دیکھ بھال کے علاوہ برانچ پوسٹ آفس نیو افضل پور کے پوسٹ ماسٹر انچارج ہیں۔ اپنے گاؤں کے نمبردار بھی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے نام پر موضع نیو افضل پور کی بنا ڈالی۔ جو دادی سہنسہ میں کوٹلی کہوٹہ ضلع راولپنڈی روڈ پر واقع ہے۔ موضع نیو افضل پور سے اُنہوں نے سروٹہ تک قابلِ سفر جیپ کی سڑک عوام کے اِستفادہ کے لیے اپنی مدد آپ کے اصول پر بنوائی ہے اس موضع میں اس خاندان کی کم و بیش ایک سو کے قریب مملوکہ دوکانیں ہیں۔ راجہ محمد افضل ایک ہوٹل اور ایک جنرل سٹور بھی یہیں پر چلا رہے ہیں۔ نہایت آسودگی اور وقار سے گزر بسر کر رہے ہیں۔

## راجہ محمد اقبال نوابی

آپ سال ۱۹۵۳ء میں موضع سروٹہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد الاییڈ بنک آف پاکستان میں سال ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۷۴ء میں ہی یہ ملازمت چھوڑ دی۔ اور اپنے والد کی رفاقت میں زرعی اراضیات کی دیکھ بھال اور انتظام میں سرگرم کار ہو گئے۔ یہاں بھی اُن کی سیمابی طبیعت زیادہ دیر نہ جم سکی۔ چنانچہ وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ آج کل وہ مغربی جرمنی میں کسی ربڑ فیکٹری میں قوتِ لایموت کما رہے ہیں اُن

کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔ وہ ایک ذہین اور پختہ ارادے کے فردِ قوم ہیں۔

## راجہ طارق پرویز نوابی

آپ سال ۱۹۵۰ء میں موضع سروٹہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک اور ایف اے اور مابعد سال ۱۹۷۶ء میں اُنہوں نے گورنمنٹ کالج میرپور سے بی۔اے پاس کیا۔ کالج میں قیام کے دوران ہی سیاسی شعبہ میں سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے۔ طبیعت میں قیادت کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سیمابی جبلت کے غیر شادی شدہ نوجوانِ قوم ہیں۔ اُن کا خدنگِ مزاج ہر نوجوان کے لیے کچھ اِس دُعا کا آئینہ دار ہے کہ ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو!
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

## راجہ سعید خان نوابی

آپ سال ۱۹۵۳ء میں موضع سروٹہ میں تولّد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سال ۱۹۶۸ء میں میٹرک پاس کیا۔ وطن میں پہاڑی اور مشرقی مناظر زیادہ دیر تک اُنہیں مسحور کرنے میں ناکام رہے۔ دل میں کچھ کر گزرنے اور نئے جہاں پیدا کرنے کی اُمنگ نے اُنہیں دیارِ مغرب کی یاترا پر اُکسایا۔ پھر کیا تھا۔ برطانیہ چلے گئے اور وہیں کسی مشینی فیکٹری کے کل پرزوں سے کھیلنے میں آسودگی تلاش کرکے وہیں کے ہو رہے۔ اقبال کا یہ شاہین بچہ

اُس کی تعلیم سے بغاوت کر کے دولت کمانے کے لیے اس کی ریل پیل کے چکر میں کھو گیا اور بھول گیا کہ مفکرِ قوم نے اس جیسے نوجوان کے لیے ہی کہا تھا کہ ؎

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

## راجہ خلیق احمد نوابی

آپ راجہ افرا خاں کے خورد سال فرزند ہیں جو سال ۱۹۶۰ء میں بمقام سروٹہ پیدا ہوئے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد آج کل گورنمنٹ ہائی سکول سہنسہ میں نویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ والدین ان سے غایت درجہ محبت سے پیش آتے ہیں اور یہ ہی ہیں جو اتنے بھائیوں کی موجودگی میں والدین کی آنکھوں کے سامنے ہمہ وقت تسکینِ روح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

اِن افرادِ قوم کے علاوہ دیگر بہترینِ قوم منگرال جن کے حالاتِ زندگی مؤلف کو دستیاب نہیں ہو سکے کا تذکرہ نہ کرنا قوم کے ان ذی مرتبہ بزرگوں سے ناانصافی کرنا ہو گا۔ اس لیے اس تالیف میں اُن میں چند کے ناموں کا اعادہ اس کمی کو پورا کرنے میں معاون ہو گا۔ تعلیمی لحاظ سے بھی اور ملازمتِ سرکار میں بھی اُن کی سول اور فوجی خدمات اس امر کی مقتضی ہیں کہ قوم انہیں فخر و مباہات سے یاد رکھے۔

(۱) راجہ اکبر داد خان بی اے ریٹائرڈ کلکٹر انکم ٹیکس سکنہ شہر منڈی تحصیل سہنسہ
(۲) راجہ رفیع اللہ خان بی۔اے۔ ایل ایل بی سکنہ موضع گگنا ڈہ۔

(۳) راجہ فضلداد خان بی اے - ایل ایل بی سکنہ موضع لہنٹی

(۴) راجہ عبدالمجید خان بی-اے-ایل-ایل بی سکنہ موضع شہر منڈی۔

(۵) راجہ محمد مطلوب خان بی-اے-ایل ایل بی سکنہ موضع شہر منڈی۔

(۶) راجہ عبدالرزاق خان ایم-بی-بی-ایس میڈیکل آفیسر سہنسہ سکونتی شہر منڈی

(۷) راجہ شبیر احمد، راجہ امیرداد خان بی اے و راجہ اختر حسین میڈیکل سٹوڈنٹ اسلام آباد

(۸) راجہ محمد نواز خان بی-اے بنک مینجر سکنہ موضع لہنٹی

(۹) راجہ محمد ایوب خان بی اے ڈپٹی کلکٹر محکمہ ایکسائز و ٹیکسیشن سکنہ موضع پیر ملیال

(۱۰) راجہ محمد عظیم (ڈبل) ایم اے سکنہ موضع گگنا ٹرہ۔

(۱۱) راجہ ریاست خان بی-اے ایل-ایل بی سکنہ موضع شہر منڈی۔

(۱۲) راجہ عبدالمجید خان بی-اے سب ڈویژنل مجسٹریٹ سرہٹہ

(۱۳) راجہ عبدالرؤف بی-اے تحصیلدار سرہٹہ

(۱۴) راجہ نثار احمد بی-اے-ایل-ایل-بی وکیل سرہٹہ

(۱۵) راجہ عبدالعزیز خان B.A - راجہ محمود خان B.A سکنائی سرہٹہ و گہر حصہ زیر تعلیم (ملک انگلستان)

(۱۶) راجہ لعل خان سب پوسٹ ماسٹر شہر منڈی

(۱۷) راجہ سردار خان مرحوم O.B.E کپتان ریٹائرڈ۔

(۱۸) راجہ محمد مسعود کپتان فوج سکنہ موضع پنجیڑہ۔

(۱۹) راجہ فرمان علی خان مرحوم لفٹیننٹ تمغہ جارج کراس سکنہ موضع پنجیڑہ۔

(۲۰) راجہ عبدالرزاق میجر فوج سکنہ موضع شہر منڈی۔

(۲۱) راجہ کرمداد خان مرحوم لفٹیننٹ فوج سکنہ موضع گہر حصہ

(۲۲) راجہ علی اکبر خان لفٹیننٹ فوج سکنہ تھرڈچی۔

(۲۳) راجہ نصیب اللہ خان شہید میجر فوج سکنہ تھرڈچی۔

باب پنجم

# راجہ سہنس پال اور اُس کے ورثا

راجہ سہنسپال کے دورِ سلطنت میں قوم منگرال راجپوت کی غالب اکثریت ضلع میرپور کی تحصیل کوٹلی کے مواضعات کوٹلی تھروچی۔ پھیرٹا اور برانگ کے علاوہ تحصیل بھمبر اور گرد و نواح کے علاقہ میں قیام پذیر تھی۔ کوٹلی پہلے تحصیل کا صدر مقام تھا۔
راجہ سہنسپال[1] کے چاروں پسران رائے دان خان۔ رائے تاتارخان رائے قندھار خان اور رائے جالب خان اپنی اولاد کے ہمراہ انہی مواضعات میں مقیم رہے۔ ان میں سے رائے قندھار خان لاولد فوت ہو گئے۔ اور بقیہ برادران صاحب اولاد ہوئے۔ ہمیں چونکہ منگرال راجپوت خاندان مقیم گجرات کا ہی تذکرہ اس تالیف میں مقصود ہے اس لیے صرف انہی ناموں کا اعادہ خصوصیت سے کیا جائے گا جن کی کڑیاں رائے عبدالحکیم سے ملتی ہوں۔
رائے تاتارخان کے چار پسران میں سے رائے سرفراز خان اور اُن کے تین صاحبزادوں میں سے رائے زاہد خان اور اُن کے دو لڑکوں میں سے پسرِ بزرگ رائے سعداد خان اور اُن کے تین پسران میں خورترین

---

[1] ماخذ مصدقہ شجرہ نسب تیار کردہ میاں فیاض اصغر چیئرمین درسی ادارہ گجرات

پسر رائے بخش خان اور اُن کے واحد فرزند رائے ملو خان اور اُن کے اکلوتے
لڑکے رائے محب خان سے  منگرال پڑھتی چلی گئی۔ رائے محب خان
کے بڑے لڑکے رائے حبیب خان کے دو صاحبزادے تھے۔ جن میں
سے چھوٹے پسر رائے عبدالواحد کے اکلوتے فرزند رائے عبدالحکیم نے
ریاست سے ہجرت فرمائی اور اس لحاظ سے گجرات میں ہجرت کرکے
آنے والے کنبہ منگرال راجپوت کے یہی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ بقیہ جملہ بزرگوں
کی اولاد کی اکثریت ابھی تک حدود ریاست میں ہی اقامت گزیں ہے۔

جملہ معلومات دربارہ وشا راجہ سیسش پال آ رائے عبدالحکیم اُس مصدقہ
شجرہ نسب سے لی گئی ہیں۔ جو ۳۰ مارچ ۱۹۱۴ء کا تیار شدہ ہے
اور جس کی تصدیق منگرال قوم مقیم ریاست کے سرکردہ افراد راجہ
شہامت علی خان سکنہ کھڑی - راجہ غلام احمد خان - راجہ باقر علی خان -
صوبیدار بشیر راجہ دوست محمد خان اور راجہ غلام احمد خان ذیلدار نے
فرمائی - اور جس کی تصدیق مزید تحصیل کوٹلی کے تحصیلدار صاحب نے فرمائی
گجرات میں مقیم افراد کے ناموں کا اندراج حسب تصدیق منشی میاں محمد اشرف
جو اپنے حقیقی چچازاد بھائی میاں محمد سرور خان کی معیت میں ریاست میں
اپنے آباؤ اجداد کی گمشدہ کڑیاں تلاش کرنے سال ۱۹۳۲ء میں گئے تھے -

رائے عبدالحکیم اور اُن کے اہل کنبہ کی بنا ہجرت اور نقل مکانی مجملاً باب
سوم میں بیان ہو چکی ہے - اُنہوں نے گجرات کو کیوں مقام ہجرت انتخاب
کیا یہ سوال ایک علیحدہ باب کا متقاضی ہے - تاہم بیچارگی میں سفر کی صعوبتوں
اور اُن کے نتائج و عوامل کی اس انسانی حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے
کہ جذبہ صادق حقیقی لگن اور نئی جگہ میں زندہ رہنے اور تابندہ مستقبل کی آرزو

میں جہدِ مسلسل کے آہنگ کو برقرار رکھنے میں عزم اور محنت مہمیز کا کام
دیتی ہے۔ سفر اور بے سروسامانی میں سعیِ پیہم اور کشمکشِ حیات میں ستیزہ کار
ہونے سے ہی انسانی جوہر کھلتے ہیں ؎

قدرِ مردم سفر پدید کند    خانۂ خویش مرد را بند است
تا بہ سنگ اندرون بود گوہر    کس چہ داند کہ قیمتش چند است

---

باب ششم

# سرزمین گجرات صوبہ پنجاب کا خطۂ یونان

ضلع گجرات صوبہ پنجاب کے دو دریاؤں چناب اور جہلم کے دوآبہ میں واقع ہے۔ اور اپنی منفرد تاریخی اہمیت کا حامل ہے سکندر اعظم کے حملۂ ہند کے دوران اس علاقہ کا حکمران راجہ پورس تھا۔ اس ضلع کی تحصیل کھاریاں کے پہاڑی سلسلہ میں کا موجودہ بلاہیہ دعلاقہ جو اس زمانہ میں "پاتا کوٹ" کہلاتا تھا راجہ پورس کا پایۂ تخت تھا۔

عہدِ مغلیہ میں شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر اعظم کے زیر فرمان ایک سربرآوردہ فرد ٹوڈر مل کا کائل نے گجرات کی بستی کو جو ایک بڑے سے مٹی کے ٹیلے کی صورت میں تھی ایک پُررونق شہر کی حیثیت دینے اور بادشاہ و پاشہزادگان کے سفرِ کشمیر جنت نظیر کے دوران شاہی قیام گاہ یا درمیانی منزل کا شرف بخشنے کی خاطر اس ٹیلے پر ایک پختہ حصار کی تعمیر کروائی۔ جس میں علاوہ رہائشی عمارات، مسجد، حمام، ڈھکی اور باؤلی برائے بہم رسانی آب بھی بنوائے گئے۔ اس قلعہ کی فصیل معہ متعدد بروج تعمیر ہوئی۔ قلعہ کے جنوب مشرقی جانب اس سے ملحق

---

۱؎ تذکرہ شاہدولہ از ایم۔ ایس نسیم چوہدری

شاہی بارود خانہ کی تعمیر کی گئی اور ایک محلہ کی صورت میں چند مکانات کی تعمیر برائے رہائش حکام و ملازمین سرکار عمل میں لائی گئی۔ محلہ کے سرے پر ایک پختہ چاہ موسوم "دیوان والہ" احداث ہوا جس کا پانی نہایت خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد اس چاہ کو پاٹ دیا گیا ہے۔

اوّلاً ارد گرد قلعہ آبادی کی خاطر گرد و نواح سے قوم گوجر کے افراد کو لا کر آباد کیا گیا اور یوں اس بستی کا نام گوجر ذات پڑ گیا جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ گجرات کہلائی۔ شدہ شدہ ملحقہ دیہات اور اطراف سے اہل ہنر و فن۔ کاریگر۔ چیدہ چیدہ زمیندار مصاحب اور بے گھر مزدور طبقہ نے ادھر کا رخ کیا اور قوتِ لایموت کے حصول میں سرگرمِ کار ہو گئے۔ اُن کی ایک خاصی تعداد نے قلعہ کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا لیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جگہ کی رونق بڑھتی چلی گئی۔ اس جگہ کی اہمیت اِس لیے بھی زیادہ تھی کہ یہ بستی شاہراہِ شیر شاہ سوری پر واقعہ ہے اور سیاحوں کے شمال مغرب سے جنوب مشرق کو آنے جانے کے لیے ایک پڑاؤ کی سہولت مہیا کرتی تھی۔ دوسرے ریاست کشمیر کی وادی میں داخلہ کے لیے بھمبر کے راستہ جانے والوں کو قدرتی مناظر سے پُر گزرگاہ پیش کر کے جنتِ نگاہ کی احساس سے نوازنے کی داعی تھی چنانچہ شاہانِ مغلیہ اور شہزادے جب بھی کشمیر جنت نظیر کی سحر آفرینیوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے سفر اختیار کرتے تو اُن کا شاہی قافلہ راستہ میں گجرات اور اس کے مضافات کو اپنے پڑاؤ کے لیے ضرور

منتخب کرتا۔

اُس زمانہ میں دریائے چناب گجرات شہر کے مشرقی جانب شاہدولہ دروازہ سے ملحق بہتا تھا۔ شہر سرکلر روڈ کے اندر متعدد دروازوں اور گول فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ اِن دروازوں کے محلِ وقوع کا علاقہ آج بھی سابقہ ناموں سے موسُوم ہے۔ شاہدولہ دروازہ تو آج بھی اپنی قدیم سج دھج سے مزین اپنی قدامت پر نازاں اور سرافروز ماضی کے نقوش کا امین ہے۔ جبکہ اُس کے دوسرے ساتھی دروازے وقت کے دھاروں میں بہہ کر نشانِ عبرت بنتے ہوئے معدوم ہو گئے اور اپنی مخصوص جگہوں کو کالری دروازہ۔ کابلی دروازہ۔ ڈھکی دروازہ اور شیشیانوالہ دروازہ کا نام دے گئے ہیں۔ آج ان میں سے ہر ایک کا محلِ وقوع زبانِ حال سے گویا ہے کہ ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پُختہ فصیل جو کسی زمانہ میں تمام شہر کو محیط کیے ہوئے تھی دست بُرد اور شکست و ریخت زمانہ کی نذر ہو چکی ہے۔ دریائے چناب اب شہر سے قریباً چھ میل دُور جا چکا ہے اور اُس کی واحد نشانی جسے کچھ عرصہ پہلے نالی شاہدولہ صاحب کا نام دیا گیا تھا بھی سمٹ کر مختصر سی بدرو میں تبدیل ہو چکی ہے اور شہر کی عام گلیوں کا ایک جزو بن چکی ہے۔ دریا کی موجودگی میں اُس کے کنارے شہر کو گنگا جمنی رُوپ دیتے ہوئے تھے اور سبزۂ ساحل کے علاوہ موسم میں خُنکی کی آمیزش شہر کی فضا کو معتدل بناتی تھی۔ خوبصورت فطری مناظر۔ خوشگوار آب و ہوا صحتمند ماحول ہر ذی رُوح کے لیے خوش آمدید کا پیام تھا گویا ؏

### کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ایسی روح پرور فضا میں اس خطۂ یونان میں برگزیدہ ہستیوں کا آسودۂ خاک ہونا بھی تشنگانِ فیوضِ روحانی کے لیے ایک خاص کشش کا موجب بنا جس سے اطراف و جوانب سے اصحابِ معرفت کھنچے چلے آتے رہے۔

اس سلسلہ میں موضع[1] بڑیلہ میں سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند قابیل کی ستر گز لمبی قبر کی نشان دہی ہوتی ہے۔ لیکن بعض روایات کے مطابق یہی قبر حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند سے منسوب ہے۔

ضلع گجرات کے موضع بوٹا متصل موضع ٹانڈہ میں[2] نقیب طوس اولاد بنی اسرائیل کا مدفن بیان کیا جاتا ہے۔ موضع سختان[3] متصل موضع مناور میں[4] فعیلوش نامی اولاد سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام آسودۂ خاک ہیں۔ جبکہ چھپ میں[5] سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد میں سے فلسانوس کی قبر بتائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ موضع ڈنالہ[6] میں سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اولاد ہوشیانی کا مدفن ہے۔

شہر گجرات سے ۵ میل جانب جنوب قصبہ کنجاہ میں قدیم صاحبِ دیوان و مثنوی "نیرنگِ عشق" صوفی شاعر حضرت غنیمت کنجاہی آسودۂ خاک

---

[1] تذکرہ شاہدولہ از ایم۔ ایس نسیم چوہدری میں نام موضع کیلہ درج ہے۔ ایسے نام کا کوئی موضع گجرات میں نہیں ہے۔

[2] تا [6] تذکرہ شاہدولہ از ایم۔ ایس نسیم چوہدری

ہیں جن کی شہرت اُس دور میں جبکہ وسائلِ مواصلات آج کے ترقی یافتہ دور کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر تھے۔ ملک سے باہر مملکتِ ایران میں بھی بامِ عروج پر تھی۔ وہ اپنی گراں قدر مثنوی کو شاہِ فارس سے منسوب کرتے ہوئے یوں گویا ہیں ؎

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

اُس دور میں جبکہ اطراف و جوانب میں خودشناسی۔ فقر و معرفت۔ اور روحانیت کے سرچشمے گمراہ انسانیت کی اصلاح کے لیے مختلف مراکزِ فکر و نظر کا احاطہ کیے ہوئے تھے اور ملک کی متعدد ولایت ہائے روحانی کے مختلف سربراہ موجود تھے۔ گجرات میں جود و سخا کے پیکر صاحبِ کشف و کرامت بزرگ حضرت سید کبیرالدین شاہدولہ دریائیؒ اپنے فیض و برکات سے تشنگانِ معرفتِ حق کی پیاس بجھا رہے تھے اور عملی مظاہرہ سے یہ دلنشیں حقیقت اہلِ سلوک اور مریدانِ طریقت کے ذہن نشین کروا رہے تھے کہ ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

حضرت شاہدولہ دریائیؒ کی درگاہ دنیا میں اُن کی موجودگی سے پیڑھی پیڑھی تک اللہ والوں کی جائے پناہ اور تسکینِ روح کا سامان مہیا کرتی رہی۔

---

۱۔ تاریخ گجرات مؤلفہ مرزا اعظم بیگ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بندوبست سال ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء صفحہ نمبر ۱۰۵

آج بھی یہ مرجعِ خلائق ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا کی یہ واحد بارگاہ ہے۔ جہاں زندہ انسان کے چڑھاوے کی نذر مانی جاتی ہے اور ذی رُوح بچے اور بچیاں نذرانہ کے طور پر صاحبِ مزار کی تولیت میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ چھوٹے سر کی قاتر العقل مخلوق آج بھی "شاہدولہ کے چوہے" کے نام سے موسوم حضرت شاہدولہ دریائی کے صاحبِ کرامت بزرگ ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔

دوسرے بزرگ[1] حضرت شاہ جہانگیر سال ۱۰۶۹ھ بدوران سلطنتِ مغلیہ ضلع گجرات کے موضع قادی کھو کھر میں وارد ہوئے۔ انہوں نے ارد گرد کے علاقہ میں لوگوں کی اصلاح اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ اُن کے مزار پر جو شہر کے شمال مشرق کی جانب موضع مذکور میں شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے ہر سال بکرمی مہینہ اساڑھ کی پہلی جمعرات کو میلہ لگتا ہے جس میں دُور دُور سے زائرین حضرات شرکت کرتے ہیں۔ مزار کے احاطہ کے باہر گجرات کی جنگ کے انگریز مقتولین کی قبریں ہیں جو سال ۱۸۴۹ء کی لڑائی میں کام آئے۔

ضلع گجرات کے موضع حافظ حیات میں شیخ خانقاہ حافظ محمد حیات ہے جو گجر قوم کے صوفی منش بزرگ تھے۔ وہ موضع نوجہاں تحصیل کھاریاں سے اس جگہ اقامت گزین ہوئے۔ مردِ خدا پرست، عابدِ شب زندہ دار

---

[1]، [2] تاریخِ گجرات مرتبہ سال ۱۸۹۲ء منجانب مرزا محمد اعظم بیگ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بندوبست صفحہ نمبر ۵۸۲۔

اور صاحبِ خُلق و مروّت فرد تھے۔ اُن کے اہلِ طریقت میں اُن کے گدّی نشین خانقاہ اور فقراء ازدواجی زندگی اختیار نہیں کرتے۔ چارپائی پر نہیں سوتے نہ ہی مزار کے گرد و نواح میں کسی عورت کو سونے دیتے ہیں۔ اُن کی درگاہ پر ہر سال ۹ محرم الحرام کو عرس منعقد ہوتا ہے۔

ضلع ہذا کے موضع[1] لکھنوال میں ایک خدا رسیدہ بزرگ باوا شیخ برہانؒ صاحب کا مزار ہے۔ یہ مردِ خود آگاہ فقیر منش صوفی تھے۔ اُن کے دستِ حق پرست پر اہلِ موضع کے مورثِ اعلیٰ مرزا دیہ جٹ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس طرح اُن کی مساعی سے قوم جٹ موضع ہذا مسلمان ہوئی۔ ان کا عُرس ہر سال دو بار اسلامی ماہِ شوال کی یکم کو اور پھر ذی الحجّہ کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔

ایک اور موضع[2] میوہ وال میں ایک انسان دوست بزرگ حتی شاہ رحمانؒ آج سے قریباً تین سو سال پہلے قیام پذیر تھے جو موضع شاہ رحمان ضلع گوجرانوالہ سے نقل مکانی کر کے ضلع گجرات میں وارد ہوئے۔ اُن کے مرید سید توکل شاہ نے مستقلاً اپنے پیر و مرشد کی گدی پر قیام فرمایا اور اپنے پیر کی علامتی حاضری کے طور پر اُن کے مکان میں آگ کی دھونی جلاتے رکھی۔ ہر بارہ سال کے بعد اپنے مُرشد کا عُرس مناتے اور قیام

---

[1] تاریخِ گجرات مرتبہ سال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء منجانب مرزا محمد اعظم بیگ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بندوبست، صفحہ نمبر ۵۸۳

[2] تاریخِ گجرات مرتبہ سال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء منجانب مرزا محمد اعظم بیگ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بندوبست صفحہ نمبر ۵۸۴

عرس کے وقت یہ مشہور کر دیا جاتا کہ یہ دھونی بارہ سال تک دبی رہنے کے بعد نکالی گئی ہے۔ یہ عرس ماہِ محرم میں ہوتا ہے۔

اسی طرح اور بزرگوں کے مزارات بھی ہیں جن میں قصبہ نوشہرہ میں خانقاہ پیر محمد سچیار[1] ہے جو ملک پیر محمد سچیار کے نوشاہی فقیروں کے سلسلہ سے متعلق تھے۔ اسلامی مہینہ ربیع الاوّل کی ۵ تاریخ کو ہر سال ان کا عرس کیا جاتا ہے۔ جس میں جالندھر (بھارت)۔ امرتسر (بھارت)، بھمبر (مقبوضہ کشمیر) کے علاوہ ضلع سیالکوٹ سے بھی عقیدت مند حاضری دیتے ہیں۔ مزار پر ایک راگی موجود رہتا ہے۔ ارادت مند حال کھیلتے اور بعض فقیر پاؤں میں رسی باندھ کر خود کو درخت پر سے اُلٹا برابر ایک پہر تک لٹکائے رکھتے ہیں۔

شہر گجرات کے جنوب مغربی کونہ میں حضرت شاہ حسین کا مزار ہے جو ایک مشہور بزرگِ دین تھے۔ شہر کے جنوب مشرق میں بیگم راج محل دختر راجہ تاج خان حکمران راجوری (ریاست کشمیر) کا مزار ہے جو آخری مغل تاجدار شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کی حرم تھیں۔ اور جن کے بطن سے شہزادہ معظم ملقب بہادر شاہ تولد ہوئے۔ لوحِ مزار سنگِ مرمر کی ہے۔ اور اس کے اطراف اسمائے الٰہی کندہ ہیں۔ یہ مزار ایک مسجد میں واقع ہے جو مسجد بیگم پورہ کے نام سے مشہور ہے۔

ان ہستیوں کے علاوہ ضلع گجرات کے مختلف مقامات پر بزرگانِ

---

[1] تاریخ گجرات مؤلفہ مرزا محمد اعظم بیگ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بندوبست سال ۶۶-۱۸۶۵ / ۱۸۶۸ صفحہ نمبر ۵۸۴ - ۵۸۵

دین اور متقدر علمائے کرام آسودۂ خاک ہیں۔ جو اپنی منفرد دینی استعداد اور محاسن کے حامل تھے اور جن کی بابرکات زندگانی نے اِرد گرد سے تشنگانِ علم و معرفت اور قوتِ لاہوت کے حصول کے متمنی افراد کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

یہ سرزمین ایک طرف تو زندہ دلانِ پنجاب کا مسکن تھی دوسری طرف اس کی مٹی حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت کی حامل شخصیتوں کا رنگین امتزاج لیے ہوتے تھی جس میں وفا کا رنگ رچا بسا ہوا تھا۔ وارفتگی اور ایفائے عہد کی صفات نے مشہورِ دہر عشق و محبت کی داستانوں میں سوہنی مہینوال کی داستان کا اضافہ کیا جس سے سرزمینِ گجرات کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

اس زمانہ میں صنعتِ ظروف سازی۔ چرم سازی۔ حُقّہ سازی۔ لکڑی کا کام۔ اپنے عروج پر تھا۔ غرضیکہ گجرات اپنی گوناگوں رنگینیوں اور گندم کی پیداوار کی فراوانی کے سبب مشہور تھا۔ اس لیے جہاں اطرافِ ضلع سے حاجت مند اصحاب یہاں کھچے چلے آتے وہاں ملحق علاقہ ریاست جموں کشمیر کوٹلی منگرالاں سے راجپوت منگرال خاندان کے چشم و چراغ راجہ عبدالحکیم بھی ریاست میں آئے دن کی طوائف الملوکی سے پریشان خاطر ہو کر معہ افرادِ کنبہ نقل مکانی پر مجبور ہو کر بے سروسامانی کے عالم میں گجرات چلے آئے اور ایسے آئے کہ وہ اور اُن کی آئندہ نسلیں مستقلاً یہیں کی ہو رہیں۔

یاد رہے کہ اس زمانہ میں گجرات کا ضلع سکھوں کی حکومت کا ایک حصہ تھا اور سِکھ سرداروں کی طرح یہاں کے اشراف و سرکاری کارندے

راجپوت ہونے کے باوصف خود کو راجہ یا رائے کہلانے کے بجائے میاں کہلواتے تھے۔ اسی بنا پر رائے عبدالحکیم کی اولاد یہاں برسرِ اقتدار آنے سے قبل ہی خود کو میاں کہلوانے لگی۔ اور اپنے وطن سے ہجرت کے بعد یہ پہلی تبدیلی تھی جو اُن نو واردانِ گجرات (صوبہ پنجاب) نے محسوس کی۔

گجرات را بہ جان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم

ایک[۱] روایت کے مطابق مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد میں بائیس ۲۲ پہاڑی راجپوت شہزادوں کو "میاں" کا خطاب مغلیہ دربار میں بطور یرغمال بھیجے جانے پر دیا گیا۔ گویا یہ ایک طرح اُن کی عزت افزائی تھی۔ یہ خطاب اس لیے تفویض ہوا کہ اُن کے حکمران بتا بدستور سابق مغلیہ حکومت کے وفادار رہیں۔ پہاڑی راجاؤں کو "میاں" کا خطاب شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ میں اوّلاً دیا گیا تھا۔ اور یوں رفتہ رفتہ اِن پہاڑی حکمرانوں کی اولادوں میں یہ لقب بطور خطاب مستعمل ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی روایت کے تابع سابقہ منگرال سردار خود کو "میاں" کہلواتے ہوں۔ لیکن مؤلف کے دورانِ قیام ریاست کے مشاہدہ سے اس امر کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ وادی سہنسہ یا میرپور کے کسی منگرال راجپوت کے ذی مرتبت فرد نے بالخصوص یا اس قوم

---

[۱] HISTORY OF THE PUNJAB HILL STATES VOLUME I BY J. HUTCHISON AND J. P. H. VOGEL PAGE ۹۲.

کہ کسی متنفس نے بالعموم خود کو میاں نہیں کہلایا۔ اور آج بھی سبھی
منگرال جو ریاست آزاد کشمیر میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں
موجود ہیں خود کو "راجہ" ہی کہلاتے ہیں۔ اس لیے مندرجہ بالا مفروضہ
منگرال قوم کے ریاستی ساکنان پر ثابت نہیں ہوتا۔

باب ہفتم

# گجرات میں راجپوتان منگرال کی آمد و سکونت

راجہ عبدالحکیم کی گجرات میں آمد کے وقت اُن کے ہر سہ فرزندان میاں کمال دین، میاں محمد اعظم اور میاں محمد مقصود مع دیگر اہلِ کنبہ نقلِ مکانی کرتے ہوئے اُن کے ہمراہ آئے۔ ظاہر ہے کہ اِس قدر طویل سفر کسی سمت بہ رغبتِ سفر کے ساتھ ممکن نہیں تھا۔ اُس زمانہ میں باربرداری اور بہ سہولت آنے جانے کے ذرائع بھی مفقود تھے۔ پھر ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس لیے پہاڑی راستہ کی کٹھنائی اور بیگانہ سرزمینوں میں منزل بہ منزل قیام کی ناخوشگواری، ایک حساس دل رکھنے والے کو اس مصیبت زدہ مہاجر کنبہ کے احوال کو سمجھنے کے لیے کسی منظر کشی کی طالب نہیں ہوگی۔ ریاست کی حدود سے نکل کر براستہ بھمبر پیدل سفر سے اُفتاں و خیزاں یہ مختصر سا قافلہ سرزمینِ پنجاب کے سرحدی ضلع گجرات کی تحصیل گجرات کے صدر مقام تک پہنچا اور اوّلاً شہر کے مضافات میں فروکش ہوا۔ یہاں نسبتاً سکون تھا کیونکہ سکھوں کے مستقل قبضہ اور عملداری کے باعث یہاں کا انتظام و انصرام ریاست کی ہنگامہ خیز زندگی سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ محنت مزدوری اور روزی کمانے کے وسیلے ذرائع میسر تھے۔ پھر محنت کے خوگر افراد کے لیے جڑ کا رہنا کسی قدر

میں بھی مقتدر نہیں ہوا کرتا - پنجابی مثل ہے "کر سر دوری تے کھا چوری"
راتے عبدالحکیم کے نوجوان بچے اپنے بوڑھے اور جفاکش باپ کا
سہارا بن گئے - میاں کمال دین اور میاں محمد مقصود یہاں کے سکھ نظامِ سلطنت
اور عرفِ عام بول چال میں "راتے" سے "میاں" کے مستقل اور معزز لقب
میں تبدیل ہو چکے تھے - راجہ یا راتے کا مفہوم وہ ریاست میں ہی چھوڑ آئے
تھے اور اب بطور عام آدمی وہ ترقی کے منازل نئے ماحول کی قدروں
کے سایہ میں طے کرنے پر مستعد تھے - میاں کمال دین نے سکھ فوج
میں بطور سپاہی ملازمت کر لی - جبکہ میاں محمد مقصود نے دیوان کے
یہاں منشی گیری سے قوتِ لایموت کمانے کا سلسلہ شروع کیا - میاں
محمد اعظم نے حفظِ قرآن کر کے بھائیوں کی عدم موجودگی میں والدِ بزرگوار کی
خدمت کو اپنا شعار بنایا - روایت ہے کہ اب اس کنبہ میں ایک متوسط
گھرانے کی جملہ خصوصیات موجود تھیں اور وہ اپنی ہجرت سے پوری طرح
مطمئن تھے - کہ راتے عبدالحکیم کا انتقال ہو گیا - اُن کے سایہ عاطفت سے
محرومی اہل کنبہ کو غم سے ایک دفعہ پھر نڈھال کر گئی - لیکن قدرت کو کچھ
اور ہی منظور تھا - اُسی زمانہ میں سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کشمیر
کی طرف کوچ کرتا ہوا وارد گجرات ہوا اور لاہور واپسی سے قبل ایک
دن یہاں کے قلعہ شاہی میں قیام پذیر ہوا - میاں محمد اعظم اپنی والدہ
اور دیگر افرادِ کنبہ کے ہمراہ قلعہ سے ملحقہ بارہ دری (جو بعد میں محلہ
چابکسواراں کے نام سے موسوم ہوا) کے پاس رہتے تھے - حسبِ معمول
میاں محمد اعظم نے علی الصبح نہایت خوش الحانی سے تلاوتِ قرآن حکیم
بلند آواز میں فرمائی - اور بعد میں درد بھرے لہجے میں دُعا سنائی

کا ورد شروع کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس آواز سے بے حد کیفیۃ خاطر ہوا اور حکم دیا کہ اس گلوکار کو فی الفور حاضر کیا جاوے۔ چنانچہ شاہی چوبدار میاں صاحب کو کشاں کشاں مہاراجہ کے حضور لے گئے۔ مہاراجہ نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اس خوبرو نوجوان کو دیکھا جس کے بشرہ سے خاندانی نجابت اور سعادت کے آثار ہویدا تھے۔ اس عمر میں جبکہ جوانی افراد کو غلط راستوں پر ڈالنے کا موجب بنتی ہے اس تومند۔ حسین وجمیل نوجوان کا مذہب کی طرف جھکاؤ مہاراجہ کے لیے لمحۂ فکریہ کا باعث بن گیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اپنے دل ہی دل میں مہاراج نے اُنہیں اپنے ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور کہا کہ میاں صاحب کو اُس کے شاہی خاندان کی خدمت گزاری کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے تحت میاں صاحب نے سرِ تسلیم خم کیا۔ گھر پر آ کے اہلِ خانہ کو مہاراجہ کا حکم سنایا۔ فوراً تیاری کی اور یوں میاں محمد اعظم اپنی زوجہ اور دو خوردسال بچوں میاں رسول بخش اور میاں نور خان المعروف میاں قمہ خان، مہاراج کے قافلے کے ہمراہ عازمِ لاہور ہو گئے۔

شاہی محل میں میاں محمد اعظم کی ذاتی کارکردگی مہارانی جنداں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت اور گھریلو امور کی دیکھ بھال تک محدود تھی۔ اُنہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کی تعلیم کا احساس بھی حکومت کے سربراہ کی معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ وری اور اپنے بچوں کو بھی خوشحال دیکھنے کی تمنا کے تحت کیا اور دونوں بچوں کو مقامی درسگاہ میں مہاراج کی اجازت سے بھیج دیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے

مصداق ہر دو برادران نے مسجد کی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہونے کے
بعد ابتدائی فارسی اور گورمکھی میں دسترس حاصل کرلی۔ دونوں ابھی جوانی
کی حدود کو چھونے ہی لگے تھے کہ میاں محمد اعظم کا انتقال ہوگیا۔ اب ہر
دو بھائیوں کو اپنی اپنی زندگی کی راہیں متعین کرنے کے لیے سنجیدگی سے غور
کرنا پڑا۔ اُن کے جملہ لواحقین گجرات میں مقیم تھے جبکہ وہ اپنے والد کے
ہمراہ لاہور میں خدمتِ شاہی سرانجام دے رہے تھے۔ میاں رسول بخش
بھی حسین وجمیل ہونے کے علاوہ اپنے والدِ مرحوم کی طرح پُروقار شخصیت
کے حامل تھے۔ اُن کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل میں اس قدر ہر دلعزیزی
اور رسائی حاصل تھی کہ مہارانی جے دیوی معروف بہ رانی جنداں اُنہیں
بھرا دبھی دو لیا، کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ ایک دن میاں صاحب نے مہارانی
کو اعتماد میں لے کر اپنے گھریلو حالات اور پریشانی سے اُنہیں متاثر کرتے
ہوئے عرض کی کہ مہاراج سے اُنہیں گجرات چلے جانے کی اجازت
حاصل کرنے میں امداد فرمائیں۔ مہارانی کی سفارش پر مہاراج نے اُن
کی درخواست منظور کرتے ہوئے اپنے سپہ سالار سردار گلاب سنگھ
ڈوگرہ کو حکم دیا کہ وطن کے اس جاں نثار نوجوان کو بطور کاردار بارہ دو خانہ
گجرات تعینات کردیا جائے۔ اس طرح میاں رسول بخش لاہور سے سکھ
حکومت کی طرف سے تعلقہ گجرات کے کاردار بارہ دو خانہ مقرر کردیئے گئے۔
یہاں پر بھی اُنہوں نے اپنی محنت۔ دیانت۔ فرض شناسی اور خاندانی نجابت
کی دھاک بٹھادی۔ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ خدمتِ
خلق کے کاموں میں لگے رہتے۔ اُن کے خلوص اور کردار کی بلندی سے حکومت
اور عوام یکساں متاثر تھے۔ اُن کی معاملہ فہمی اور حکومت کا اُن پر اعتماد قائم

اُس حکمنامہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو سردار گلاب سنگھ ڈوگرہ سپہ سالار نے اُن کے نام ۱۳ اسوج سمت ۱۸۸۹ کو جاری کیا اور جس میں اُن سے اُن کے زیرِ قبضہ قلعہ گجرات میں بارود کے وزن اور مقدار کی دریافت کی گئی تھی نیز اس میں سے بے کار اور کارآمد بارود کے بارہ میں تخمینہ اور جس مقدار میں جدید بارود قلعہ میں رکھا جانا ضروری تھا کی نسبت استفسار کیا گیا۔

میاں رسول بخش کو قلعہ گجرات سے ملحق چند مکانات بھی مہاراجہ کے ایما اور حکم سے دیئے گئے جہاں وہ اور اُن کے دیگر افراد کنبہ مقیم تھے۔ یُوں وہ مستقلاً اپنے اصل مقامِ ہجرت میں واپس پہنچ گئے۔ میاں محمد اعظم کے چھوٹے فرزند میاں نور دتاں اُسی دوران میں مہاراج کی گھوڑ سواری کے شوق کے پیشِ نظر اپنے لیے ایک مختلف میدانِ کارکردگی انتخاب کر چکے تھے۔ اُنہوں نے لاہور کے مشہور چابکسوار خاندان کے بزرگوں سے شرفِ تلمذ اختیار کرتے ہوئے شاہسواری کے اسرار و رموز سیکھے اور اس میں پوری لگن سے گھوڑسواری کے ماہر بننے کے لیے سخت محنت سے کام لیا۔ اُن کے اس شوق کا محرک مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اُس کے ولی عہد کھڑک سنگھ کی اعلیٰ نسل کے گھوڑوں سے انتہائی دلبستگی اور شاہسواروں کی قدردانی تھی۔ اُس زمانہ میں لاہور کا شاہی اصطبل منفرد اور برصغیر میں مشہور تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے مفتوحہ علاقوں سے اچھی نسل کے گھوڑے اکٹھا کرتے تھے اور ہر قیمت پر ایسے جانور ہتھیانے میں خود غرضی کی حد تک بدنام تھے جس کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکتی ہے[1]۔

اپریل ۱۸۱۰ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تسخیرِ ملتان کے لیے لشکرِ جرار

---

[1] پنجاب سیریز جلد دوئم سکھوں کا پنجاب میں عروج از مسٹر ہنری۔ ٹی۔ پرنسپ صفحہ نمبر ۸۴

میاں رسول بخش کاردار بارود خانہ گجرات

دریافت کردنی این امر از بس ضروری است کہ
بارودیکہ بہ قبضہ شما در بارود خانہ گجرات تا حال
اندوختہ است در مقدار و وزن تا [illegible]
تحریر باید کرد کہ از چند مدت بارود بیکار اندوختہ است
معلوم شدہ است کہ از عرصہ مدید جدید بارود باہم
نرسانیدہ است در بارود [illegible]
بارود موجود شدنی ضروری است تعمیل این حکم
بزودی باید کرد تحریر بتاریخ ۱۳ ماہ اسوج سمت ۱۸۸۸

بزبان فارسی حکمنامہ بنام میاں رسول بخش کاردار بارود خانہ گجرات
۱۳ اسوج سمت ۱۸۸۸

کے ساتھ اُدھر کا رُخ کیا۔ چنانچہ ملتان کا حکمران نواب مظفر خان قلعہ بند ہو گیا۔ سکھ لشکر بھی قلعہ کے محاصرہ میں ڈٹ گیا۔ اس آفتِ ناگہانی سے چھٹکارا پانے کے لیے نواب مظفر خان نے صلح کر لی اور مبلغ ۸۰ ہزار روپے نقد اور ۵ اعلیٰ نسل کے گھوڑے بطور تاوانِ جنگ ادا کیے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہاتھی پر سوار واپسی کے قصد میں تھے کہ ملتان کا ایک زمیندار اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار تعظیم بجا لانے کو آگے بڑھا۔ مہاراجہ کی نگاہ اس کے خوبصورت گھوڑے پر پڑی اور اُس کے مصاحبوں نے کمال درشتی سے زمیندار کو اپنا جانور مہاراجہ کو پیش کر دینے کے لیے حکم دیا۔ اس پر زمیندار کو غصہ آ گیا اور اُس نے اپنی تلوار سونت کر مہاراجہ کے ہاتھی پر اوچھے ترچھے وار بھی کیے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر سکھ سورماؤں نے زمیندار کو گھیرے میں لے کر شدید زخمی کرنے کے بعد گولی مار کر ہلاک کر دیا اور یوں اُس کے اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر تصرّف کر لیا گیا۔

اپریل ۱۸۲۰ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر میں فوج کشی سے واپسی پر نوابؒ حفیظ احمد خاں آف مانسہرہ (MANSERA) کا نہایت ہی خوبصورت گھوڑا "سفید پری" جبراً حاصل کر کے اپنے شاہی اصطبل کی زینت بنا لیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا شوق اسپ خواہی اُس کی ایسی کمزوری تھی جس کو اُس دور کے انگریز حکمران بھی بخوبی بھانپ چکے تھے۔

---

ؒ پنجاب سیریز جلد دوئم سکھوں کا پنجاب میں عروج از مسٹر ہنری۔ ٹی پرنسپ صفحہ نمبر ۹۹

چنانچہ جب سال ۱۸۲۸ء میں بطور دوست مہاراجہ نے شاہِ برطانیہ کو لارڈ ایمرسیبٹ کی وساطت سے بیش قیمت شال کا خیمہ تحفہ کے طور پر ارسال کیا تو جواباً شاہِ برطانیہ[1] نے اپنے فرستادہ لفٹیننٹ برنر (LIEUT - BURNOR) کے ہاتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ایک درجن گاڑی میں جوتے جانے والے گھوڑے۔ چار اعلیٰ نسل کی گھوڑیاں اور نسل کشی کے لیے ایک عمدہ گھوڑا (STALLION) سال ۱۸۳۱ء میں کشتیوں کے ذریعہ دریائی راستوں سے دریائے راوی میں بھیج کر لاہور بھجوایا۔ تحائف کے اِس باہمی تبادلہ کے بعد تعلقات کی تجدید کی خاطر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گورنر جنرل[2] برطانوی ہند سرجان میلکم سے بمقام روپڑ ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو ملاقات کی۔ جس کے نتیجہ میں گورنر جنرل[3] مذکور نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نو پونڈ کی توپ جو گھوڑوں سے کھینچی جاتی تھی معہ اُس کے گھوڑوں کے پیش کی جو مہاراجہ نے انتہائی خوشی سے قبول کی۔

مہاراجہ رنجیت کے اشتیاق اسپ بانی اور اچھے جانور اکٹھا کرنے کا جنون دوسرے مذاہب کے جذبات کی اور شعار کی بےحرمتی سے بھی بے نیاز تھا۔ چنانچہ اس نے اسلامی شعار سے قطعی لاپرواہی برتتے ہوئے لاہور کی مشہور عالم شاہی مسجد کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل

---

[1] پنجاب سیریز جلد دوئم سکھوں کا پنجاب میں عروج از مسٹر ہنری۔ ٹی پرنسپ صفحہ نمبر ۱۳۰

[2] پنجاب سیریز جلد دوئم سکھوں کا پنجاب میں عروج از مسٹر ہنری۔ ٹی پرنسپ صفحہ نمبر ۱۳۰

[3] پنجاب سیریز جلد دوئم سکھوں کا پنجاب میں عروج از مسٹر ہنری۔ ٹی پرنسپ صفحہ نمبر ۱۳۱

Prem Dass
25-9-28

نقل النقل پروانہ واگزاری ارضی مشمولہ مسلمقدمہ ذیل منفصلہ بعدالت جناب سید ہادی حسین خان صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر

نمبر مقدمہ ۳۳ — تاریخ دائرہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۰ء — گوجرات

تاریخ فیصلہ ۵ دسمبر ۱۸۵۰ء

مسلمقدمہ تحقیقات معافی نور خان چابکسوار ساکن گوجرات

ایکدہینہ چاہ معہ سو بیگہہ زمین واقعہ موضع بانٹھ

دستخط حاکم بحروف انگریزی

مہر بحروف گورمکھی — مہر سالار گلاب سنگھ

شجاعت پناہ تہور دستگاہ مسٹر ہارلن نصارہی مسرور باشند

یکدہینہ چاہ پیرووالہ در وجہ نور محمد چابکسوار سرکار والا از قدیم معاف و واگذار است لہذا ارشاد والا

[illegible]ان صادر می شود کہ بموجب پروانہ والا ایشان چاہ مذکور بدستور قدیمہ بمشارٌ الیہ واگذار دارند

[illegible] چاہ مذکور بدستور قدیمہ مقرالیہ قلت وقت نسازند و غور پرداخت مومی الیہ قرار واقعی دارند

اندرین باب تاکید مزید دانستہ انصاف والا را شامل خود دانند تحریر بتاریخ چہارم ماہ کتک سمت ۱۸۸۸

مہر ہارلن نصارہی

بموجب قرار قدیم معاف و واگذار است تحریر بتاریخ ۱۸ ماہ منگھر سمت ۱۸۸۸

شامل مسل رہے ۲۴ جولائی ۱۸۵۵ء

دستخط حاکم

فرمانِ شاہی چہارم ماہ کتک سمت ۱۸۸۸ بنام میاں نورو خاں

بنا لیا اور یوں خانۂ خدا کی بے حرمتی کر کے مسلمان رعایا کے قلوب کو مجروح کرتا رہا۔ وہ اپنے سواری کے مخصوص گھوڑوں پر سونے کی کاٹھی اور مرصع جھول ڈلوایا کرتا۔ وہ خود ایک اعلیٰ درجہ کا سوار تھا اور اچھے سواروں کی قدر کرتا تھا۔ تنومند اور خوبصورت نوجوان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے متعلق ہوں اپنے حضور ملازم رکھ لیا کرتا تھا۔

یہی وہ شواہد اور محرکات تھے جنہوں نے میاں نورو خان کو شاہسواری میں نام پیدا کرنے پر اکسایا۔ چنانچہ وہ اپنے زمانہ کے تمام درباری شاہسواروں پر گوئے سبقت لے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُن کے کمالِ فن کے عوض اُنہیں شاہی چابکسوار مقرر کیا اور مبلغ ۵/- روپے گزران ماہوار مقرر فرمائی۔ بعدہٗ سال ۱۸۳۲ء میں بذریعہ فرمانِ شاہی اُن کو اپنی خدماتِ جلیلہ کے عوض موضع بانٹھ تحصیل و ضلع گجرات میں شہر سے قریباً پون میل کے فاصلہ پر ۷۴ ایکڑ ۲ روڈ ۱۱ پول اراضی بہ معافی مالیہ مبلغ ۸۶/- روپے سال تمام مرحمت فرمائی گئی۔[1]

سال ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد اُس کا ولی عہد کنور کھڑک سنگھ سریر آرائے سلطنت ہوا لیکن گجرات پر سے انگریزوں کی لڑائی سال ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ سکھوں کا غیر مؤثر سا کنٹرول بھی جاتا رہا۔ کیونکہ اُن ایام میں سکھ مرکزیت رُو بہ انحطاط تھی۔ اُن کے دورِ حکومت میں بھی دونوں بھائیوں میاں رسول بخش کاردار بارود خانہ اور میاں نورو خاں شاہی چابکسوار کی توقیر بدستورِ سابق کی جاتی رہی۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ نے

---

[1] اندراج مثل نمبر ۱۴ زیر بند ۵ تحتی بند II معافی مالیہ اراضی دفتر مال ضلع گجرات۔

بروئے فرمان چہارم ماہ کتک سمت ۱۸۸۸ (سال ۱۸۴۲ء) سابقہ مرحمت شدہ اراضی بنام میاں نور خان بحال رکھی۔ اس فرمان کو مُہر سپہ سالار گلاب سنگھ اور مُہر پارنتی نصاری اور مہاراجہ کی گورمکھی مُہر کے ساتھ جاری کیا گیا۔ اس حکمنامہ کے ایک سال بعد ایک فرمان ۲۲ بھادوں سمت ۱۸۸۹ (سال ۱۸۴۳ء) میں جاری کیا جس میں صراحت کی گئی کہ شاہزادہ عالمیں کی طرف سے موضع بانٹھ میں جو چاہ معہ اراضی ۸۰ بیگھہ بطور بخشش اور ۲۰ بیگھہ اراضی بطریق انعام عطا کی گئی ہے اُس میں سے فصلِ ربیع سمت ۱۸۸۹ سے جو بھی آمدنی ہو اُسے فصل بہ فصل اور سال بسال میاں صاحب مذکور اپنے تصرف اور احتیاج میں لاسکیں گے۔ اس فرمانِ شاہی کا اجرا بھی مُہر سپہ سالار گلاب سنگھ مُہر کنہیا لال تعلقہ دار، مُہر پارلن نصاری اور مُہر بحروفِ ہندی سے کیا گیا۔ بعد ۲۳ مگھر سمت ۱۸۹ (سال ۱۸۴۲ء) کو ایک حکمنامہ کی رُو سے دجوکار پردازان لالہ کنہیا لال، مصر رام کشن، دیوی سہائے، رام سنگھ دھکہ سورا سنگھ کے نام جاری کیا گیا) تحریر ہوا کہ جو ایک چاہ واقع موضع بانٹھ تعلقہ گجرات قدیم ایام سے بوجہ مصاحبت نور محمد چابک سوار کو ملا اور شہزادہ بلند اقبال کنور کھڑک سنگھ جی نے اُسے واگذار رکھا اور مالیہ مبلغ ۴۰۰/- سے خارج رکھا گیا تھا جملہ جنوب سرکار معاف کر دیئے گئے۔ یہ فرمان بدستخطی سری امر سنگھ جی جو کہ "پروانگی حضور" تھے۔ مُہر بحروف گورمکھی اور مُہر گلاب سنگھ سپہ سالار کے ساتھ جاری ہوا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غلط فہمی یا کسی دوسری بنا پر ۱۸ اسوج سمت ۱۸۹ (سال ۱۸۴۵ء) کو ایک جدید فرمان بدیں مضمون اجرا کیا گیا کہ جو نیز شہزادہ کنور کھڑک سنگھ جی نے اپنی سابقہ نگارش کے تحت میاں نور خان

Prem Daas
25-9-28

نقل النقل پروانہ واگذاری اراضی متعلقہ مسلمقدمہ ذیل منفصلہ بعدالت جناب سید مہدی حسین خان صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر

نمبر مقدمہ ۳۳ | تاریخ دائرہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۰ء | گوجرات

تاریخ فیصلہ ۵ دسمبر ۱۸۵۰ء

مسلمقدمہ تحقیقات معافی نور خان چابکسوار ساکن گوجرات

ایک بند چاہ معہ سو بیگہہ زمین واقعہ موضع بانٹھ

(مہر) دستخط حاکم بحروف انگریزی

کارداران حال و استقبال پرگنہ گوجرات بدانند

دریں ولا حکم حضور صادر میگردد کہ آنچہ چاہ معہ موازی ہشتاد بیگہہ زمین از موضع بانٹھ شاہزادۂ عالمین

در وجہ نور خان چابکسوار بخشیدہ و عطا فرمودہ بودند و موازی بیست بیگہہ از موضع مذکور دیگر بطریق انعام

در وجہ مشارالیہ ابتدائی فصل ربیع سمت ۱۸۸۹ مرحمت فرمودہ شد کہ آنچہ حاصلات آنجائے بودہ باشند

فصل بفصل سال بسال بصرف بانجاح خود آوردہ باشند اندریں باب تاکید اکید انگاشتہ حسب المسطور بعمل آرند تحریر ۲۲ بہادوں سمت ۱۸۸۹

(مہر کنہیا لعل) (مہر نارین تعالی) (مہر بحروف ہندی)

شامل مثل رہی ۲۴ جولائی ۱۸۵۰ء

دستخط حاکم

[illegible]

فرمانِ شاہی مجریہ ۲۲ بہادوں سمت ۱۸۸۹ بنام میاں نور خان

نقل النقل پروانہ واگذاری اراضی مشمولہ مسل مقدمہ ذیل منفصلہ بعدالت جناب سید احمد حسین خان صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر

نمبر مقدمہ ۳۳ — تاریخ دائرہ ۲۴ جولائی ۱۸۵۰ء — گوجرات

تاریخ فیصلہ ۵ دسمبر ۱۸۵۰ء

مسل مقدمہ تحقیقات معافی نور خان چابکسوار ساکن گوجرات

ایک ہٹہ چاہ معہ سو بیگہ زمین واقعہ موضع بانہٹہ

بفضل سری اکال پورکھ جی

ارادت نشان لالہ کنہیا لعل و مصر رام کشن و دیوی سہائے و رام سنگہ و محکمہ سوبا ہنگہ مسرور باشند

آنچہ یکدہٹہ چاہ از موضع بانہٹہ تعلقہ گوجرات مقرر از قدیم در وجہ معتمدی نور محمد چابک سوار

از شہزادہ بلند اقبال کنور کھڑک سنگہ جی واگذاشتہ است واز جمع سرکار خارج باید کہ بدستور سابق

واگذارند و خلش نکنند تاکید است حسب المسطور بموجب مہر و نشانی × بعمل آرند تحریر بتاریخ ۱۳ مگھر سمت ۱۸۹۰

دستخط سری امر سنگہ جی

پروانگی حضور

مطلع شد — اطلاع یافت — اطلاع شد — دستخط ہندی

دستخط صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر

شامل مثل رہی ۲۴ جولائی ۱۸۵۰

فرمانِ شاہی مجریہ ۱۳ مگھر سمت ۱۸۹۰ بنام میاں نور و خان

کو واگذار کیا تھا اب اُسے ہر دو برادران میاں رسول بخش اور میاں نور دخان کے مابین بحصہ برابر تقسیم کردیا جاوے۔ اور یہ کہ میاں رسول بخش کو یہ نصف حصہ اراضی بطورِ خدمت بارود خانہ مرحمت کیا جاتا ہے۔ چونکہ اراضی ابتداً مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے صرف میاں نور دخان ہی کو ملی تھی اور کنور کھڑک سنگھ نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے عہد میں صرف اُس کی واگذاری اور تجدید کے احکام دیئے تھے۔ اس لیے میاں نور دخان نے اس بارہ میں دعویٰ دیوانی برخلاف اجرائے حکمنامہ بجانب کنور کھڑک سنگھ مورخہ ۱۸ اسوج سمت ۱۸۹۱ (سال ۱۸۴۵ء) دائر کردیا۔ اور اس میں یہ موقف اختیار کیا کہ اراضی متدعویہ ابتداً مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بعوض خدمت صرف اُنہیں ہی مرحمت کی تھی اور جس صورت میں کنور کھڑک سنگھ خود بھی سمت ۱۹۰۰ (سال ۱۸۴۳ء) میں اُسی سابقہ جاگیر کی بحالی کا حکم اُن کے حق میں صادر کر چکے تھے بعدۂ وہ اصل حکم میں تصرف نہیں کرسکتے تھے ہاں اگر وہ اپنے باپ کے حکمنامہ کو بطورِ جدید حکمران منسوخ کر دیتے اور پھر کسی دوسرے کے اشتراک سے از سرِ نو اپنی طرف سے یہ جاگیر انعام میں بعوض خدمت کسی کو منفرداً یا مشترکہ عطا فرماتے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ چنانچہ یہ دعویٰ مقدمہ نمبر ۳۳ کی صورت میں انگریزی عملداری کے دوران سید عادل حسین ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گجرات کی عدالت میں ۲۲ جولائی ۱۸۵۰ء کو دائر کیا گیا۔ جنہوں نے فریقین کی شہادت اور سابقہ شاہی ریکارڈ کے ملاحظہ کے بعد اپنے فیصلہ مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۰ء کی رُو سے اراضی متدعویہ بدستور سابق میاں نور دخان ہی کے نام بحال رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ اور یوں یہ وجہ تنازع درمیان ہر دو

برادران بطریقِ احسن اختتام پذیر ہوئی۔ اس معمولی سی تلخی کے باوجود دونوں بھائیوں میاں رسول بخش اور میاں نور دخان کے روابط و باہمی مراسم نہایت معتدل اور خوشگوار رہے۔ جس کی مثال میاں رسول بخش کی اکلوتی دُختر کی میاں نبی بخش پسر میاں نور دخان سے شادی سے دی جا سکتی ہے جو اس مقدمہ کے بعد عمل میں آئی اور جو خاندانِ منگرال راجپوت گجرات کی ایک نہایت ہی کامیاب اور مثالی شادی مانی جاتی ہے۔

انگریزوں کی آئے دن کی ریشہ دوانیوں اور سکھ دربار میں غیر یقینی حالات کے پیشِ نظر میاں نور دخان سال ۱۸۴۵ء کے دوران ہی گجرات چلے آئے تھے۔ علاوہ آمدنی اراضی جاگیر سکھ دربار سے مبلغ -/۵۰ روپے ماہانہ پنشن سے وہ اپنی اور اہلِ خاندان کی پرورش کرتے رہے اور دن گزارتے گئے۔

میاں رسول بخش بھی اپنے لڑکوں اور اہلِ خاندان کے ہمراہ گذربسر کرتے رہے اور اس طرح کُنبہ کے سب افراد محلہ چابکسواراں میں مقیم ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساجھی بن کر وقت گزارتے رہتے تا آنکہ میاں رسول بخش کا انتقال ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے پیچھے دو ازدواج سے ذکور میں سے چار فرزند میاں امیر بخش۔ میاں نذیر بخش۔ میاں مُراد علی اور میاں حسین بخش اور اناث سے واحد دُختر جس کی شادی میاں نبی بخش سے ہو چکی تھی چھوڑے۔

میاں نورُ دخان بھی اپنے بھائی کے کچھ عرصہ بعد ۲۹ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ اُن کی جاگیر واقعہ موضع بانٹھ سکھ عملداری کے بعد سرکارِ انگلشیہ کی طرف سے بھی بروئے فرمان چیف کمشنر پنجاب

مجریہ مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۵۵ء اُن کی زندگی میں ہی واگزار رکھی گئی تھی۔
اب اُن کی دفات پر ڈپٹی کمشنر گجرات کرنل جے۔ پرسن نے اپنی رپورٹ
مورخہ ۱۷ جنوری ۱۸۷۰ء میں بحالی جاگیر بحق پسرانش کے سلسلہ میں یوں
رقم کیا:-

"میاں نورد خان نے اپنی جاگیر میں ایک کنواں احداث کر دیا۔ درخت
لگوائے۔ مسجد تعمیر کرائی۔ علاوہ ازیں ایک دارہ مسافروں کے آرام کی خاطر
تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ وہ گھوڑوں کے وسیع علم اور سواری کی مہارت
کی بنا پر سرکارِ انگریزی کے لیے مفید ثابت ہوتے تھے اور اب
جبکہ اُن کی اولاد جو ایک معزز اور شریف خاندان کے افراد میاں
الٰہی بخش۔ میاں محمد بخش۔ میاں نبی بخش اور میاں گیلانی بخش پر مشتمل
ہے اپنے والد کے سایۂ عاطفت کے علاوہ اُن کی ماہوار پنشن مبلغ
۵۰ روپیہ سکہ رائج الوقت سے بھی محروم ہو چکی ہے اس مقرب و
معزز خاندان کے افراد کی پرورش اور گزران کے لیے رقبہ جاگیر
مرحمت شدہ سکھ سرکار اور بحال کردہ بحق میاں نورد خان مرحوم اُن
کی اولاد ذکور مذکورہ بالا کے نام پر منتقل اور بحال رکھا جاوے۔ اس
رپورٹ پر کمشنر صاحب راولپنڈی کی سفارش اور فنانشل کمشنر کی تائید
مزید مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۷۰ء کے بعد لفٹیننٹ گورنر صاحب صوبہ پنجاب
نے اپنے حکم مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۷۰ء کی رُو سے اراضی واقعہ موضع بانٹھ
تحصیل گجرات ربہ معافی مالیہ و دیگر حقوق سرکار تا حیات خورد ترین

---

ل؎ اندراج مثل نمبر ۱۱ زیر مد ۵ تحتی مد II مالیہ اراضی دفتر مال گجرات۔

پسر دمیاں گیلانی بخش ) ہر چہار پسران میاں نور دخان کو مستقلاً بحال کردی اور یوں یہ اراضی بطور مالکان قبضہ اس کنبہ کے قبضہ اور تصرف میں نسلاً بعد نسلاً چلی آرہی ہے۔

میاں نور دخان نہایت وجیہہ۔ تنومند۔ بارعب۔ صاحبِ کردار اور انتظامی امور میں ماہر ہونے کے علاوہ مانے ہوتے شاہسوار بھی تھے۔ اُنہوں نے کمال خودداری اور وقار سے ملازمتِ سرکار سرانجام دی اور اپنے کُنبہ کی احسن طریقہ سے پرورش اور کفالت کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوئے وہ دین دار بزرگ تھے اور اُن کی اولاد میں سے اُن کے پسرِ اکبر میاں الٰہی بخش ملازمتِ سرکار کے ساتھ ساتھ دینی مشاغل میں انتہائی تندہی سے مصروف رہے جن کا مفصّل احوال اپنی جگہ پر آتے گا۔ میاں رسول بخش بھی حُسنِ سیرت۔ مروّت۔ رواداری۔ شجاعت اور انتظامی استعداد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ہر دو برادران نے اپنے نامور والد میاں محمد اعظم کی اعلیٰ اقدار کو قائم رکھا اور اپنے فرزندان اور ورثار کے لیے وہ اعلیٰ نقوش چھوڑے جو واضح لائحہ عمل کے تعین میں کسی دور میں بھی راہنما اصولوں کے طور پر اختیار کرنے سے کامیاب زندگی کے امین ثابت ہو سکتے تھے ؎

خُدا رحمت کُند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک انگریز مفکر نے اس سلسلہ میں کیا ہی خوب فرمایا ہے :-

"LIVES OF GREAT MEN ALL REMIND US

WE SHOULD MAKE OUR LIFE SUBLIME"

---

باب ہشتم

# میاں کمال دین کے فرزند میاں عبدالوہاب اور اُن کے ورثاء

رائے عبدالحکیم کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں کمال الدین تھے۔ وہ ہجرت کے وقت نوجوان، تنومند، خوش وضع اور عنفوانِ شباب کی رعنائیوں کے حامل تھے۔ سکھ عملداری میں نئی جائے سکونت پر روزی کمانے کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ضعیف والد اور اہلِ کنبہ کی گزر اوقات کے لیے اُنہوں نے ہوش سنبھالتے ہی ہاتھ پیر مارنے شروع کیے اور جلد ہی وہ بطور سپاہی سکھ فوج میں لے لیے گئے۔ اُسی دوران اُن کی شادی ہوگئی اور اُن کے ہاں واحد پسر میاں عبدالوہاب تولد ہوئے۔ اُس زمانہ میں گجرات میں حصولِ تعلیم کی جد و جہد مسجدوں اور خانقاہوں میں صرف مذہبی علوم تک محدود تھی۔ یا نسبتاً زیادہ علم دوست خانوادوں میں گلستان و بوستان، تصانیفِ سعدی شیرازی کی تدریس کا دور دورہ تھا جو پرائیوٹ طور پر بچوں کو پڑھائی جاتی تھیں۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ میاں عبدالوہاب نے معمولی مذہبی تعلیم کے بعد بطور گماشتہ سرکار ملازمت کرلی۔ اور اپنی زندگی میں باعزت گزران کی راہ نکالی۔ وہ طبعاً کم گو، محنتی اور سادہ طبع

آدمی تھے ۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے خوش وضع اور منکسر مزاج انسان تھے۔

میاں عبدالوہاب کی شادی اپنے والد میاں کمال الدین کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی ۔ اُن کے ہاں واحد پسر میاں نظام دین پیدا ہوئے تھے ۔ میاں کمال الدین اور میاں عبدالوہاب کی تاریخ وفات کے بارہ میں معلومات مفقود ہیں ۔ میاں نظام دین نے بھی ابتدائی دینی تعلیم اور محدود فارسی تدریس کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور سپاہی محکمہ پولیس کیا ۔ اور اپنی محنت حسن کارکردگی ۔ شجاعت ۔ فرائضِ منصبی کی بطریقِ احسن سرانجام دہی سے وہ بطور حوالدار ترقی یاب ہوئے ۔ اُس زمانہ میں ایسے عہدہ پاتے پر خاندانی نجابت کی پرکھ پرکی جاتی تھی ۔ میاں نظام دین صُلح جو ۔ دیندار اور صاحب فراست بزرگ تھے ۔ روایت ہے کہ وہ اپنا اکثر وقت یادِ الٰہی میں مساجد میں گزارتے ۔ حتیٰ کہ اکثر اوقات اُن کو سپاہی لوگ مساجد سے تلاش کر کے تحقیقات جرائم کے لیے ہمراہ لے جاتے ۔ اُن کی وفات انگریزی عملداری میں ۱۸ر نومبر ۱۸۹۷ء کو ہوئی ۔ اُن کے ہاں تین فرزند میاں محمد الدین ۔ میاں قمرالدین اور میاں فضل الدین تولد ہوئے اُن کی واحد صاحبزادی ، میاں فیروز دین پٹواری سے شادی شدہ تھیں جن سے میاں ظہور الدین تولد ہوئے ۔ میاں قمرالدین قوی الجثہ نوجوان تھے ۔ وہ عالم شباب میں ۱۲ر مارچ ۱۹۱۹ء کو ہی اللہ کو پیارے ہوگئے جبکہ اُن کے چھوٹے بھائی میاں فضل الدین بچپنے میں ہی فوت ہوگئے تھے ۔ میاں نظام دین کا سلسلہِ ذکور داناث اُن کے پسر بزرگ میاں محمد الدین ہی سے چلا ۔

میاں محمد الدین نے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات میں بطور کلرک کے کیا۔ بعدۂ وہ تحصیلدار گجرات کے محرر جوڈیشل تعینات ہوئے۔ اپنی ملازمت کے آخری چند سال بطور پیشی محرر ڈپٹی کمشنر متعین رہے۔ وہ اپنے وقت کے انتہائی ذہین۔ محنتی۔ قانون دان۔ منتظم اور فرض شناس اہلکار شمار ہوتے تھے۔ وہ دراز قد۔ بیباک اور جابر قسم کے سپوت قوم تھے۔ شہر میں انہیں فراتی اثر و رسوخ کے علاوہ مہم جوئی کی وجہ سے ایک ممتاز شہری مانا جاتا تھا وہ خوش پوش۔ خوش وضع اور بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ حسن کارکردگی اور خدمت سرکار کی اعلیٰ استعداد کی بنا پر انہیں ایک میڈل اور ایک دوسرے موقعہ پر ایک نقرئی جیبی گھڑی ڈپٹی کمشنر گجرات کی طرف سے بطور انعام مرحمت ہوئی۔ وہ سماجی امور میں بھی پورے انہماک سے حصہ لیتے تھے اور انجمن خدام الاسلام گجرات کے جنرل سیکرٹری تھے جس کے زیر انتظام اسلامیہ مڈل سکول برائے طلبا چلایا جا رہا تھا۔ وہ اس سکول کی مجلس منتظمہ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ اپنی مجاہدانہ کشمکش حیات سے پُر زندگی گزارنے کے بعد وہ ۸ اگست ۱۹۳۵ء کو اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔

میاں محمد الدین کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں محمد نواز مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۹۹ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے والد کی طرح میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات میں بطور محرر جوڈیشل کیا۔ اپنی گرم مزاجی اور افتادِ طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملازمت سرکار سے استعفیٰ دے دیا۔ اور جوانسالی میں

ہی وکلا کی منشی گیری اختیار کر لی۔ اس میں وہ غایت درجہ کامیاب رہے یہ کام انہوں نے کم و بیش ۵۰ سال تک کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ انجمن منشیانِ وکلا گجرات کے صدر منتخب ہو گئے اور اسی حیثیت میں سال ۱۹۷۴ء تک رہے۔ تاآنکہ بوجہ کبر سنی منشی گیری کو خیرباد کہا۔ باوجود پیرانہ سالی میاں محمد نواز اہلِ خاندان کے دکھ سکھ میں رضاکارانہ شامل ہوتے ہیں۔ وہ صاف گو اور بیباک قسم کے فرد ہیں۔ انہوں نے دو شادیاں کیں لیکن تاحال کسی زوجہ سے انکی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ آج کل وہ انجمنِ امامیہ گجرات کے مشیرِ اعلیٰ ہیں۔

میاں محمد الدین کے فرزندِ ثانی میاں محمد ریاض تھے۔ جو ۲۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہو گئے۔ اپنی محنت و لگن سے ترقی یاب ہو کر صوبیدار کے عہدہ تک پہنچ گئے لیکن طبیعت میں سرکشی اور تیزی کی وجہ سے اس میدان کے لیے موزوں نہ پاتے گئے اور مجبوراً ملازمت چھوڑ کر آزاد زندگی گزارنے کے لیے گھر چلے آئے۔ کچھ عرصہ بعد گجرات پنجاب بس سروس کے اڈا جہلم میں بطور جنرل مینجر متعین ہوئے۔ چند سال بعد اسی بس سروس کے اڈہ کراچی میں مینجر لگائے گئے۔ وہاں پر اوائل سال ۱۹۶۷ء تک کام کرتے رہے۔ ماہِ محرم کے آغاز میں رخصت پر گجرات آئے کہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر ۱۰ مارچ ۱۹۶۷ء کو بعمر ۴۸½ سال داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہ ذوقِ لطیف کے حامل۔ بیمائی اوصاف سے متصف متواضع اور نڈر فردِ قوم تھے۔ جلال و جمال کے پیکر تھے۔ شیعہ مجالس میں بطور ذاکر شمولیت کرتے۔ خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ گھر اور باہر ہر دو

جگہ رعب داب سے رہتے تھے۔ اُنہوں نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ سے کوئی اولادِ نرینہ نہیں رہی۔ جبکہ اُن کی دوسری بیوی سے دو پسران میاں عابد ریاض اور میاں ساجد ریاض کے علاوہ پانچ دختران بھی تولّد ہوئیں۔ میاں محمد الدین کا سلسلۂ ذکور انہی سے آگے چلا ہے۔

میاں محمد الدین کے اس فرزند کے بڑے صاحبزادے میاں عابد ریاض نے جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو تولّد ہوتے تھے سال ۱۹۷۲ء میں میٹرک پاس کیا اور اسی سال اپنے صاحبِ فراش والد کی فوتیدگی کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ چونکہ اس بڑے کنبہ کی دستگیری کرنے والا اور کوئی نہ تھا اس لیے وہ قسمت آزمائی کے لیے ملک سے باہر کویت چلے گئے۔ وہ آج کل وہاں کسی بیرونی فرم میں بطور سپروائزر کام کر رہے ہیں اور بجا طور پر اپنی بیوہ ماں اور دیگر افرادِ کنبہ کا عزیز ترین سرمایہ اور سہارا ہیں۔ وہ خوش شکل، خوش اطوار اور محنتی نوجوان ہیں اور اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھنے والے فردِ قوم ہیں۔ ابھی تک اُن کی شادی نہیں ہوئی ہے۔

میاں محمد ریاض کے چھوٹے فرزند میاں ساجد ریاض ۱۷ جنوری ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے اور ۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو ماں کی گود خالی کر گئے ؏

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

میاں محمد الدین کے تیسرے لڑکے میاں محمد نشاط ۱۷ جولائی ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کی طرف شروع سے ہی رجحان نہ ہونے کی وجہ سے والد کے اصرار کے باوجود مڈل سے زیادہ نہ بڑھ سکے۔ کھیل کود

مارکٹائی - پنجہ آزمائی اور اپنی برتری کو منوانے کی لگن بچپن سے جوانی تک اُن کا طغرۂ امتیاز رہی - اُن کی اُفتادِ طبیعت اور سرکشی کی وجہ سے اکثر اوقات میاں محمد الدین کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا لیکن وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اس لاڈلے بیٹے کی مضبوط ڈھال ثابت ہوتے - اپنے گرامی قدر اور بارسوخ باپ کی وفات کے بعد بھی کچھ سال میاں محمد نشاط نے اپنی دیرینہ سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے صحیح معنوں میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے برف کی ایجنسی اور خرید و فروخت کا مرکز قائم کیا اور اس طرح باعزت گھریلو زندگی کا آغاز کیا - بعد میں میسرز شاہ اینڈ کمپنی گجرات کی جائیداد کے مختار ہو گئے اور تادمِ مرگ یہی خدمت سرانجام دیتے رہے - جواں سالی میں ہی انہوں نے اپنی پسند کی شادی کی - لیکن اُن کی اولادِ نرینہ نہ ہوئی - انہوں نے بھرپور اور رنگ و دو میں گم زندگی گزار کر ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو رحلت فرمائی -

میاں محمد الدین کے خورد ترین فرزند میاں محمد جواد ۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے - انہوں نے بھی میٹرک تک تعلیم حاصل کی - اور ملازمت کا آغاز فوج میں بطور مکینک کیا - اپنی بے پروا اور سہل انگار طبیعت کی وجہ سے زیادہ عرصہ فوجی زندگی کی تلخیوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے اور گھر چلے آئے - سب سے پہلے ٹرک سروس میں بطور موٹر ڈرائیور کام کرنے لگے - لیکن پھر گجرات میں قومی گڈز ایجنسی سے منسلک ہو گئے - کچھ سال گجرات میں کام کرنے کے بعد لاہور میں متعدد گڈز ایجنسیوں میں بطور پارٹنر کام کرتے رہے - آخر گجرات لوٹ آئے اور آج کل

قیوم گارڈز ایجنسی میں علاوہ یومیہ کمیشن ماہوار مشاہرہ پر بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ طبیعت کی اُفتاد اُنھوں نے بھی ورثہ میں پائی ہے۔ تاہم وہ سادگی شعار۔ سادہ لوح اور مرنجاں مرنج انسان ہیں غایت درجہ پُرسکون زندگی گذار رہے ہیں۔ اُنہوں نے دو شادیاں یکے بعد دیگرے کی تھیں۔ پہلی زوجہ سے ایک صاحبزادی تولد ہوئی۔ لیکن باہمی ناچاقی کی وجہ سے یہ شادی طلاق پر منتج ہوئی۔ چنانچہ وہ بچی بھی ماں کے ساتھ ہی ننھیال چلی گئی۔ اُن کی زوجہ ثانی سے تاحال کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔

---

باب نہم

# میاں محمدؐ اعظم کے فرزند میاں رسول بخش اور اُن کے ورثاء

رائے عبدالحکیم کے دوسرے صاحبزادے میاں محمدؐ اعظم تھے۔ جن کی نسبت مفصّل کوائف باب ششم میں مذکور ہیں۔ اُنکے ہر دو پسران میاں رسول بخش اور میاں نور دخان کے بارہ میں بھی سیر حاصل تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ہم میاں رسول بخش کے ورثاء کے بارہ میں حقائق کی نقاب کشائی کریں گے۔ میاں رسول بخش نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں۔ اُن کی پہلی زوجہ سے صرف ایک فرزند میاں امیر بخش پیدا ہوئے اور اس کے چند سال بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ اُنہوں نے دوسری شادی کی۔ جس سے اُن کے ہاں تین فرزند میاں وزیر بخش۔ میاں مراد علی۔ میاں حسین بخش اور ایک دُختر تولّد ہوئے ۹ میاں امیر بخش نے دو شادیاں کیں۔ اُن کی پہلی زوجہ سے میاں فیروز دین پیدا ہوئے جبکہ اُنکی دوسری زوجہ سے صرف ایک دُختر تھی جو ابھی تک ضعیف العمری میں زندہ موجود ہیں۔ میاں فیروز دین نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور پٹواری کیا۔ اُن کی شادی میاں نظام دین کی دختر سے ہوئی جن سے اُن کے واحد پسر میاں ظہورالدین سال ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ میاں ظہورالدین اپنے والدین کے اکلوتے پسر ہونے کی بناء پر بہت ہی لاڈلے تھے۔ اُنہوں

نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ وہ تنومند اور بارُعب سرو قامت نوجوان
تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں ملک عراق میں تشریف لے گئے۔ بعدہٗ
وہ ملک برہما میں منتقل ہوئے جہاں گیارہ سال تک ٹھیکیداری محکمہ
پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں کی یہاں اُن کے واحد پسر میاں عبدالعزیز ان کی اہلیہ
اور بہو ان کے ہمراہ تھے۔ یہیں سے وہ واپس گجرات سال سنہ ۱۹۴۰ء
میں چلے آئے جہاں انہوں نے منشیات کا لائسنس حاصل کیا اور تین
سال تک منشیات کا ٹھیکہ چلاتے رہے۔ اور بعدہٗ ۱۴ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء
کو واصل بحق ہوئے۔ میاں ظہورالدین ہمہ گیر خوبیوں کے مالک تھے۔

میاں ظہورالدین کے پسر میاں عبدالعزیز ۵ مئی سنہ ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔
انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اُن کی پہلی شادی ساہووالہ ضلع
سیالکوٹ میں اُن کے ماموں کی لڑکی سے ہوئی۔ لیکن بعد میں یہ شادی
طلاق پر منتج ہوئی۔ دوبارہ اُنہوں نے ایک بیوہ سے لاہور میں شادی
رچائی لیکن اُس سے بھی نباہ کی صورت پیدا نہ ہو سکی چنانچہ اُس کو بھی
طلاق ہو گئی۔ تیسری شادی اپنے قیام برہما کے دوران اُنہوں نے ملک
برہما کی ایک دوشیزہ سے کی۔ اُن کی زوجہ اوّل اور زوجہ سوئم سے
علی الترتیب ایک ایک فرزند تولد ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا فرزند
اوّل ولادت کے فوراً بعد فوت ہو گیا۔ اور دوسری زوجہ سے فرزند
ثانی بھی پیدائش کے چند دن کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔ میاں عبدالعزیز
نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سال سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے دوران عراق
بصرہ میں ہائی کمشنر ہند ملک عراق کے زیر کنٹرول محکمہ سپلائی اینڈ
ٹرانسپورٹ کے ہیڈ کلرک کی حیثیت سے کیا۔ یہیں پر وہ ترقی یاب ہو کر

سال ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء میں ہیڈ ٹائمپسٹ ہو گئے۔ یہاں سے فراغت کے بعد سال ۱۹۲۹ء میں وہ اپنے والد اور دیگر افرادِ کنبہ کے ہمراہ ملک برہما میں چلے گئے۔ جہاں دونوں نے باہمی اشتراک سے ٹھیکیداری محکمہ پی۔ڈبلیو۔ڈی میں کی۔ وہاں سے سال ۱۹۳۶ء میں واپس گجرات آئے، اور پھر جلد ہی اینگلو ایرانین کمپنی میں بطور چیف کلرک فائنڈ ڈیپارٹمنٹ بھرتی ہو کر ایران چلے گئے۔ یہاں وہ چھ سال تک مقیم رہے۔ وہاں سے واپسی پر سال ۱۹۶۰ء میں وہ بطور کنسٹرکشن سپروائزر یونائیٹڈ سٹیم شپنگ کمپنی ڈھاکہ CONSTRUCTION

SUPERVISOR UNITED STEAM SHIPPING COMPANY.

مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) سے منسلک ہو گئے جہاں وہ دو سال تک کام کرتے رہے۔ سال ۱۹۶۲ء کے اختتام پر وہ وطن واپس تشریف لے آئے اور اپنے جدّی گھر واقعہ محلہ چابکسواراں گجرات میں اقامت گزین ہوئے۔ سال ۱۹۶۳ء میں وہ بطور مینیجر خالق انڈسٹریز رجسٹرڈ نظام آباد (وزیر آباد) مقرر ہوئے۔ یہاں انہوں نے دو سال کام کیا۔ یہاں سے وہ سٹین لیس کٹلری ورکس نظام آباد میں بطور مینیجر چلے گئے جہاں انہوں نے چھ سال تک خدمات سرانجام دیں۔ آج کل وہ سٹار لائٹ سٹین لیس کٹلری سٹیل انڈسٹریز گوجرانوالہ کے مینیجر درآمد و برآمدات ہیں۔ میاں عبدالعزیز ایک خوش معاملہ، صُلح جو، ہمدرد، شریف النفس اور مرنجاں مرنج فردِ قوم ہیں۔ گوجرانوالہ سے قریباً ہر ہفتہ اپنی رہائش گاہ پر گجرات تشریف لاتے ہیں اور نجی مجالس برپا کرتے ہیں۔

میاں رسول بخش کی زوجہ ثانی سے پہلے اور میاں رسول بخش کے دوسرے

صاحبزادے میاں وزیر بخش تھے۔ ابتدائی تعلیم مڈل تک تھی۔ پہلے پٹواری بنے اور بعدہٗ ضلع کچہری گجرات میں کلرک بنائے گئے اپنے فرائض منصبی پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ اپنے والد کیطرح خوبرو۔ تنومند اور خلیق ہونے کے علاوہ شریف النفس انسان تھے۔ اپنے بیگانوں میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ دینی اُمور میں بھی سیدھے سادے مسلمان تھے۔ اپنے مال کی زکاۃ باقاعدگی اور اہتمام سے دیا کرتے تھے۔ غرباء اور مساکین کی عملی دلجوئی کیا کرتے تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہیں ہو سکی۔ میاں وزیر بخش کی شادی اپنے چچا میاں بوزر خان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین لڑکیوں کے چار صاحبزادے میاں ضیاء الدین۔ میاں محمد اشرف۔ میاں محمد اکبر اور میاں محمد رشید تولد ہوئے۔

میاں وزیر بخش کے سب سے بڑے لڑکے میاں ضیاء الدین تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھریلو امور میں دلچسپی لینا شروع کی۔ انکی شادی میاں الٰہی بخش کی خوبرو اور سلیقہ شعار دُختر نیک اختر سے ہوئی۔ لیکن خاندانی نزاع کی بناء پر میاں ضیاء الدین کی خوشگوار ازدواجی زندگی میں انقلاب آگیا اور والدہ کی فرمائش اور سختی سے مجبور کرنے پر انہوں نے باول ناخواستہ اپنی زوجہ اوّل کو طلاق دے دی۔ ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر انہوں نے گجرات کو چھوڑ دیا۔ کئی سال مختلف اضلاع پنجاب میں گھومتے پھرتے رہے اور اپنی قوت لایموت کے حصول میں زندگی گذارتے رہے۔ بالآخر اپنے بھائی میاں محمد اکبر کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ واپس گجرات آگئے اور موجودہ کٹہرہ شالبافاں میں ایک کشمیری گھرانے میں عقدِ ثانی کیا۔ جس سے ایک صاحبزادی تولد ہوئیں۔ جن کا بعدہٗ

نکاح میاں دوست محمد پسر میاں محمد اکبر سے ہوا۔ اپنی ادھیڑ عمر ہی میں میاں ضیاء الدین رحلت فرما گئے۔

میاں دریو بخش کے دوسرے پسر میاں محمد اشرف سال ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنیکے بعد اولاً وہ بطور کلرک دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات بھرتی ہوئے۔ بعد میں بطور ریڈر رہے۔ ڈی۔ ایم تعینات ہوئے۔ اپنی قانونی استعداد اور محنت کے علاوہ صاف گوئی اور مثالی کارکردگی کے بل بوتے پر ریڈر ڈپٹی کمشنر گجرات ہو گئے۔ سال ۱۹۳۶ء میں شاہ برطانیہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پر ہارس شو گراونڈ میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کے انتظام و انصرام میں ضلعی انتظامیہ کی امداد کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ وہ ضلعی انتظامیہ اور سماجی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ غلہ منڈی گجرات میں آتش زدگی کے دوران غیر معمولی خدمات سرانجام دینے اور عوام دوستی کا عملی مظاہرہ کرنے پر اوروں کے علاوہ اُنہیں بھی ایک جیبی گھڑی مسٹر سی کنگ ڈپٹی کمشنر گجرات کی طرف سے بطور انعام مرحمت کی گئی۔ اُنہیں ڈویژنل دربار کا کرسی نشین ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ دینی امور میں وہ غایت درجہ مشغول رہتے۔ وہ ہر نوجوان کے لئے دست بدعا تھے کہ ؎ خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وہ مسجد عید گاہ گجرات کی انتظامیہ کے سرگرم رکن ہونے کے علاوہ محلہ چابکسواراں کی خاندانی مسجد بازار صرافہ کے متولی تھے اور اس سے ملحقہ دوکان کے انتظام اور کرایہ کے حساب کتاب کے بھی وہی امین رہے۔ یہ مسجد اور اس سے ملحقہ دوکان اب بھی اُنہی کے کنبہ کی تولیت میں

میاں محمّد اشرف صاحب اپنے پوتے محمّد آفتاب اصغر اور نبیرہ محمّد صفدر کے ساتھ۔

چلی آرہی ہے۔ عید میلاد النبی کے موقعہ پر ہر سال وہ بڑے اہتمام سے غربا اور سکول کے بچوں کو دعوتِ طعام دیا کرتے اور سکول کے بچے مدحِ رسول بہ آوازِ بلند پڑھتے ہوئے عجیب سرور کے عالم میں اُن کی قیام گاہ پر طعام کے لیے حاضری دیتے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ محبتِ رسول سے سرشار۔ اپنے اہلِ کنبہ کے لیے سراپا خلوص و مروت بزرگ تھے۔ اُنہوں نے بھرپور اور جفاکش انسان کی صورت میں زندگی بسر کی اور سال ۱۹۴۸ء میں چھہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ اُن کی شادی سابق صدر پاکستان کے ملٹری سیکرٹری کرنل حمیداللہ اور جناب محمد سعید قریشی افسر مال کی حقیقی پھوپھی سے ہوئی جن کے بطن سے علاوہ دو دختران، پانچ فرزند میاں محمد اصغر، میاں محمد انور، میاں محمد ریاض، میاں محمد شفقت اور میاں محمد شجاع تولد ہوئے۔ ان میں سے صرف میاں محمد اصغر سے سلسلہ ذکور و اناث چلا۔ بقیہ جملہ فرزندان بچپنے میں ہی فوت ہو گئے۔

میاں محمد اشرف کے فرزندِ ارجمند میاں محمد اصغر کی ولادت فروری ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی اُنہوں نے تعلیم کو خیرباد کہا اور ضلع کچہری گجرات میں بطور نقل نویس اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اُس زمانہ میں "تحریکِ خلافت" کا زور تھا۔ نوجوان طبقہ میں سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا اور علی برادران کی مقناطیسی شخصیت سے نوجوانانِ قوم بخلوصِ قلب متاثر اور مرعوب تھے۔ چنانچہ میاں محمد اصغر نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جس کی بنا پر ضلعی انتظامیہ نے سرکاری ملازمت سے اُنہیں سبکدوش کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے فارسٹ کالج گھوڑا گلی ضلع راولپنڈی میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے فارغ التحصیل

ہونے کے بعد محکمہ جنگلات میں بطور فارسٹر دوبارہ ملازمتِ سرکار اختیار کی لیکن یہاں بھی اُن کی اُفتادِ طبیعت رنگ لائی اور ایک سکھ ڈی ایف او (ضلعی افسر جنگلات) سے مخاصمت کی بنا پر برطرف کر دیئے گئے۔

گھر پہ قیام کے چند سال بعد ایک پرائیویٹ فرم سپیڈنگ ڈنگا سنگھ اینڈ کو (جو کہ لکڑی کے سوداگران تھے) کے ہاں بھی ملازمت کرلی۔ اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں اُن کے معتمد کارندوں میں شمار ہونے لگے۔ غالباً اُن کا نظریۂ حیات تغیر پذیر کردار کا داعی تھا۔ اس لیے یہاں بھی اُنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ ؏

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

غالباً اُن کی اس اُفتادِ طبیعت کی سب سے اہم وجہ اُن کا یہ احساس تھا کہ وہ اپنے گھروالوں کی واحد متاعِ عزیز ہیں کیونکہ اُن کے علاوہ میاں محمد اشرف کے جملہ فرزندان فوت ہو چکے تھے۔ اب میاں محمد اصغر نے کانگریس کی بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے استفادہ کرتے ہوئے کھدر بھنڈار کھولا۔ لیکن اس کام سے بھی زیادہ عرصہ عہدہ برا ہونا مشکل نظر آیا۔ اب کے اُنہوں نے جوتوں کی فروخت کی دُکان مسلم بازار میں کھولی۔ لیکن بہت جلد اس سے بھی دست کش ہو گئے اور سال ۱۹۳۰ء میں اپنی زیرِ تولیت مسجد کی دُکان بازار صرافہ میں پہلی اسلامی دُکان صرافی کھولی۔ یہ کاروبار اُنہوں نے چند سال تک جاری رکھا۔ لیکن طبیعت کا تلوّن پھر رنگ لایا۔ سینما کا کاروبار نیا نیا شروع ہوا تھا۔ نیشنل موومی ٹون لاہور کو سرمایہ اور خوبصورت چہروں کی ضرورت تھی۔ میاں محمد اصغر خوبرو، بلند قامت، وجیہہ اور رنگین مزاج

تو تھے ہی۔ اس فلم کمپنی سے بطور انچارج سٹورز منسلک ہوگئے۔ کمپنی نے اپنی فلم "سورگ کی سیڑھی" تیار کی جس میں میاں محمد اصغر کے چند ایک درباری سین بھی رکھے گئے۔ یہ فلم مقبول نہ ہو سکی۔ اسی نیشنل مووی ٹون کمپنی نے ایک اور فلم "بھیشم پتنگیا" مشہور کہانی نویس آغا حشر کاشمیری کی زیرِ ہدایت بنائی۔ جس میں میاں محمد اصغر نے "ارجن" کا کردار کیا۔ یہ فلم بھی چنداں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔ اس فلم کمپنی کے دیوالیہ ہو جانے کی بناء پر میاں صاحب کی فلم لائن سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اور وہ پھر سے سابقہ فرم میسرز سپیڈنگ ڈنگا سنگھ اینڈ کو سے منسلک ہو گئے۔ جنہوں نے انہیں اپنا (RIVER SUPERINTENDENT) (نگرانِ دریائی امور) مقرر کیا۔ وہ اس کام پر ۱۹۴۷ء تک رہے اور تقسیم ملک کے بعد بادھوپور (بھارت) سے نقل مکانی کر کے واپس گجرات پہنچے۔ کہتے ہیں کہ بھارت سے انخلاء کے وقت انہوں نے سردار عبدالحمید آفندی (سابق امیر کابل کے پوتے) اور ان کے اہلِ خاندان کو بحفاظت پاکستان پہنچنے میں امداد دی جس کا تشکر کے ساتھ انھوں نے اپنی کتاب

(ROYALS & THEIR HANDICAPS) میں تذکرہ کیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد صرافہ بازار جس کی رونق ہندوؤں کے دم قدم سے قائم تھی اُجڑا سا نظر آنے لگا۔ چنانچہ اپنی سابقہ دکان صرافی میں میاں محمد اصغر نے کاروبار صرافہ پھر سے شروع کیا۔ اب وہ مستقلاً گجرات میں قیام کرنے کا عزم لے کر سرگرم کار ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر آفتاب اصغر صاحب کے مطابق وہ انجمن اسلامیہ گجرات کے سیکرٹری

اور مسلم لیگ گجرات کے خزانچی تھے۔ سرکاری افسران سے روابط بھی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور اعلیٰ خاندانی روایات اور اقدار کے پیش نظر اُن کو ڈسٹرکٹ سیشن کورٹ گجرات میں بطور اسیسر نامزد کیا گیا تھا۔ اُن کو موسیقی ہارمونیم بجانے اور گانے کا بہت شوق تھا۔ محفل ہائے طرب ونشاط اُن کی طبع رنگین کی غماز تھیں۔ وہ اس سلسلہ میں ایک خاص نقطۂ نگاہ رکھتے تھے اور زندگی کو اسی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جس کا ماحصل بقولِ شاعر یہ تھا کہ۔ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اپنی رنگین اور بافراغت زندگی کے ۵۸½ سال پورے کرنے کے بعد وہ ۱۷ راگست ۱۹۵۰ء کو عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے ان کی شادی ۱۹ سال کی عمر میں سال ۱۹۱۱ء میں گوجرانوالہ کے ڈار کشمیری خاندان کے ایک معزز رکن الحاج چودھری محمد سلطان میونسپل کمشنر اور گورنمنٹ کنٹریکٹر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ چند دختران چھ پسران میاں محمد انور۔ میاں محمد صفدر۔ میاں محمد آفتاب۔ میاں محمد فیاض اصغر۔ میاں محمد مسعود اصغر اور ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر تولد ہوئے۔ ان میں سے بالترتیب پہلے تینوں فرزند قضائے الٰہی سے بچپن میں ہی فوت ہوگئے۔ اُن کی انتہائی خواہش تھی کہ اُن کا سب سے چھوٹا صاحبزادہ میاں آفتاب اصغر ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرے لیکن۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میاں محمد اصغر کے صاحبزادے میاں فیاض اصغر ۹ ستمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ چونکہ اُن سے پہلے اُن کے تین بھائی وفات پا چکے تھے۔ اس

میاں ظہورالدین صاحب

میاں عبدالعزیز صاحب

میاں محمد اصغر صاحب

میاں محمّد فیاض اصغر صاحب

لئے قدرتی طور پر وہ اہل خانہ کی تمناؤں اور مرادوں کا درخشندہ ستارہ تھے۔ اور بہت ناز و نعم سے اُن کی پرورش ہوئی۔ وہ نہایت حسین متین اور خوش اطوار بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے زمیندارہ کالج گجرات میں داخلہ لیا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی اور امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی سال ۱۹۴۶ء میں سلسلۂ تعلیم منقطع کرکے زمیندارہ کالج کے بالمقابل "مختار منزل" میں اور چوک شاہدولہ گجرات میں بیک وقت دو دکانیں "سٹوڈینٹس بکڈپو" کے نام سے کھولیں۔ کالج کے اوقات میں کالج کے بالمقابل دکان اور اس کے بعد چوک شاہدولہ میں دکان پر کام کرتے۔ اپنی محنت، خلوص، دیانت اور کاروباری اصول پسندی سے جلد ہی وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ سال ۱۹۵۰ء میں انہوں نے بشراکت مرزا غلام حسین کتب فروش اور محمد یونس بٹ صاحب کتب فروش ایک فرم "درسی ادارہ گجرات" کی تشکیل کی جو اپنے کامیاب کاروباری نظام سے سال ۱۹۶۹ء میں لمیٹڈ ہو گیا جس کا اپنا پرنٹنگ پریس ہے۔ اور ہیڈ آفس گجرات کے علاوہ اُردو بازار لاہور میں برانچ آفس بھی قائم ہے۔ اس ملک گیر اشاعتی ادارہ کی تنظیم نو میں میاں محمد فیاض اصغر بطور چیئرمین اور ٹیکنیکل ڈائریکٹر منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

میاں فیاض اصغر خاموش طبع، مرنجان مرنج، مخیر، غریب پرور اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان ہیں۔ سال ۱۹۶۴ء میں وہ بنیادی جمہوریت کے اپنے حلقۂ انتخاب سے ضمنی انتخاب لڑے اور اپنی منفرد خوبیوں اور عوام دوستی کی اساس پر بھاری اکثریت سے ممبر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے اپنے حلقۂ انتخاب کی ضروریات کو محسوس کرتے

ہوئے آپ نوشی کے پانچ ٹکے لگوائے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں پچیس ۲۵ سال کی عمر میں اُن کی شادی میاں محمد سعید فاروقی کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوئی۔ جو اُن کی حقیقی پھوپھی زاد تھی۔ اُن کے بطن سے علاوہ چار دختران دو صاحبزادے میاں محمد ایاز اصغر اور میاں محمد اعزاز اصغر ہیں۔ اوّل الذکر ایف۔ ایس۔ سی (میڈیکل) امتیازی حیثیت سے پاس کر چکے ہیں اور میڈیکل کالج میں داخلہ لے چکے ہیں۔ جبکہ میاں اعزاز اصغر ابھی میٹرک کے طالب علم ہیں۔

میاں محمد اصغر کے منجھلے صاحبزادے میاں محمد مسعود اصغر ۲۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ اوائل عمر ہی سے اُنہیں جسمانی ورزش اور کھیل کود سے شغف تھا۔ حسین اور تنومند تھے۔ انہوں نے ایف اے تک زمیندارہ کالج گجرات میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کے برادرِ خورد ڈاکٹر آفتاب اصغر کے مطابق اپنے طالب علمی کے زمانہ میں کئی بار وہ کشتی کے صوبائی مقابلوں میں چیمپئن قرار دیئے گئے۔ مختلف مواقع پر اپنے کالج کے لئے وہ چھ عدد

ROLE OF HONOUR (اعزازات) حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سال ۱۹۴۸ء میں پہلی بار پاکستان اولمپک کے لائیٹ ویٹ مقابلہ کشتی میں شریک ہوئے اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ سال ۱۹۵۲ء میں اُنہوں نے لائٹ ہیوی ویٹ کشتی میں پنجاب اولمپک اور پاکستان اولمپک مقابلوں میں چیمپئن شپ جیتنے کا منفرد اعزاز حاصل کیا اور ورلڈ اولمپک کے لئے منتخب ہوئے۔ لیکن سوئے اتفاق سے نیشنل ریسلنگ ٹیم فنڈز کی کمی کے باعث اُس سال عالمی مقابلوں میں شرکت سے قاصر رہی۔ حکومت کی سرد مہری سے مایوس ہو کر میاں صاحب نے اپنے شوق کشتی و اکھاڑے کو خیر باد کہا اور ہمہ وقت قوتِ لایموت کے حصول کی تگ و دو میں لگ گئے۔

میاں محمد مسعود اصغر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے کے لئے اوّلاً ۱۹۴۷ء میں آبادان (ایران) جانے کا قصد کیا۔ اور اس طرح اپنے پھوپھی زاد بھائی میاں محمود اختر اور چچا میاں محمد افتخار نبی (برادرِ مولّف) کے ہمراہ بمبئی کا سفر اختیار کیا۔ لیکن وہاں سے تقسیم مُلک کے ہمہ گیر ہنگاموں نے انہیں وطن واپس لَوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہاں پہنچنے پر میاں مسعود اصغر نے اورسیئر بننے کے شوق میں مونگ رسول کی درسگاہ میں داخلہ لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن اُن کے والد میاں محمد اصغر نے اس امر کی اجازت نہ دی۔ اور اُن کے ایماء پر وہ اپنے برادرِ بزرگ میاں محمد فیاض اصغر کے کاروبارِ کُتب فروشی میں شریک ہو گئے۔ سال ۱۹۵۱ء میں میاں فیاض اصغر نے دروازہ شیشیانوالہ کے نواح میں ایک علیحدہ دکان "فیاض برادرز" کے نام سے کھولی اور یہ دکان کلی طور پر میاں مسعود اصغر کی سپردگی میں دے دی۔ لیکن ورا‌ثتاً پائی گئی سیمابی طبیعت نے کتب فروشی میں اُن کا دل نہ لگنے دیا اور طالع آزمائی کے لئے اُنہوں نے ۱۹۶۰ء میں برطانیہ کا رُخ کیا۔ وہاں بھی ایک سال کے قیام سے اُن کا جی بھر گیا۔ اور وہ واپس وطن لوٹ آئے۔ میاں محمد فیاض اصغر اب تک درسی ادارہ گجرات کی تشکیل اور اُس کی ترقی میں اس قدر منہمک تھے کہ وہ اپنے بھائی کی لندن روانگی کے بعد "فیاض برادرز شیشیانوالہ گیٹ" کی کُتب فروشی کی دکان کی کما حقہٗ نگرانی اور دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ میاں محمد مسعود اصغر کی ولائیت سے واپسی پر اُنہوں نے یہ دُکان اُن کے حوالہ کر دی اور خود ہمہ وقتی توجہ درسی ادارہ گجرات کی نشوونما پر مبذول کی۔ میاں محمد مسعود اصغر کی افتادِ طبیعت پھر اُنہیں اس ماحول سے دور کنٹریکٹر شپ کی جستجو

دُنیا میں لئے جارہی تھی۔ اُنہوں نے نئی الفور " فرینڈز کنسٹرکشن " کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور کچھ کام شروع بھی کیا۔ لیکن یہ بھی اُن کے بس کا روگ ثابت نہ ہُوا۔ اب اُنہوں نے صنعتِ پنکھا سازی کیطرف رجوع کیا۔ پہلے تو احباب کی شرکت سے " سٹینڈرڈ الیکٹرک کمپنی " اور بعدۂ " ڈیلکس الیکٹرک کمپنی " کی تشکیل کی۔ اور برقی پنکھا سازی کا ذاتی کارخانہ سرگودھا روڈ گجرات میں قائم کیا۔ لیکن ابھی کہاں وہ اس کارخانہ سے بھی گرنیاں برقی پنکھوں کے پلاسٹک کے فالتو پُرزہ جات بنانے کے منصوبے کے بارہ میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اِک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میاں محمد مسعود اصغر کی شادی دسمبر ۱۹۵۱ء میں وزیر آباد کے ثمن بُرج کے مشہور راجہ خاندان میں ہوئی۔ اُن کے ہاں تین دختران ہی تولد ہوئیں۔ میاں صاحب کے بارہ میں فنِ کشتی کے علاوہ ذوقِ تصویر کشی اور خوشنویسی میں دسترس بھی بیان ہوتی ہے۔ راگ راگنیاں بھی اُن کے ذوقِ سلیم کی باندیاں بتائی جاتی ہیں۔ وہ بظاہر کم گو لیکن بہ باطن بڑ اوصافِ شخصیت کے مالک ہیں سپورٹس کے سلسلہ میں اُن کی اعلیٰ کارکردگی اب بھی زمیندارہ ڈگری کالج کے آنرز بورڈ پر اُن کے تذکرہ کی صورت میں خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔ البتہ پڑھائی کے میدان میں وہ کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔

میاں محمد اصغر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر یکم مارچ ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے ابتدائی پرائمری تعلیم کے

میاں محمد مسعود اصغر صاحب

ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر صاحب

میاں محمد اسلم صاحب

بعد اینگلو ورنیکلر فائنل امتحان سال ۱۹۵۴ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان بھی سال ۱۹۵۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے والد اور دیگر افراد کنبہ کے ایماء پر ایف۔ سی۔ کالج لاہور میں میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اُنہوں نے محسوس کیا کہ ان کا میلان طبع ادبیات کی طرف ہے چنانچہ وہ لاہور سے واپس گجرات آگئے اور یہاں زمیندارہ کالج میں داخلہ لے لیا اور اس طرح ڈاکٹری کو چھوڑ کر ادبیات میں کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کرنے لگے۔ انہوں نے سال ۱۹۶۰ء میں زمیندارہ کالج گجرات سے بی اے آنرز (فارسی) کیا اور آنرز میں میڈل جیتا۔ بعد میں سال ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے (فارسی) اور سال ۱۹۶۷ء میں ایم اے اردو کیا۔

اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور لیکچرار (فارسی) گورنمنٹ ڈگری کالج میانوالی سے کیا۔ سال ۱۹۶۵ء میں وہ حکومت ایران کے تعلیمی وظیفہ پر اعلیٰ فارسی تعلیم کے حصول کی خاطر ایران چلے گئے۔ جہاں انہوں نے تہران یونیورسٹی سے سال ۱۹۶۷ء میں فارسی زبان و ادبیات میں ایم اے کیا۔ اور اسی سال وطن واپسی پر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں عارضی بنیاد پر بطور لیکچرار تعینات ہوئے۔ سال ۱۹۶۹ء میں وہ دوبارہ ایران چلے گئے۔ اپنے قیام ایران کے دوران سال ۱۹۷۲ء میں "مغل دور کی فارسی تاریخ نویسی" کے موضوع پر تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی عرصہ میں ریڈیو زاہدان (ایران) کے اردو پروگراموں میں ایرانیات کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے بہت سی تقاریر مختلف اوقات میں نشر کیں اور

"تدریسِ فارسی" کے پروگرام میں بھی حصّہ لیا۔ متعدد ڈرامے تصنیف کیے۔ اور اپنے چچا میاں حامد سردار کے ہمراہ ہدایت کار اور صدا کار کی حیثیت میں ان ڈراموں کی نشریات میں حصّہ لیا۔ ڈاکٹریٹ کے حصول کے بعد ریڈیو ایران کی طرف سے اُنہیں معقول مشاہرہ پر اُن کی نشریات کے شعبہ میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ لیکن وطنِ عزیز میں اپنے والد کی بے وقت موت کے بعد والدہ کی خدمت کی سعادت انہیں کشاں کشاں گجرات کھینچ لائی۔ یہاں پہنچتے ہی اُنہیں دانش گاہ پنجاب لاہور کے شعبہ فارسی اور ایران کلچرل سنٹر کی کلاسوں میں اُستاد کی حیثیت میں کام کرنے کے مواقع میسر آگئے۔ چنانچہ آج کل اپنے وطن میں وہ فارسی زبان و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔

وہ منگھوال راجپوت خانوادہ کے پہلے پی ایچ۔ ڈی اور صاحبِ تصنیف فرد ہیں۔ اُردو اور فارسی زبان و ادبیات سے متعلق اُن کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ نصابی کتب کے علاوہ ان کی اہم تصانیف میں لمعات، دستورِ اردو انشاپردازی اور تاریخ مبارک شاہی شامل ہیں۔ اُن کا ڈاکٹریٹ کا تھیسیس دانشگاہ تہران کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل ہے۔ آج کل وہ "متفرقاتِ امیر خسرو" کے نام سے ایک کتاب کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔

اُنہیں صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کی خواہش کے مطابق معالج نہ بنے اور ادبیات کا ڈاکٹر بھی اُن کی زندگی میں نہ بن پائے۔ وہ خوش رو، متوازن قد و قامت اور خوش اخلاق نوجوان ہیں۔ انہوں نے سال ۱۹۶۷ء میں جناب صدیق حسن انصاری سب رجسٹرار علی گڑھ کی دُختر اور پروفیسر رضی الرحمٰن سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کراچی کی خواہر نسبتی سے شادی کی جو کہ قوم منگھوال کی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی بہو ہیں۔ گویا ع

## ایں خانہ ہمہ آفتاب است

میاں وزیر بخش کے تیسرے لڑکے میاں محمد اکبر خان تھے۔ وہ سال [illegible]
میں تولد ہوئے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اور عملی زندگی بطور
فارسٹر محکمہ جنگلات شروع کی۔ وہ زیادہ عرصہ گجرات سے باہر رہے۔ وہ
سادہ طبیعت، محنتی اور فرض شناس ملازم سرکار تھے۔ اپنے بھائیوں سے
محبت کرنے والے اور خلیق بزرگ تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں
کیں۔ انکی پہلی زوجہ گجرات ہی کے مولوی احمد دین کی دختر تھیں۔ جن کے
بطن سے علاوہ ایک دختر تین پسران میاں محمد اسلم، میاں محمد زمان اور میاں
دوست محمد تولد ہوئے۔ میاں محمد زمان تو بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو
گئے۔ کچھ سال بعد میاں محمد اسلم کی والدہ فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد میاں
محمد اکبر نے ایک نومسلم بیوہ سے شادی کی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
میاں محمد اکبر ملازمت سرکار کے دوران جالندھر، ہوشیار پور اور شملہ کے اضلاع
میں متعین رہے۔ اپنی تقرری بمقام سولن کے دوران انہوں نے دوسری
شادی کی تھی۔

میاں محمد اکبر کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں محمد اسلم ۱۲ جنوری
۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی اور اپنی زندگی
معمولی کاروبار شیشہ سازی، رنگ سازی اور گھومنے پھرنے سے شروع کی چونکہ
تعلیم کافی نہیں تھی۔ اسلئے ان کے لئے کسی معقول سرکاری ملازمت کا حصول
ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنی پسند کی غیر برادری
میں شادی کی۔ اس خاتون سے تین فرزند اور چار لڑکیاں تولد ہوئیں۔ ان کے
پسران میاں محمد جاوید اسلم، میاں محمد پرویز اسلم اور میاں شمس تبریز اسلم ہیں۔

سے منجھلے میاں محمد پرویز اسلم اوائل عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے جبکہ میاں محمد جاوید اسلم سال ۱۹۵۲ء میں تولد ہوئے ۔ اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ عازم برطانیہ ہو گئے ۔ اور وہیں پر کسی فرم میں نجی ملازمت کرتے ہیں ۔ اُنکی شادی سال ۱۹۷۶ء کے اوائل میں ہوئی ہے ۔ میاں شمس تبریز اسلم سال ۱۹۵۶ء میں تولد ہوئے وہ بھی میٹرک کے بعد وفاق عرب امارات کی ریاست دوبئی میں ملک سے باہر چلے گئے اور وہاں گیس کمپنی میں بطور سٹور کیپر ملازم ہیں ۔ اُنکے باہر جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ۔ ہر دو برادران اپنی والدہ کی فوتیدگی کے وقت ملک سے باہر تھے ۔

میاں محمد اکبر کے تیسرے فرزند میاں دوست محمد خان سال ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے انہوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی اور ڈرائیوری سیکھی ۔ کچھ عرصہ مختلف بس سروس کمپنیوں میں ملازمت کے بعد موٹر کاروں کی خرید و فروخت کا کام شروع کیا ۔ اور لاہور چلے گئے ۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں ، جن میں سے دونوں پہلی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی ۔ بالآخر انہوں نے میاں ضیاء الدین کی دختر سے تیسری شادی کی ۔ اُن کے بطن سے میاں دوست محمد خان کے پانچ صاحبزادے تولد ہوئے جن کے بالترتیب نام میاں محمود دوست ۔ میاں مسعود دوست ۔ میاں منصور دوست ۔ میاں منظور دوست اور میاں منتظر دوست ہیں ۔

سال ۱۹۶۲ء کے دوران میاں دوست محمد ایک موٹر کار خریدنے کے سلسلہ میں کراچی گئے ہوئے تھے ۔ وہاں سے اُنہوں نے ایک موٹر کار خریدی اور اُس میں اپنے دو احباب کے ساتھ کراچی سے لاہور روانہ ہوئے براستہ

میں کوٹری اور حیدرآباد (سندھ) کے درمیان رات کو اُن کی گاڑی کو جسے وہ خود چلا رہے تھے۔ حادثہ پیش آگیا۔ جس سے وہ جاں بحق ہوگئے اُن کی لاش ٹرین میں لاہور لائی گئی اور وہیں وہ مدفون ہوئے۔ اُن کی بیوہ اور بچے مستقلاً لاہور میں ہی اقامت گزین ہیں۔ میاں دوست محمد بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ اور خاندانی وجاہت اور نجابت کے امین تھے۔

میاں نذیر بخش کے سب سے چھوٹے فرزند میاں محمد رشید تھے۔ وہ سال ۱۸۹۲ء میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میٹرک تک تھی۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے کوتاہ قد تھے۔ خوش پوش اور وضع دار فرد تھے۔ عملی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں بطور انسپکٹر چونگی میونسپل کمیٹی گجرات سے کیا۔ بعدہٗ متعدد جگہوں پر چونگی انسپکٹر اور ایک آدھ جگہ پر سیکرٹری میونسپل کمیٹی بھی رہے ہیں۔ اپنے کام میں ماہر مانے جاتے — ادبی ذوق کے بھی حامل تھے لیکن یہ شوق خطوط نویسی اور حاشیہ آرائی تک محدود تھا۔ اپنے ہم عصر رشتہ داروں میں مقبول تھے۔ خدمت کے آخری ایام میں وہ سیکرٹری میونسپل کمیٹی چکمرتہ (ضلع سہارن پور بھارت) تھے۔ انہوں نے خاندان بھر میں شادیوں کا ریکارڈ قائم کیا۔ کم و بیش آٹھ شادیاں قریباً ہر ضلع صوبہ پنجاب سے قریباً ایک شادی کی اوسط سے مختلف خاندانوں میں کیں۔ سب سے پہلی شادی سیالکوٹ سے کی۔ اس خاتون سے اُن کے ہاں ایک فرزند میاں محمد عبدالہادی اور تین دختران تولد ہوئیں۔ جبکہ گجرات کی درویش فرقہ کی ایک خاتون سے اُنکے ہاں ایک فرزند ہارون رشید پیدا ہوئے۔ دیگر کسی منکوحہ سے اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کیا کرتے۔

پہلی زوجہ کی طلاق یا موت کی صورت میں ہی وہ دوسری شادی رچاتے۔ اس طرح زندگی کے کسی سال میں بھی وہ بغیر زوجہ کے نہیں رہے۔ ساتھی آتے اور جاتے رہے اور وہ بقولِ شاعر اپنے شب و روز میں کچھ اس طرح مگن رہے کہ ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

میاں محمد رشید قیام پاکستان سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ عجیب رنگین طبیعت کے بزرگ تھے۔ سادگی اور پُرکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اُنہیں کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا۔ سرکاری ہو یا نجی وہ اپنے مخاطب کو مرعوب کئے بغیر نہ رہتے تھے۔

اُن کے بڑے صاحبزادے میاں محمد عبدالہادی نے جو ۱۳ جولائی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی ملازمت کی پھر کراچی چلے گئے۔ وہاں شیخ محمد ایوب کے ہاں ایوب ایکس موتی بلڈنگ بندر روڈ (محمد علی جناح روڈ) میں ملازمت کی۔ وہاں سے فیروز سنز لمیٹڈ کی لیبارٹریز میں چلے گئے۔ آج کل وہ مُلک کی اِسی مشہور فرم کے (ایکسپورٹ و امپورٹ) راولپنڈی ریجن کے مینجر ہیں۔ اور مستقلاً ۶۱ - E - ۲ سٹیلائٹ ٹاؤن کراچی میں اپنی ذاتی کوٹھی میں مقیم ہیں۔ خاندان سے باہر اُنکی شادی ہو چکی ہے۔ اُن کی ایک صاحبزادی کے علاوہ تین لڑکے میاں منصور رشید میاں محسن رشید اور میاں احسن رشید ہیں۔ جو سبھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

خدا آباد رکھے اِس چمن کو

میاں رسول بخش کے تیسرے صاحبزادے میاں مراد علی تھے۔ وہ سال

میاں محمد رشید صاحب

میاں عبدالہادی صاحب

میجر محمد بشیر الحسن صاحب

١٨٤٨ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مڈل تک تھی۔ اپنی عملی زندگی میں انہوں نے ضلع کچہری گجرات میں عرائض نویس کے طور پر کام شروع کیا۔ اپنی شرافت، نجابت، رکھ رکھاؤ، سادگی اور حسنِ سیرت سے وہ ہر ملنے والے کو متاثر کرتے۔ عوام اور حکام ہر ایک میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی شادی سال ١٨٦٩ء میں جلالپور جٹاں تحصیل گجرات میں اپنے ماموں کے ہاں ہوئی۔ اُن کی ازدواجی زندگی نہایت ہی خوشگوار تھی۔ علاوہ دو دختران اُن کے تین پسران میاں محمد اکرم، میاں محمد افضل اور میاں محمد ممتاز تھے۔ میاں محمد ممتاز ابھی پندرہ سال کی عمر کو ہی پہنچے تھے کہ راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس جواں مرگ سے والدین اور دیگر افرادِ کنبہ انتہائی دل شکستہ ہوئے۔ میاں مراد علی نے سال ١٩٣٦ء میں وفات پائی۔ اور بیگم پورہ کے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

میاں مراد علی کے فرزندِ بزرگ میاں محمد اکرم نے میٹرک پاس کرنے کے بعد محکمہ ریلوے میں بطور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ بہت ذہین، دیانتدار، فرض شناس ملازم سرکار تھے۔ اپنی ملازمت ریلوے میں حسنِ کارکردگی سے اُنہوں نے عوام و خواص میں یکساں طور پر ہر دلعزیزی حاصل کی جلد ہی اُنہوں نے ترقی یاب ہو کر بطور اسٹیشن ماسٹر چارج سنبھالا۔ چند سال بعد اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے دوران ریلوے لائن پر کھڑے تھے۔ کہ قضائے الٰہی سے شنٹنگ کرتی ہوئی گاڑی کے انجن کی زد میں آ کر کچلے گئے۔ اور یوں ایک نیک صفت، ہمدرد، اور پُر اخلاص فردِ قوم اپنی جواں سال بیوہ اور تین بچوں کا داغِ مفارقت دے کر ٨ اکتوبر ١٩٢٣ء کو ملکِ عدم کو سدھارا۔ اُن کی نعش سپیشل ریلوے کے ذریعے گجرات پہنچائی گئی۔ جس میں اُن کے لواحقین کو بھی سوار کرنا

طور پر پورے اعزاز سے وطن بھیجا گیا۔ میاں محمد اکرم کی صلۂ رحمی، خدا ترسی اور اپنوں سے محبت ایک برادرِ بزرگ کی صورت میں مثالی تھی۔ اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے کمالِ شفقت اور باہمی اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مکان محلہ راجپوتاں بیرون شاہ دولہ دروازہ تعمیر کرایا۔ اور مشترکہ طور پر اپنے برادرِ خورد میاں محمد افضل پر اس میں ہر دو خاندانوں کی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے ایک جیسے سیٹ تعمیر کروائے، صحن مشترکہ رکھا تاکہ خاندانی روابط کی تجدید کے سامان ہوتے رہیں۔ انہوں نے سرِدست اپنے برادرِ خورد کی فیملی کو اس گھر میں آبادی کی سہولت مہیا فرمائی۔ کیونکہ وہ خود ملازمت ریلوے کے سلسلہ میں گجرات سے باہر رہائش پذیر تھے۔ چھوٹے بھائی نے بھی بساط بھر اس گھر کی تعمیر میں دامے درمے حصہ لیا۔ اور اس طرح میاں محمد اکرم کی وفات کے بعد یہ گھر ہر دو اطراف کی صورت میں نصف نصف ہر دو بھائیوں کی فیملی کے مابین اس طرح تقسیم ہوا۔ کہ شمالی جانب جو رہائشی تعمیر، جنوبی طرف سے کم تھی۔ وہ برادرِ خورد نے اپنے لئے منتخب فرمائی۔ اور جنوبی جانب کی ایک کمرہ زاید والی تعمیر اپنی بیوہ بھاوج اور یتیم برادر زادوں کی تحویل میں دے کر حسنِ کردار اور بلند حوصلگی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ فرمایا۔ اس دوران مرحوم کی بیوہ نے اپنی محلہ چابکسواران والی رہائش گاہ میں ہی رہنا پسند فرمایا۔ اور اپنی زندگی تک وہ وہیں اپنے دو بچوں اور ایک بچی کے ساتھ مقیم رہی۔ میاں محمد اکرم کی بیوہ انتہائی سلیقہ شعار سلیم الطبع غیور اور گھریلو خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے عظیم شوہر کی گیر بچوئی اور پس انداز رقم سے اس طرح اپنے گھریلو فرائض سرانجام دیئے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ کہ کس طرح احسن طریق سے اُن کی اولاد تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اور اُن کے ذرائع آمدنی کیسے اور کہاں سے تسلسل برقرار رکھے ہوئے تھے۔ میاں محمد اکرم

میاں محمد اکرم صاحب

میاں محمد زمان صاحب

میاں محمد اقبال صاحب

میاں ظہیر زمان صاحب

کے اپنی واحد زوجہ سے علاوہ ایک صاحبزادی کے دو پسران میاں محمد زمان اور میاں محمد اقبال تولد ہوئے۔

میاں محمد اکرم کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں محمد زمان خان نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنی ملازمت کا آغاز بطور پولیس کانسٹیبل کیا۔ لیکن یہ ملازمت اُن کے مزاج اور طبیعت کے میلان کے مطابق نہ تھی۔ وہ اس ملازمت کے دوران ٹریفک پولیس میں لاہور کے مال روڈ اور دیگر چوکوں پر متعین کئے گئے۔ جس سے وہ اپنے حلقہ احباب میں خود کو احساس کمتری کا شکار پاتے۔ چنانچہ انہوں نے ملازمت محکمہ پولیس سے استعفیٰ دیکر آزادی اور چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ فوجی ریکارڈنگ آفس لاہور میں بطور کلرک بھرتی ہو گئے۔ یہاں بطور حوالدار کلرک انہوں نے کافی سال کام کیا۔ بعد میں بطور منیجر ریجنٹ سینما میکلوڈ روڈ لاہور کام کرتے رہے۔ قریب ایک سال کا عرصہ ہوا وہ یونائیٹڈ انشورنس کمپنی لاہور سے بطور ڈویلپمنٹ آفیسر منسلک ہو گئے ہیں۔ اُن کی شادی محلہ کالری دروازہ گجرات کی مشہور شیخ برادری کے ممتاز رکن شیخ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین دختران اُن کے دو پسران میاں تنویر محمد زمان اور میاں ظہیر محمد زمان تولد ہوئے۔

میاں تنویر محمد زمان اپنے والد کی طرح خوبصورت دراز قامت اور متوازن شخصیت کے حامل ہیں۔ اپنی ملازمت کا آغاز بنک کی ملازمت سے کیا۔ آج کل وہ یونائیٹڈ بنک میں بطور منیجر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ محنتی، ملنسار اور خلیق نوجوان ہیں۔ طبیعت میں جوش و ولولہ کے علاوہ انتہائی خودداری کا احساس فرض نمایاں ہے۔ میاں محمد زمان کے دوسرے

صاحبزادے میاں ظہیر محمد زمان بھی توعمند اور عمر سالہ نوجوان ہیں۔ ابھی زیر تعلیم ہیں۔ اور اپنے والدین کے پاس لاہور میں ہی مقیم ہیں۔ میاں محمد اکرم کے دوسرے فرزند میاں محمد اقبال بھی حسین وجمیل پیکر ہونے کے علاوہ ایک ذہین بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اُنہوں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی گریجوایٹ بننے کے بعد اُنہیں اپنے باپ کی ریلوے میں عظیم خدمات کے صلہ میں ڈسٹرکٹ گریڈ III میں سپیشل ٹکٹ ایگزیمینر لے لیا گیا۔ آخری ایام ملازمت میں وہ قصور ریلوے سٹیشن پر متعین تھے۔ اُسی دوران اُنکی شادی کھوکھر کی ضلع گوجرانوالہ کے ایک معزز خاندان کی ایک بہ صفت موصوف دوشیزہ سے ہو گئی۔ جنکے بطن سے دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ شادی کے چند سال بعد میاں محمد اقبال تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہو گئے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اور وہ جواں سال سلیقہ شعار بیوہ کے علاوہ دو بچیوں کو بے سہارا چھوڑ گئے۔ اُن کی چھوٹی بچی بھی والد کی وفات کے ایک سال بعد اللہ کو پیاری ہو گئی۔ جبکہ اُن کی بڑی صاحبزادی اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے ننھیال چلی گئی۔ جہاں اُسکی چند سال قبل شادی بھی ہو چکی ہے۔ میاں محمد اقبال ایک اچھے بھائی۔ ایک ہمدرد دوست سلجھے ہوئے ادیب اور ادبی شخصیتوں سے دلی لگاؤ رکھنے والے انسان تھے۔ اُنہیں حضرت مولانا ظفر علی خان سے انتہائی عقیدت تھی اور اکثر اُن کی مجالس سے استفادہ کے لئے کرم آباد (متصل وزیر آباد) حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری دیتے۔ وہ متوازن تھے۔ خوش گفتار اور نیک کردار نوجوان تھے۔ جو ۲۳/ مئی ۱۹۳۶ء کو عین عالم جوانی میں ہی ملکِ عدم کو سدھارے۔ ع

میاں محمد افضل صاحب

میاں محمد اسلم صاحب پی سی ایس (ریٹائرڈ)

میاں محمد محسن صاحب انسپکٹر آبکاری ومحصولات (ریٹائرڈ)

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

میاں مراد علی کے دوسرے صاحبزادے میاں محمد افضل نے اپنی تعلیم میٹرک تک مکمل کرکے عملی زندگی کا آغاز بطور کلرک دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات کیا۔ اپنی محنت۔ دیانت۔ فرض شناسی۔ معاملہ فہمی اور تدبر سے انہوں نے جلد ہی پہلے شیر کلرک پھر اسسٹنٹ اور بعدہٗ بطور ہیڈ کلرک اپنی ترقی کی منازل طے کیں۔ اُن کی پہلی شادی اپنے چچا میاں حسین بخش کی دختر سے ہوگئی۔ لیکن یہ خاتون اپنی شادی کے ایک سال کے اندر ہی وفات پاگئیں۔ چنانچہ آپکی دوسری شادی میاں برکت علی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے علاوہ تین دختران چار فرزند میاں محمد اسلم۔ میاں محمد یوسف۔ میاں محمد محسن اور میاں محمد سعید تولد ہوئے۔ میاں محمد افضل اپنی ریٹائرمنٹ کے آخری سال بطور سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات بھی کام کرتے رہے۔ وہ اپنے وقت کے باکمال اور کامیاب کارندہ سرکار شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے ۱۲/ دسمبر ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔

میاں محمد افضل کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں محمد اسلم یکم نومبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک انہوں نے سال ۱۹۲۵ء میں کی۔ اور گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج گجرات میں داخلہ لیا۔ سال ۱۹۲۷ء میں ایف۔اے یہاں سے پاس کرکے مرے کالج سیالکوٹ میں بی اے (آنرز) کا داخلہ لیا۔ اور سال ۱۹۲۹ء میں خاندان سنگھرال گجرات کے پہلے گریجوایٹ کی حیثیت میں فارغ التحصیل ہوئے۔ عملی زندگی میں داخلہ کے لئے محکمہ مال میں بطور نائب تحصیلدار راولپنڈی ڈویژن منتخب ہوئے۔

قیام پاکستان کے وقت ضلع سرگودہا میں تحصیلدار متعین تھے۔ بعد میں دفتر
فنانشل کمشنر لاہور میں بطور افسر بکار خاص زرعی انکم ٹیکس تعینات ہوئے۔ اپنی
مخلصانہ کارکردگی۔ حلیم الطبعی۔ محنت اور افسران بالا کی تابعداری کی بناء پر
۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو پراونشل سول سروس (کلاس I) میں ترقی یاب ہوئے
ملازمت کے دوران متعدد اضلاع میں بطور افسر مال کام کرتے رہے۔ سال
۱۹۵۵ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر ریونیو اکادمی گجرات متعین رہے۔ بعد میں محکمہ
بحالیات میں بطور سیکرٹری بورڈ (محکمہ بحالیات) صنعتی ادارہ جات بھی کام کیا۔
اس کے بعد وہ وزیر زراعت پنجاب ملک خدا بخش بچہ کے سیکرٹری کے طور
پر بھی متعین رہے۔ انکی اعلیٰ درجہ کی مہارت اور کام سے لگن کے علاوہ
پُرخلوص خدمت کے عوض انہیں ۶۰ سال کی عمر تک ملازمت میں توسیع
دی گئی اور وہ خوش اسلوبی سے سرکاری خدمت سرانجام دینے کے بعد یکم
دسمبر ۱۹۶۰ء کو سبکدوش ہوئے۔ اس وقت وہ بطور ڈپٹی الیکشن کمشنر کام
کر رہے تھے۔ انکی خدمات کے اعتراف میں ریٹائرنگ گورنمنٹ سرونٹس
سکیم کے تحت ان کو ۵ مربعہ اراضی صوبہ سندھ میں دی گئی۔ ملازمت سرکار
کے بعد انہوں نے چند سال سہگل انڈسٹریز میں بطور مشیر مال خدمات سرانجام
دیں۔ آج کل لاہور میں مستقلاً آباد ہیں اور گھریلو زندگی بسر کر رہے ہیں۔
ان کی شادی سال ۱۹۳۶ء میں امرتسر (حال بھارت) کے ایک معزز کشمیری
میاں خاندان میں ہوئی۔ ان کی اس زوجہ سے علاوہ تین دختران تین صاحبزادے
میاں محمد پرویز اسلم، میاں محمد جاوید اسلم اور میاں محمد خالد اسلم ہیں۔ ان کی
زوجہ کا انتقال پُرملال سال ۱۹۷۵ء میں ہو چکا ہے۔

میاں محمد پرویز اسلم پسر کلاں میاں محمد اسلم کی ابتدائی تعلیم میٹرک تک

ہے۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز انہوں نے بطور انشورنس ایجنٹ یونائیٹڈ انشورنس
کمپنی لاہور سے کیا۔ جلد ہی اپنی محنت اور بزنس کے حصول سے وہ ترقی کرتے
گئے۔ آجکل وہ اسی کمپنی کے اسسٹنٹ جنرل مینیجر ہیں وہ ١١ نومبر ١٩٣٨ء
کو تولد ہوئے تھے۔ اور کم عمری میں ہی اپنی محنت اور کام کی لگن سے
عملی زندگی میں کامیاب ہوئے۔ وہ مستقلاً لاہور میں ہی قیام پذیر ہیں۔ وہ
متعدد بار برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کا تجارتی دورہ بھی کر چکے ہیں۔ اور اسی
دوران سعادت عمرہ سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے کنبہ کی
انتہائی خدمت کی ہے۔ انہی کی مساعی سے اُن کے چچا اور پھوپھا انشورنس
کے کاروبار سے منسلک ہوئے۔ وہ انتہائی زیرک۔ معاملہ فہم۔ اور سنجیدہ قسم
کے نوجوان ہیں۔ اُن کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی۔ جن کے بطن
سے علاوہ ایک دختر دو پسران میاں سلیم پرویز اور میاں علی پرویز ہیں - جو
دونوں زیر تعلیم ہیں۔

میاں محمد اسلم کے دوسرے فرزند میاں جاوید اسلم ہیں۔ جو ٨ اپریل ١٩٤١ء
کو پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے بی اے پاس کیا۔
انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کی ملازمت سے
کیا۔ اپنی محنت۔ دیانت اور قابلیت سے ترقی یاب ہوئے۔ آج کل
وہ اسی بنک کی ایبک روڈ شاخ شہر لاہور ہی میں بطور مینیجر تعینات
ہیں۔ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ ان کے ہاں ایک بچی اور ایک لڑکا میاں
عمر جاوید پیدا ہوا ہے۔ میاں محمد جاوید اسلم خوش وضع خوش اطوار اور خوش
اخلاق نوجوان ہیں۔ وہ بھی اپنے والد اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح
گجرات سے نقل مکانی کر کے مستقلاً لاہور ہی میں آباد ہو گئے ہیں۔ البتہ

کبھی کبھار اپنے لواحقین سے ملنے گجرات اپنے آبائی گھر میں ضرور آتے ہیں

میاں محمد اسلم کے تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر میاں محمد خالد اسلم ہیں۔ وہ ۲۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ اپنی خوبصورتی اور متوازن نقوش کی بنا پر اُنہیں اوائل عمری میں "بادا" کے پیارے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ایم۔ایس۔سی فزکس کرنے کے بعد وہ برطانیہ میں کمپیوٹر کی اعلیٰ استعداد کے حصول کی خاطر چلے گئے۔ جہاں دو سال کمپیوٹر میں مخصوص ٹریننگ لی۔ وہاں سے ہی تین سال میں فزکس میں ڈی۔فل کی ڈگری لی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر کے واپس وطن آئے۔ آجکل وہ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ راولپنڈی کے شعبہ کمپیوٹر کے انچارج کی حیثیت سے متعین ہیں۔ اُن کی شادی اپنی سب سے چھوٹی پھوپھی مسز منیجر جی۔ایم نون کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ دورانِ قیام برطانیہ اُن کے ہاں ایک لڑکا تولد ہوا جو وہیں وفات پا گیا۔

میاں محمد افضل کے دوسرے صاحبزادے میاں محمد یوسف سال ۱۹۱۲ء میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میٹرک تک حاصل کی، شروع سے ہی تجارت کی طرف میلان تھا۔ اکثر خرابی صحت کے مریض رہے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت جبکہ اُن کے بڑے بھائی میاں محمد اسلم ضلع سرگودہا میں بطور تحصیلدار تعینات تھے۔ میاں محمد یوسف نے موضع سلانوالی ضلع سرگودہا میں آڑھت کا کاروبار شروع کیا۔ جس میں اُن کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ وہ اپنی جسمانی کمزوری اور نقاہت کی بنا پر مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ ایک ہمدرد بھائی اور سنجیدہ مزاج فردِ کنبہ ہے۔ بھائیوں سے صلہ رحمی اور ہر مرحلہ پر اپنے اہلِ کنبہ کی خدمت اُنکی موجودہ زندگی کی واضح اساس ہے۔

میاں محمد افضل کے تیسرے فرزند میاں محمد محسن ۲۰ رجون ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے ایف اے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج گجرات سے کیا اور بی اے کے لئے مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد سال ۱۹۴۰ء میں دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات میں بطور جونیئر کلرک ملازمت کا آغاز کیا۔ چند سال بعد اپنی محنت۔ لگن اور حسن کارکردگی کی بنا پر بطور سب انسپکٹر محصولات و آبکاری چن لیے گئے۔ زیادہ عرصہ ملازمت ضلع سرگودھا اور لائلپور میں گزارا۔ کچھ سال بعد بطور انسپکٹر اسی محکمہ میں کام کرنے کے بعد ۲۰ رجون ۱۹۷۶ء کو ریٹائر ہو گئے۔ اس سے پہلے لائلپور میں ہی اپنے پسران کیلئے انہوں نے پاور لومز کا کام انتخاب کیا۔ اور انکو تجارت میں ڈال دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے میاں شیخ ٹریڈنگ کمپنی کے نام سے ایک فرم کی بنیاد گجرات میں رکھی۔ اور گلیکسو کی ایجنسی برائے ضلع گجرات حاصل کی۔ اور اسی طرح وہ آج کل نئے جوش اور ولولے کے ساتھ زندگی کی تگ و دو میں سرگرم کار ہیں۔ ان کی شادی اپنی تایا زاد سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین دختران دو صاحبزادے میاں محمد احسن اور میاں محمد اعظم تولد ہوئے۔

میاں محمد محسن کے صاحبزادے میاں محمد احسن گجرات میں ہی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے بی۔ اے پاس کیا۔ اپنے والد کی ملازمت کے دوران انہوں نے سرگودھا میں پاور لومز لگائیں اور کھڈی کا کپڑا تیار کروانے لگے۔ یوں وہ بجائے ملازمت کے حصول کی سعی کے تجارت پارچہ بافی سے منسلک ہو گئے۔ انکی شادی اکتوبر ۱۹۷۴ء میں سیٹھ محمد الطاف کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے دو پسران میاں شیراز احسن اور میاں شہزاد احسن

تولد ہوئے۔ میاں محمد احسن تجارت پیشہ ہیں اور نہایت ہی محنتی، ذہین اور زیرک نوجوان ہیں۔

میاں محمد محسن کے دوسرے صاحبزادے میاں محمد اعظم بھی گجرات ہی پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت میں اپنے بھائی میاں محمد احسن کی شراکت اور اعانت کر رہے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا رجحان بھی تجارت کی طرف ہے۔ اور اس کم عمری میں ہی وہ بڑی لگن اور مستعدی سے مصروف کار ہیں۔ میاں محمد اعظم ذکی الحس اور ولولہ انگیز طبیعت کے مالک ہیں حال ہی میں وہ نقل مکانی کر کے گجرات آ گئے ہیں۔ اور نجی طور پر دکانداری کر رہے ہیں۔

میاں محمد افضل کے سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد سعید ۹ جولائی ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد چند سال جہانگردی کی نذر کئے اور پھر عملی زندگی کا آغاز بطور فارسٹر محکمہ جنگلات سے کیا۔ لیکن اپنی طبیعت کی جولانی انہیں اس محکمہ کی ملازمت سے متنفر کر گئی۔ بعد کو وہ یونائٹڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ سے منسلک ہو کر انشورنس کا کاروبار کرنے لگے۔ دلجمعی، محنت اور خلوص نیت سے وہ شدہ شدہ اسی کمپنی میں ضلعی منیجر ہو گئے۔ بعد میں اُن کی شادی ہوئی۔ اُنکی ایک دختر اور تین خورد سال لڑکے میاں رضوان سعید۔ میاں نعمان سعید اور میاں عمران سعید ہیں۔ میاں محمد سعید۔ نہایت حساس، خوش وضع اور سمجھدار فرد کنبہ ہیں۔ اور اپنے بہن بھائیوں کی طرح اپنے کنبہ کے مابین غایت درجہ ارتباط کے امین ہیں۔ وہ آج کل گوجرانوالہ میں یونائٹڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ کے ضلعی منیجر ہیں۔

میاں رسول بخش کے سب سے صغیر فرزند میاں حسین بخش تھے۔ جو

سال ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے - اُن کی تعلیم مڈل تک تھی - انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور عرائض نویس و اپیل نویس ضلع کچہری گجرات سے کیا۔ وہ اپنے دیگر بھائیوں اور نامور والد کی طرح خوش خُلق اور جمیل تھے وہ دیانت - حق پرستی - صاف گوئی کے پیکر تھے ۔ اور محنت کی روزی کمانے میں یقین رکھتے تھے ۔ اُنکی شادی سال ۱۸۷۶ء کے دوران حوالدار جانی خان کی صاحبزادی سے ہوئی - جو انتہائی قبول صورت، سلیقہ شعار اور خدا یاد خاتون تھیں - میاں حسین بخش کسبِ حلال سے اپنے واحد فرزند میاں محمد سردار خان اور اپنی تین دختران کی کفالت میں زندگی بھر مصروف رہے - اُن کے ہاں باقاعدگی سے گیارھویں شریف کا ختم ہر ماہ بپا ہوتا اور وعظ - نعت خوانی اور درود و سلام کی محفلیں منعقد ہوتیں - میاں حسین بخش پابندِ صوم و صلوٰۃ - متقی - اور دین دار بزرگ تھے - وہ خاص اہتمام سے نمازِ تہجد ادا کیا کرتے - علی الصباح تلاوتِ قرآن پاک اُن کا روز کا معمول تھا - حاجی محمد الدین کی مسجد حاجی صاحب واقعہ علاقہ گڑھی شاہدولہ میں نماز کی ادائیگی کے لئے حاضری دیتے - اسی مسجد کے انتظامی اُمور میں حاجی صاحب مذکور کے وہ دستِ راست سمجھے جاتے تھے - مسجد سے متعلق فقراء - درویش - حصولِ علم کے طالب علموں اور دیگر دین دار افراد کی خدمت دل و جان سے کیا کرتے - اپنے صاحبزادے میاں محمد سردار خان کی پرورش انہوں نے نہایت اہتمام سے کی - اور انہیں میٹرک تک تعلیم دلوائی - اپنی زندگی بھر اپنے مختصر سے کنبہ کی کفالت بطریقِ احسن سرانجام فرمائی - وہ مذہبِ اسلام کی تعلیمات سے اس گونہ متاثر تھے کہ اُس دور میں بچیوں کی مذہبی اور علوم مشرقی کی

تعلیم کی اہمیت کا احساس اُن کے رگ و پے میں پوری طرح سے جاگزین تھا۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اپنی بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم سے بہرہ ور کرایا۔ وہاں گھر پر ہی انگریز پادری عورتوں کی وساطت سے اُردو کی تعلیم بھی دلوائی تاکہ اُنکی لڑکیاں تحریر خط و کتابت کے علاوہ گھریلو آمدن و خرچ کا حساب بھی رکھ سکیں۔

انہوں نے اپنی سب سے بڑی صاحبزادی کی شادی اپنے حقیقی بھائی میاں مراد علی کے صاحبزادے میاں محمد افضل سے کی۔ لیکن یہ صاحبزادی شادی کے ایک سال کے اندر ہی وفات پا گئی۔ دوسری بچی کی شادی مسجد حاجی صاحب میں ایک درویش طالب علم چوہدری علی محمد جٹ ڈھول سکنہ موضع ڈھول خورد تحصیل و ضلع گجرات سے محض خدا ترسی کی بُنیاد پر کر دی۔ اور زندگی بھر اس لڑکی اور اُس کی اولاد کی تربیت اور خدمت میں لگے رہے۔ اپنی تیسری دختر کی شادی اُنہوں نے اپنے حقیقی بھانجے میاں محمد اقبال بنی سے کر دی۔

اگرچہ میاں حسین بخش نے اولاد کی دلجوئی اور خدمت کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی تاہم وہ عشق رسولؐ میں مکمل طور پا غرق رہے۔ کسب معاش کے علاوہ ہمہ وقت ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ خیرات اور صلہ رحمی میں وہ نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ خاندانی جھگڑوں سے پہلو تہی اختیار کرتے۔ اگر کوئی اُنہیں کچھ کہہ سُن بھی لیتا تو خاموشی اختیار کرتے۔ اُن کی زبان سے کسی کے حق میں بددعا یا گالی گلوچ نہیں سُنی گئی۔ وہ سفید ریش متشرع بزرگ تھے۔ اور اپنے حلقۂ ارباب میں بالخصوص اور شہر میں بالعموم نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ دینی مجالس کی جان تھے۔

منگرال خاندان کا یہ صوفی منش بزرگ ۱۲، جون ۱۹۳۲ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اور مسجد حاجی صاحب واقعہ گڑھی شاہدولہ کے احاطہ میں سپردِ خاک ہُوا۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

میاں حسین بخش کے واحد فرزند میاں محمد سردار خان سال ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اور اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور گرداور قانون گوئی کیا۔ بندوبستی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے ضلع میانوالی میں بھجوائے گئے۔ لیکن بوجہ اکلوتے فرزند ہونے اور والدین کے لاڈ پیار کی بنا پر کام میں جی نہ لگا سکے اور ملازمت چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ یہاں آکر اُنہوں نے اپنی جوانی کا آغاز ایک نئے تجربہ سے کیا۔ ابھی تک اس خاندان میں نیلام جائیداد کا کام کسی نے بھی نہ کیا تھا۔ اور اُس دَور میں گجرات میں خرید و فروخت جائیداد کا کاروبار چند ایک پیشہ ور دلالوں کے ہاتھ میں تھا میاں صاحب نے اپنی تعلیم سے استفادہ کرتے ہوئے اُس میں جدّت پیدا کی۔ طبیعت کی موزونیت۔ نُدرت اور انداز بیان کے اچھوتے پن سے اُنہوں نے پراپیگنڈہ کا انوکھا اسلوب اختیار کیا۔ وہ اپنے اشتہار نیلام میں ملکی اور غیر ملکی سیاست۔ منفرد حالات اور مقامی کوائف پر سیر حاصل تبصرہ کرتے اور نفسِ مضمون کو اس طرح خرید و فروخت کے اسلوب میں ڈھالتے کہ جہاں کہیں اُن کے اشتہار چسپاں کئے جاتے ناظرین کو اُنہیں پڑھے بغیر گزر جانا ناممکن ہوتا۔ اس طرح ایک طرف تو وہ ہر کہ و مہ سے اپنے ادبی اور معلوماتی استعداد کی داد حاصل کرتے اور دوسری طرف خریداروں کا رجحان جن کی اکثریت اہلِ علم میں سے ہوا کرتی اپنی

طرف مبذول کرانے میں کامیابی سے ہمکنار ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس جدتِ تحریر سے وہ اپنے کاروبار میں بہت کامیاب ہوئے۔ اور اس طرح نیلام کنندگان میں صفِ اوّل کا مقام حاصل کر گئے۔ اُن کی شادی سال ۱۹۱۰ء میں بابو خواجہ نور الٰہی سکنہ روڑس ضلع سیالکوٹ کی دخترِ نیک اختر سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک ہی دختر تولد ہوئی۔ بعد میں میاں بیوی کے مابین خوشگوار تعلقات کے فقدان سے میاں صاحب نے گھریلو زندگی میں دلچسپی لینا کم کر دی

میاں محمد سردار خان کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ سال ۱۹۳۰ء میں اپنے تایا زاد برادر میاں محمد اشرف کی معیت میں کوٹلی منگرالان (ریاست جموں و کشمیر) جا پہنچے اور ہر دو برادران نے اپنے گجرات کے شجرہ نسب کا الحاق اپنے اسلاف تک کروا کر وہاں کے منگرال قوم کے بزرگوں اور اُن کے مورثِ اعلیٰ تک کی تصدیق موجود منگرال اکابرین اور تحصیلدار کوٹلی سے کروائی چنانچہ اسی شجرۂ نسب کو بنیاد قرار دے کر مؤلف کے لیے تا حال شجرۂ نسب قوم منگرال راجپوت گجرات کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ اور ان بزرگوں کی یہی ابتدائی تحریک اس کتاب کی تحریر کی بھی محرک بنی۔

میاں محمد سردار خان شہر کی ادبی۔ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصّہ لیا کرتے تھے۔ وہ ہر طبقۂ فکر میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ خوش وضع۔ خوش خوراک اور خوش پوشاک آدمی تھے۔ والد کی موجودگی میں اور اُن کے بعد بھی روپے پیسے کی اُن کی سیر چشمی نے کبھی قدر نہ کی۔ چونکہ اُن کے ہاں کوئی لڑکا تولّد نہ ہوا تھا۔ اور اپنی زوجہ اوّل سے بھی ازدواجی تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اس لئے رشتہ داروں اور احباب میں جس کسی کی اولاد کو دیکھتے اُسے شفقتِ پدری سے نوازتے۔ فرزند کی فطری تمنا نے اُنہیں
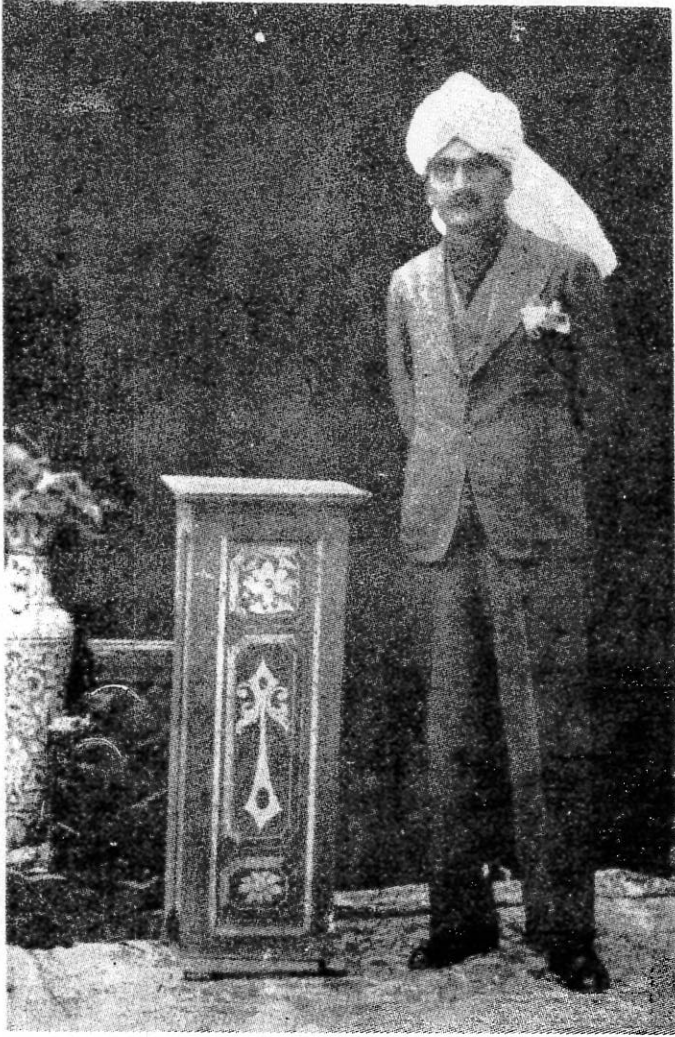
میاں محمد سردار خاں صاحب

عقدِ ثانی کرنے کی ترغیب دی۔ اُن کے خدا رسیدہ والد میاں حسین بخش اُنہیں کسی پہلو بھی دوسری شادی کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کیونکہ اُن کی نظر میں ایک سلیقہ شعار۔ فرشتہ سیرت اور باعفت بہو کی موجودگی میں جبکہ خداوندِ قدوس نے اُسی کے بطن سے میاں محمد سردار خان کو ایک دختر بھی عطا کر رکھی ہے۔ مایوس ہونا کسی طرح بھی مستحسن نہیں تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قضائے الٰہی سے میاں حسین بخش مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ یہ جون ۱۹۳۲ء کا موسم گرما تھا۔ میاں محمد سردار خان کا ان ایام میں یہی معمول رہا کہ وہ اپنے بیمار باپ کو ہر شام گود میں اُٹھا کر اُوپر چھت پر لے جاتے اور اگلی صبح اُنہیں نیچے کمرہ میں اُٹھا لاتے۔ ایک شام وہ اپنے والد بزرگوار کو اُوپر چھت پر چارپائی پر ڈالتے ہوئے فرطِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ راہ رو راہ فنا سِن رسیدہ والد نے انتہائی اضطراب میں اس گریہ کی وجہ دریافت فرمائی۔ تو میاں صاحب نے آبدیدہ ہو کر عرض کی کہ میاں جی میں نے تو بیماری کی اس حالت میں آپ کو سنبھالا دینے کیلئے نچلی منزل سے اُوپر اور اُوپر سے نیچے کمرہ میں اُٹھا کر بستر پر لا ڈالا لیکن یہ سوچ کر کہ مجھے میرے آخری ایام میں کون سہارا دے گا۔ مجھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اور میرے آنسو بہہ نکلے۔ بیٹے کی یہ کرب ناک توضیح پر مرنے والے کی حالت غیر ہو گئی اور اسی کیفیت میں فرمایا "میرے لختِ جگر میں تجھے بخوشی دوسری شادی کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ تو اب اپنی مرضی میں آزاد ہے"۔ اپنے والد کی وفات کے قریباً ایک سال بعد میاں محمد سردار خان سے دوسری شادی کی اس منکوحہ کے بطن سے اُن کے ہاں پہلا فرزند میاں حامد حسین تولد ہوا۔ ابھی میاں محمد سردار خان اس انعامِ خداوندی کا پورے طور پر شکریہ بھی ادا نہ کرنے پائے تھے کہ اپنی پیدائش

کے ایک سال کے عرصہ میں ہی یہ فرزند اُنھیں داغِ مفارقت دیتا ہوا راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

اس لڑکے کی وفات کے بعد میاں محمد سردار خان اکثر مغموم رہتے اور خوش دلی سے اپنے کام کی طرف بھی توجہ منعطف نہ کر سکتے۔ بعد میں خداوند قدوس نے اسی زوجہ ثانی سے اُنھیں ایک دُختر اور پھر ایک فرزند میاں خالد سردار عطا فرمایا۔ اب میاں محمد سردار خان نے پھر ایک نئے ولولے سے زندگی کی تگ و دو میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اس دوران میں اُن کی پہلی منکوحہ بھی بدستور سابق اُنھی کے پاس اقامت گزین رہی۔ دن گزرتے گئے اس کے کچھ عرصہ بعد میاں صاحب کی زوجہ ثانی اپنے بچوں سمیت اپنی والدہ بھائی اور ہمشیرہ کے پاس لاہور گئی اور باوجود متعدد بار میاں صاحب کی ہدایت اور کاوش واپس گجرات نہ آئیں۔ اس پر میاں محمد سردار خان نے تیسرا عقد میاں محمد الدین کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سے کیا جن کے بطن سے دو دختران کے علاوہ ایک فرزند میاں حامد سردار تولد ہوئے۔ چنانچہ اس طرح میاں صاحب کے صوفی منش والد کی دعا اپنے پسر کے صاحبِ اولاد ہونے اور پھولنے پھلنے کے بارہ میں قبول ہو گئی۔ بعد میں اُن کی زوجہ ثانی بھی بچوں کو لے کر واپس گجرات آ گئی۔

میاں محمد سردار خان نے اپنی سب سے بڑی صاحبزادی کی شادی اپنی ہمشیرہ کے بڑے لڑکے میجر محمد لطیف سے کی اور اس زمانہ میں نہایت ہی شاندار طریقہ سے رخصتی کی گئی۔ اپنی زندگی بھر عیش و آرام سے گزر بسر کرنے کے بعد میاں محمد سردار خان نے ۱۷ فروری ۱۹۵۱ء کو داعیٔ اجل کو اس طرح لبیک کہا کہ اُن کے سوگواروں میں تین بیوگان۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے میاں

خالد سردار اور میاں حامد سردار تھے۔ اُن کی زوجۂ اوّل کا بھی اُن کے بعد سال ۱۹۷۰ء میں اپنے میکے میں انتقال ہو گیا۔ اور وہ موضع روڈس میں اپنے آبائی خاندان کے قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

میاں محمد سردار خان کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں خالد سردار ۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اوّلاً نور کمپنی بیرون انار کلی میں شراکت کی اور متعدد کتب کے ناشر بنے۔ ادبی ذوق اُنہوں نے اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔ وہ سلجھی ہوئی طبیعت کے حساس نوجوان ہیں۔ زندگی میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ اُس کی سیمابی کیفیت کی غماز ہے۔ اُنہیں اپنے والد کی طرف سے صلہ رحمی اور خلوص ورثہ میں ملا ہے۔ اُن کی ہمشیرہ کی شادی راجہ محمد نواز سے ہو چکی ہے۔ جو شروع سے ہی اپنے سسرال والوں کی کفالت میں ہیں۔ میاں خالد سردار نے زندگی بھر اپنے بہنوئی کا ساتھ دیا ہے۔ اور اُن کی اولاد کے لئے ایک شفیق ماموں کا دائمی کردار ادا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اُنہوں نے نور کمپنی سے علیحدگی اختیار کر کے بیرون ملک جانے کا ارادہ کرتے ہوئے ایران کا رخ کیا۔ وہاں ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر کی رفاقت میں بطور ڈرامہ آرٹسٹ زاہدان کے ریڈیو اسٹیشن سے متعدد اردو ڈراموں میں حصہ لے کر اپنی قابلیت کے جوہر منوائے۔ اور اپنے میں ایک چھپے ہوئے فنکار کو بیرون ملک تلاش کیا۔ چند سال ایران میں بسر کرنے کے بعد گھر والوں کی چاہت اور وطنِ عزیز کی محبت اُنہیں لاہور کھینچ لائی۔ کیونکہ اُنہی کے مطابق ؎

آج کل دکن میں ہے گرچہ بڑی قدرِ سخن　　کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

لیکن اُفتادِ طبیعت یا پاؤں کا چکر کہئے کہ پھر صحرا نوردی کا شوق غالب آیا۔ اور اس بار قدیم دیوتاؤں کی نگری یونان کا قصد کیا۔ عنفوانِ شباب میں دنیا دیکھنے کا شوق اُنہیں یونان کی کینیڈا شپ کمپنی میں کھینچ لے گیا۔ اور یوں کئی مغربی ممالک کی سیر و تفریح کے علاوہ قوتِ لایموت کی نعمت ہاتھ لگی۔ کئی سال بعد اندوختہ کے ساتھ واپس لاہور آئے۔ تو اس بار مرغبانی کا شوق چرایا۔ کوٹ لکھپت کے نواح میں کچھ اراضی حاصل کی اور اپنے بہنوئی کو اس کام کی افادیت کا قائل کر کے ساتھ ملایا لیکن اسی دوران میں طبیعت باہر جانے پر پھر مچل، گئی ؎

ارادے باندھتا ہوں توڑتا ہوں جوڑ لیتا ہوں

گویا میاں صاحب اپنی سیمابی طبیعت کے ہاتھوں مجبور سب کچھ چھوڑ چھاڑ پردیس سدھار گئے۔ اور آج کل مغربی ممالک میں کسی شپنگ کمپنی کے ملازم کی حیثیت میں پاکستانی کولمبس بنے ہوئے زندگی کی نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ میاں خالد سردار حال ہی میں اندواجی زندگی کے بندھن میں گرفتار ہوئے ہیں۔

میاں محمد سردار خاں کے دوسرے صاحبزادے میاں حامد سردار اپنے والد کی تیسری منکوحہ کے بطن سے ہیں۔ اور ۲۲ مئی ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایف۔ اے تک مکمل کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور جونئر کلرک سٹیٹ بنک آف پاکستان لاہور سے کیا۔ وہ نہایت درجہ خوددار۔ ذہین۔ معاملہ فہم۔ محنتی اور خود شناس نوجوان ہیں۔ طبیعت میں ٹھہراؤ۔ اپنے کام سے کام۔ اور اپنے ہی افرادِ

کنبہ سے صلہ رحمی اُن کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ اپنی مختصر سی دنیا میں مگن پورے جوش و ولولے سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی محنت اور جذبۂ صادق سے ترقی یاب ہو کر آج کل سینئر کلرک سٹیٹ بنک لاہور میں کارِ سرکار سرانجام دے رہے ہیں۔ اُن کی شادی شیخ محمد اقبال صدر واصلباقی نویس گجرات (ریٹائرڈ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے علاوہ دو بچیوں کے دو پسران میاں فرحان حامد اور میاں ذیشان حامد تولّد ہوئے۔ دختر اوّل اور میاں ذیشان حامد تو والدین کو گودی میں ہی داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ جبکہ میاں فرحان حامد عہدِ طفلی میں ہیں۔ سال ۱۹۷۶ء میں پیدا شدہ اُن کی نومولود بچی ابھی ماں کی گود میں ہے۔ اُن کا مشترکہ واحد جدّی مکان محلّہ چاکسوالاں گجرات میں ہے۔ یہ مکان میاں حسین بخش کے وصیت نامہ[1] محررہ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۲۹ء کی رُو سے ½ حصہ میاں محمد سردار خان اور ½ حصہ میاں حسین بخش کی دو دختران کے نام پر ہبہ ہوا

---

[1] اصل وصیت نامہ قلمی میاں حسین بخش مؤلف کی تحویل میں ہے۔

باب دہم

# میاں محمد اعظم کے فرزندِ ثانی میاں نور و خاں اور اُن کے ورثاء

رائے عبدالحکیم کے فرزند میاں محمد اعظم کے دوسرے صاحبزادے میاں نورو خاں شاہی چابکسوار تھے۔ جن کا تفصیلی ذکر باب ہفتم میں اُن کے بھائی میاں رسول بخش کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ میاں نورو خاں کی پہلی زوجہ سے ان کے ہاں واحد پسر میاں الٰہی بخش تولّد ہوئے۔ یہ زوجہ وفات پا گئیں۔ چنانچہ میاں صاحب نے عقدِ ثانی کیا۔ دوسری زوجہ سے علاوہ چار دختران تین فرزند میاں محمد بخش۔ میاں نبی بخش اور میاں گیلانی بخش تولّد ہوئے۔ لیکن ہر دو ازواج کی اولادوں میں کبھی بھی سوتیلے پن کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔ بلکہ اس خاندان کے تمام بزرگوں کی کیفیت کچھ اس قسم کی رہی ہے۔ کہ وہ خود کو دوسرے افرادِ کنبہ و خاندان میں گم کر کے وحدتِ فکر و عمل کا احساس اجاگر کرتے۔ میاں محمد اعظم کے پسران اگرچہ محلہ چابکسواران میں علیحدہ علیحدہ رہائش گاہ میں قیام پذیر تھے۔ پھر بھی انہوں نے ایک دوسرے کے مکان میں اس طرح دروازوں کے ذریعہ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ کہ کسی نو وارد اور مہمان کو یہ علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ ان مکانوں میں مختلف کنبے علیحدہ علیحدہ قیام پذیر ہیں۔ اگر ایک بھائی کا مہمان کبھی بے وقت بھی آ جاتا تو تمام گھروں کا پکوان اُس بھائی کے دسترخوان پر جمع ہو جاتا۔

اور مہمان یہ تاثر لے کر جاتا کہ صاحب خانہ وسیع دستر خوان کا حامل ہے جہاں مختلف مشروبات اور نعمتوں سے اُس کی پذیرائی ہوتی۔ اتفاق باہمی کی برکات سے اپنے وقت میں اس خاندان کی توقیر اور ہیبت تمام شہر پر قائم تھی۔ محلہ چابکسواراں کی یہ مسلم آبادی گردو نواح کی ہندو آبادی میں گھری ہوئی تھی۔ محلہ کے داخلے کے عین مقابل رائے گنیش داس کی سر بفلک عمارت تھی۔ اور اس کے مغربی جانب شریمتی رام پیاری کی اقامت گاہ تھی۔ رائے کیدارناتھ بھی اسی آبادی میں مقیم تھے۔ بعدہٗ یہ ہندو رؤسا فصیل شہر کی بجائے سرکلر روڈ بیرون کابلی دروازہ اور پرانی جیل کے پاس اپنے اپنے محلات میں چلے گئے لیکن میاں رسول بخش اور میاں نور خان کے عہد میں باوجود اسی آبادی میں مقیم ہونے کے وہ محلہ چابکسواراں کے ان معزز مکینوں کی دل وجان سے عزت و احترام کرتے تھے۔ اور اُن کے رعب و دبدبہ سے پوری طرح مرعوب تھے۔ دیوالی اور دسہرہ کے ہندو تہواروں کے موقعہ پر چینی کے کھلونے اور مٹھائیاں میاں صاحبان کی نذر کی جاتیں اور ہندوؤں کے بیاہ شادیوں کے موقعہ پر مصری کے کوزے اور چینی کی روٹیاں جنکو "کندوڑے" کہا کرتے اس کنبہ کو بطور خاص بھجوائے جاتے۔ اس طرح اُس دور میں راجپوت منگرال خاندان کی برتری تمام شہر میں مانی جاتی تھی۔

میاں نور خان اس لحاظ سے بھی منفرد مقام کے حامل تھے۔ کہ سرکار دولتمداد کی طرف سے علاوہ جاگیردار ہونے کے مبلغ ۵۰ روپیہ ماہوار سکہ رائج وقت کی پنشن بھی انہیں ملتی تھی۔ اس سے اُن کی ضلعی انتظامیہ سے وابستگی بھی محتاج بیان نہیں ہے۔ افرادی قوت بھی شہر کے کسی دوسرے مسلم خاندان سے کم نہ تھی۔ رگوں میں گرم خون کی گردش۔ آسودگی،

عزت اور شہرت سبھی اُن کے افرادِ کنبہ کو حاصل تھی۔ شہر کے شرفاء اور رؤسا
میں اُن کا ایک الگ اور منفرد مقام تھا۔ صرف میاں نورو خاں کے خاندان
میں یا پھر رائے کیدار ناتھ کے والد کے ہاں ایک ایک گھوڑا گاڑی تھی شہر
میں کسی دوسرے خاندان کے پاس اس طرح کی فٹن یا ٹانگہ نہ تھی۔ ہر طرف
اُن کی امارت اور قیادت کی دھاک تھی۔ اپنے کامیاب دورِ حیات کے
اختتام پر میاں نورو خان نے ۲۹ راکتوبر ۱۸۷۷ء کو داعیٔ اجل کو
لبیک کہا ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

میاں نورو خان کے سب سے بڑے فرزند میاں الٰہی بخش نے
اوائلِ عمر ہی سے قرآنِ پاک کی تعلیم کے بعد پرائمری تک تعلیم حاصل
کی۔ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور پٹواری مال کیا۔ اپنی محنت
دیانت۔ کام کی لگن اور قابلیت سے جلد ہی بطور گرداور قانونگوی
ترقی یاب ہوئے۔ اُس دور میں اُن کی دیانت اور راسخ العقیدہ ہونے
کا یہ عالم تھا۔ کہ فرائضِ منصبی کے دوران اپنے گھوڑے کو خود باندھتے
اور کھولتے۔ اپنی گرہ سے ہی چارہ خرید کر اپنے فرائض منصبی کے دوران
گھوڑے کو کھلاتے۔ بطور ملازم سرکار کسی زمیندار۔ نمبردار۔ سفید پوش یا
ذیلدار کے مرہونِ منت نہ ہوتے۔ رزقِ حلال کے اکتساب کی سعی
میں لگے رہتے۔ کارِ سرکار کے ساتھ ساتھ نمازِ پنجگانہ اہتمام سے ادا کرتے
کسی سے زیادتی یا بے جا رعایت نہ برتتے۔ مخلوقِ خدا کی خدمت
میں لگے رہتے۔ وہ صوفی منش۔ ایثار پیشہ اور خدا رسیدہ بزرگ
تھے۔

ایک روایت کے مطابق انہیں حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی قطب ربانی پیران پیر کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اور عین حالت بیداری میں ہی اُن سے عرض مدعا کی سعادت نصیب ہوئی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ آپ اپنی سرکاری مصروفیات کے دوران اپنے حلقہ جلال پور جٹاں کے ایک گاؤں میں شب باش ہوئے۔ بعد از نماز عشاء حسبِ معمول ذکر و اذکار میں منہمک ہو گئے۔ اسی حالت میں قیام کے دوران اُن کی خواب گاہ کا بند دروازہ خود بخود وا ہو گیا۔ اور ایک بزرگ اندر تشریف لائے۔ اُنہوں نے میاں الٰہی بخش کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میاں صاحب اُن کی گمبھیرتی اور نورانیت سے مرعوب ہو کر اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیئے۔ اسی حالت میں اُنہوں نے دریائے چناب عبور کیا۔ اور چند سیڑھیاں اُتر کر ایک بہت بڑے دربار میں نورانی چہروں کے ہجوم میں جہاں وسط میں ایک نہایت ہی بزرگ ہستی مسند آرا تھی پہنچے اور اپنے راہبر کی ہدایت پر ایک کونہ میں فروکش ہوئے۔ تھوڑی دیر میں حاضرین نے یکے بعد دیگرے اُس بزرگ کی خدمت میں اپنی اپنی گذارشات پیش کر کے مناسب احکام حاصل کئے۔ یہاں میاں صاحب پر انکشاف ہوا کہ وہ پیران پیر کے دربار میں حاضر ہیں۔ چنانچہ اپنی باری پر میاں صاحب کی بھی پذیرائی ہوئی۔ دفعتہً اُنہیں یاد آیا کہ ایک بے سہارا بیوہ نے اُن کی خدمت میں اپنے واحد پسر کے تبادلہ کے لیئے دُعا کی درخواست کی تھی۔ کیونکہ

---

لے پمفلٹ چشمہ فیضاتِ روحانی الموسومہ ہدیہ یوسف۔ گجراتی
مرتبہ ملک گوہر الرحمٰن قادری یوسفی

اُس کا لڑکا اُس کی جائے سکونت سے بہت دور تعینات تھا۔ اور اپنی بیوہ ماں کی خبرگیری سے قاصر تھا۔ چنانچہ میاں صاحب نے اُسی بیوہ کی درخواست حضرت خواجہ کی خدمت میں دہرا کر عرض کی کہ اس بارہ میں اُس کی امداد فرمائی جائے۔ میاں صاحب کی عرض داشت کی سماعت کے بعد یہ دربار ختم ہو گیا۔ اور میاں صاحب اپنے راہبر کے ساتھ واپس اپنی جائے سکونت پر لوٹ آئے۔ اگلے چند دن بعد میاں صاحب کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ جبکہ انہوں نے اس بیوہ کو اپنی خدمت میں شکریہ کے لیے حاضر پایا اور اسے یہ بیان کرتے سنا کہ اللہ کریم نے آپ کی دعا قبول فرمالی ہے۔ اور میرا لڑکا تبدیل ہو کر میرے بہت ہی قریب آ گیا ہے۔

میاں الٰہی بخش نے اپنی تمام عمر سادگی۔ کفایت شعاری، خدمت خلق اور خدا ترسی میں بسر کی۔ اُنہوں نے صرف ایک شادی کی، جس سے اُن کے ہاں ایک دختر اور ایک فرزند میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین سال ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۷۹ ہجری میں تولد ہوئے۔ اپنے والد کے واحد پسر ہونے کی بنا پر شفیق اور دین دار والد نے اُن کی تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ اُن کا پہلا نام میر باز رکھا گیا تھا۔ بعد میں اُن کا نام تبدیل کر کے میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین رکھا گیا۔ وہ اپنے بچپن ہی سے اسلامی تعلیمات کی طرف راغب تھے۔ اُنہوں نے چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک کی تعلیم مکمل کر لی۔ گھریلو مذہبی ماحول نے اُنہیں سلیم الطبع۔ کم گو۔ راست گفتار اور قناعت شعار انسان بننے میں خاصی مدد دی۔ سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ حدیث۔ فقہ اور قوانین شریعت اسلامیہ میں خاصی دسترس حاصل کر چکے تھے۔ حسنِ صورت و حسنِ سیرت اُنہوں نے اپنے والد گرامی

سے ورثہ میں پایا تھا۔ رزقِ حلال سے اُن کی پرورش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اُن کی مذہب سے لگن نے صرف نو سال کی عمر میں اُنہیں سرورِ دو عالم خاتم الانبیاء صلعم کے دیدار کی سعادت سے مشرف کیا اور ایک روایت[1] کے مطابق حضور صلعم نے اُن کے دائیں رُخسار پر بوسہ دیا، جس کی برکات بعدہٗ میاں صاحب کی زندگی بھر اِس قدر حقیر رخسار کی چمک کی صورت میں آشکار اور ہویدا تھیں۔ میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کا علم معرفتِ الٰہی میں انہماک اور استغراق جواں سالی سے عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ اور اس ریاضت کے طفیل اُن کے حلقۂ اثر میں معتقدین کا ایک جمِ غفیر شامل ہوتا۔ کیوں نہ ہو ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است

اٹھارہ سال کی عمر میں مشفق والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑی والدہ اور والدہ کے مکان واقع محلہ چابکسواراں کی موجودگی میں میاں صاحب کو قوت لایموت کی چنداں فکر نہ تھی۔ جلد ہی اُن کی شادی میاں نور بخش کی صاحبزادی سے ہو گئی۔ لیکن میاں صاحب کی دینی مصروفیات کے معیار پر یہ خاتون پوری نہ اُتریں اور اس طرح میاں صاحب نے طلاق دے کر اُن سے خلاصی حاصل کر لی۔ لیکن اس کی اُنہیں بہت بڑی قیمت بھی ادا کرنا پڑی کیونکہ اس زوجہ کے بھائی سے میاں صاحب کی واحد خدا رسیدہ ہمشیرہ بھی وٹہ کے طور پر بیاہی گئی تھیں۔ اُن کو بھی اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر

---

[1] پمفلٹ چشمۂ فیوضاتِ روحانی الموسومہ ہدیہ یوسف گجراتی مرتبہ ملک محمد عبدالرحمن قادری یوسفی

ان کی یہ خوبرو۔ زاہدہ۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور متقی ہمشیرہ تاحیات میاں صاحب کے گھر پر اُن کی آنکھوں کے سامنے درد و کرب کی تصویر بنی قیام پذیر رہی۔ میاں صاحب اب دنیاوی جھنجھٹ سے مادی پیر کامل کی جستجو میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ مسلسل آستانۂ عالیہ سلطان المشائخ حضرت سلطان باہوؒ کے علاوہ دربار بابا فرید شکر گنج پاکپتن پر بھی حاضری دیتے اور چلہ کشی کرتے۔ گھر پر آتے تو لواحقین عقدِ ثانی کے لیے مجبور کرکے پابندِ سلاسل کرنے کی ٹوہ میں رہتے۔ چنانچہ چند سال بعد میاں صاحب کا عقدِ ثانی ہوگیا۔ لیکن اس ازدواجی زندگی پر بھی درویشی اور فقر غالب آیا۔ غرضیکہ اس زوجہ کو بھی بے توجگی کا شکار ہونا پڑا اور یوں اُسے بھی کچھ مدت کے بعد طلاق ہوگئی۔ اب میاں صاحب نے اپنے مکان واقعہ محلہ چابکسواران کو فروخت کر دیا اور خود آستانہ شیخ سلطان باہوؒ پر مستقلاً حاضری کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں اُن کی ملاقات شیخ کے ایک عقیدت مند حاجی محمد الدین صاحب سے ہوئی جو گجرات میں جامع مسجد حاجی صاحب واقعہ گڑھی شاہدولہ کے بانی اور منتظم تھے اور جہاں اُس زمانہ کے یگانہ روزگار فقراء اور اہلِ دین کا مجمع رُشد و ہدایت کے موتی لٹاتا اور خلقِ خدا کی دینی آسودگی کا سامان مہیا کرتا تھا۔ وہیں یہ ہر دو مریدانِ طریقت جلد ہی آپس میں گھل مل گئے۔ ایک دن میاں صاحب دربار سلطان باہوؒ میں عبادت میں مشغول تھے کہ اُن کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوئی جس نے عالمِ جذب میں میاں صاحب کو دربارِ قادریہ بٹالہ ضلع گورداسپور (بھارت) میں بخدمت شیخِ طریقت جناب سید ظہور الحسن قادری

فاضلی بہشتی کی تلقین کی۔ چنانچہ میاں صاحب فی الفور عازم بٹالہ ہو گئے اور حضرت شاہ صاحب کی خدمتِ عالیہ میں قدم بوس ہوئے شاہ صاحب نے اپنے مجاہدہ اور کشف سے اس صاحبِ سیرت اور ہونہار فرزندِ اسلام کی پرکھ کے بعد چند یوم میں ہی انہیں اپنا منظورِ نظر ٹھہرایا اور انہیں کلاہِ خلافت سے نوازا۔ فقراء دربارِ قادریہ نے سرگوشی اور دبی زبان میں احتجاج کرتے ہوئے اظہار کی کہ بندگانِ درگاہ سالہا سال سے اِس گدی سے وابستہ اور خوشہ چین رہے لیکن ایک نو وارد نوجوان آتے ہی گوئے سبقت لے گیا اور خلافت کے منصب پر سرفراز کر دیا گیا۔ حضرت شاہ صاحب تک بات پہنچی تو متبسم ہو کر فرمایا ہم نے تو خالص دودھ میں صرف دہی کی آمیزش کی ہے۔ گویا اُن کے پنجابی الفاظ میں "اساں تے خالص دُدھ نوں جاگ لگائی اے" کہ

اپنا اپنا نصیب ہے پیارے

اب مرشد کے فیضان سے میاں علاؤالدین نہ صرف اپنی مذہبی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ وہ علاؤالدین محمد یوسف محی الدین قادری بن چکے تھے۔ رشدہ رشدہ اُن کا اپنا حلقۂ ارادت پنجاب کے علاوہ صوبہ بلوچستان اور اس کے گرد و نواح میں پھیل چکا تھا۔ اپنے شیخ کی تعلیم سے جلا پا کر اُن کے احکام کی روشنی میں عامۃ المسلمین کی راہنمائی اور دینی تعلیم کے فروغ کے لیے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سفر اختیار فرمانے لگے۔ وہ زیادہ تر افریشیائی ممالک میں دورے کرتے اور گمراہ انسانیت کو اسلام کا شیدائی بنانے کے لیے تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں مصروف رہتے۔ گاہے

گاہے اپنے عزیز و اقارب سے ملنے گجرات بھی تشریف لاتے اور اُن کی موجودگی سے استفادہ کرتے ہوئے یہاں بھی کئی دینی مجالس برپا کی جاتیں۔ بالآخر اپنے مرشد کے وصال پر مستقلاً گجرات منتقل ہو گئے لیکن اُس گدی کی غلامی کا طوق اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے گلے میں قائم رکھا۔ یہاں مریدانِ باصفا نے اُن کے لیے قیام گاہ کا خاطر خواہ انتظام فرمایا اور گجرات کے شب و روز اُن کے دم قدم سے دینی مجالس کے انعقاد سے منور ہوتے گئے۔ رات کے پہلے حصہ میں ذکر و فکر اور دوسرے حصہ میں خاموشی سے استغراق اُن کا معمول تھا۔ رات کے تیسرے حصہ میں وعظ شروع کرتے اور سحر کر دیتے۔ حاضرین کمال ذوق و عقیدت سے رات بھر حاضر رہتے اپنی نجی مجالس میں وہ مکمل سکوت اور استغراق کے عالم میں بیٹھے رہتے اور کبھی کبھی مخمور نگاہوں سے حاضرین پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالتے اور پھر آنکھیں موند لیتے۔ اس دوران بوسہ گاہِ رسول رخسار دمکتا رہتا اور حاضرین کے لیے کچھ ایسا سماں بندھتا کہ:

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے

گجرات میں میاں علاؤالدین نے اپنے ایک مرید کی دوشیزہ سے تیسرا عقد کیا۔ جن کے بطن سے اُن کے ہاں ایک صاحبزادی اور دو فرزند میاں خورشید محی الدین اور میاں مبارک محی الدین تولد ہوئے۔ میاں علاؤالدین محمد یوسف محی الدین نے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۳ء بروز بدھوار بعمر [illegible] سال اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا اور مسجد بیگم پورہ واقعہ گڑھی شاہدولہ صاحب کے ملحق اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے اور

یوں اس ویران مسجد میں اُن کی تدفین سے پھر ذکرِ الٰہی کی تجدید ہوگئی۔ اسی طرح نمازِ پنجگانہ کے علاوہ جمعہ کے اجتماع کا بھی یہاں پر پورا اہتمام ہوگیا۔ ؎

مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند

میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کے فرزندِ اکبر میاں خورشید محی الدین ۶، اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ کنبہ کے پہلے نومولود ہونے کی بنا، پر اُن کی پرورش کا انتظام خاص اہتمام سے ہوا۔ اوائل سے اپنے خدا یاد باپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت اور اُن سے دینی اُمور سیکھنے کے علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کا حصول اور اس کا حفظ کرنا اُنہیں نصیب رہا۔ کلام الٰہی کی تعلیم اور کچھ سیپارے حفظ کرنے کے بعد میاں خورشید محی الدین کی دنیاوی تعلیم نصابی کا مرحلہ درپیش ہوا۔ ابھی اُنہوں نے مڈل تک ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ کہ والدِ بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مریدانِ باصفا نے انتہائی کوشش کی کہ میاں صاحب اپنے والد کی گدی سنبھالیں۔ لیکن جوان خون، اور دنیا کے نشیب و فراز کے بارہ میں ناپختہ کاری نے اُنہیں سلسلۂ پیری مریدی سے متنفر کر دیا۔ اُن کا محکم خیال تھا۔ کہ رزقِ حلال صرف اپنے دست و بازو سے کما کر کھانے کا ہی نام ہے۔ چنانچہ جہاں اُنہوں نے حفظِ قرآن کی مشق ادھوری چھوڑ دی وہاں نصابی تعلیم کو بھی خیرباد کہا اور رزق کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے گجرات پنجاب بس سروس میں بطور چیکر کچھ سال کام کیا۔ والد سے ورثہ میں ملا ہوا مکان دونوں بھائیوں کی ملکیت تھا۔ والدہ جوان بیوہ اور پھوپھی زاہدہ شب زندہ دار اس پر چھوٹے بھائی کی کفالت صرف جدّی مشترکہ اراضی سے مشکل تھی۔ میاں

خورشید محی الدین نے اپنے برادر خورد میاں مبارک محی الدین سے مکان کا معاملہ یوں طے کیا کہ اپنے حصہ کی جدی اراضی فروخت کر دی اور اپنے چھوٹے بھائی کا حصہ مکان باہمی طے شدہ قیمت کی ادائیگی کے بعد خود حاصل کر لیا۔ اس دوران میں اُن کی نیک نہاد اور خدا رسیدہ پھوپھی بھی فوت ہو گئیں۔ والدہ نے بٹالہ میں اپنے جلیل القدر خاوند کے پیر خانہ میں پناہ لی۔ اور میاں خورشید محی الدین اپنی زوجہ کے ہمراہ اپنے گھر میں مقیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے طبِ یونانی میں بساط بھر دسترس حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کی بیٹھک میں مطب قائم کیا۔ اور کافی عرصہ اہلِ محلہ اور مخلوقِ خدا کی خدمت گزاری کی۔ دو سال قبل اُنہوں نے یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ اور راولپنڈی میں نقلِ مکانی فرما کر ٹیکسی سروس قائم کرتے ہوئے اپنی ٹیکسیاں چلائیں۔ گجرات کا گھر فروخت کر دیا اور یوں وہ آج کل بطور ٹرانسپورٹر راولپنڈی سے منتقل ہو کر گوجرانوالہ شہر میں اقامت گزیں ہیں۔ اُن کی دو دختران اور دو فرزند میاں محمد عیاض اور میاں محمد فیاض ہیں۔

میاں خورشید محی الدین کے بڑے صاحبزادے میاں محمد عیاض سال ۱۹۳۶ء میں تولد ہوئے۔ اُنہوں نے میٹرک سال ۱۹۵۱ء میں پاس کیا اور اُس سے اگلے سال محکمہ ڈاک میں بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ آج کل وہ راولپنڈی میں متعین ہیں۔ میاں خورشید محی الدین کے چھوٹے فرزند میاں محمد فیاض ابھی پرائمری کلاس میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اور ہونہار بچے ہیں۔

میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کے دوسرے لڑکے میاں محمد مبارک محی الدین سب بچوں میں خورد سال تھے۔ وہ ۲۶ اکتوبر

۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے صغیر سنی میں ہی کلام پاک کی تلاوت مکمل کی۔ بچپنے میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ دینی تعلیم کے حصول کے بعد انہوں نے سکول میں داخلہ لیا۔ اور میٹرک پاس کرنے کے بعد ہیڈ پوسٹ آفس گجرات میں بطور جونیئر کلرک عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اگرچہ دینی مشاغل بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ لیکن مریدان اور حلقہ بگوشان آستانۂ یوسفیہ قادریہ نے انہیں اپنے نامور والد کی شمع فروزاں کو تھامنے اور سلسلۂ رشد و ہدایت کو جاری و ساری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اُس زمانہ میں مسجد بیگم پورہ جہاں اُن کے والدِ ماجد آسودۂ خاک تھے۔ آباد ہونے کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ مریدین نے ایک امام مسجد کا انتظام کر کے اپنے پیرِ طریقت کی روح کے ایصالِ ثواب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن ایک دینی مدرسہ کی ترویج اور سلسلۂ قادریہ و فاضلیہ کے کارناموں کی تشہیر کے لئے ایک جامع پروگرام کی تشکیل ضروری سمجھی گئی اور اس کے لئے خانوادۂ میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کی طرف ہی اُن کی نظرِ انتخاب منعطف ہوتی تھی۔ چنانچہ مریدین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میاں محمد مبارک محی الدین نے ملازمتِ سرکار کو خیرباد کہا اور مستقلاً مسجد بیگم پورہ میں اُٹھ آئے۔ چونکہ اپنا مکان اور حقیقہ جدی اراضی پہلے ہی فروخت کر چکے تھے۔ اور اب کوئی اندوختہ بھی نہ رکھتے تھے۔ انہیں مسجد سے ملحقہ ایک مکان اور حجرہ تعمیر کروا کے دیا گیا۔ اس کے بعد مسجد بیگم پورہ کی مرمت کا مرحلہ درپیش ہوا۔ مریدان اور حلقہ ارادت کی سعی سے مسجد کے غربی جانب گلی کی طرف دکانوں کی تعمیر کے علاوہ مسجد کے چاہ میں ٹیوب ویل کی تنصیب عمل میں لائی گئی۔ ملحقہ اراضی کی چار دیواری کھینچی گئی اور مسجد کی تزئین و آرائش کا کام بحسن و خوبی سرانجام

پذیر ہوا۔ یہ سب کام میاں محمد مبارک محیّ الدّین کی زیرِ نگرانی اور اُن کی صوابدید کے مطابق مکمل ہوا۔ چنانچہ میاں صاحب نے یہاں پر باقاعدہ ایک دینی درس گاہ کا اجراء فرمایا اور باقاعدگی سے نمازِ پنجگانہ اور نمازِ جمعہ کا اہتمام کیا۔ مسجد سے ملحقہ پلاٹ میں سایہ دار درختوں اور سبزہ اُگانے کی طرف توجہ دی گئی۔ اور اس جگہ کو عیدین کی نماز کے لئے ہموار کیا گیا۔ ہر سال اپنے والد کے عرس کے علاوہ اپنے قیامِ گجرات کے دوران میاں محمد مبارک محیّ الدین حاضرین اور معتقدین کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے ہیں۔ اُن کا دینی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عقائد کی پختگی، مستقل مزاجی تبلیغِ دین۔ درس و تدریس اُن کے مستقل مشاغل ہیں۔ اُن کو دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی میسر آ چکی ہے۔ نجی محفلوں میں اپنی روایتی بذلہ سنجی اور علومِ معرفت کی چاشنی کی آمیزش سے وہ سامعین کو مسرور و مسحور کر دیتے ہیں۔ دلائل و براہین میں متانتِ طبع اپنی جولانیاں دکھاتی ہے۔ اور یوں اُن کی نجی محفلیں زعفران زار بن جاتی ہیں۔ اپنی گھریلو زندگی میں وہ ایک اصول پسند خاوند۔ سخت گیر باپ۔ شفیق و مونس ساتھی۔ نظم و ضبط کا خوگر فرد ہیں۔ وہ اکثر افریشیائی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ اور اپنے والد کے تبلیغی مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شادی بابو مہتاب دین ڈار کی صاحبزادی سے ہو چکی ہے۔ جن کے بطن سے علاوہ چار دختران اُن کے دو پسران میاں سلامت محیّ الدین اور میاں راحت محیّ الدین بھی ہیں۔ اہلِ خاندان کی شادی اور غمی کی مجالس میں شمولیت کی حد تک اُن کے روابط مراسم محدود ہیں۔ اُن کے صاحبزادے میاں سلامت محیّ الدین، ۱۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو تولد ہوئے۔ آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ جبکہ اُن کے

دوسرے فرزند میاں راحت محی الدین سال ۱۹۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ آج کل وہ حفظ قرآن شریف کر رہے ہیں۔ اور دیگر امور میں ان کے معاون ہیں۔

میاں نمبردار خاں کی زوجہ ثانی سے اُن کے لڑکے میاں محمد بخش سال ۱۸۶۰ء میں تولد ہوئے۔ وہ قبول صورت اور ہونہار فرزند تھے۔ انہوں نے تعلیم مڈل تک حاصل کی۔ اور محکمہ مال میں بطور گرداور اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی محنت۔ دیانت اور خاندانی شرافت کے علاوہ حسن کارکردگی سے وہ بطور نائب تحصیلدار اور پھر تحصیلدار ترقی یاب ہوئے۔ وہ محکمہ مال کے ماہر افسر شمار ہوتے تھے۔ اُن کی شادی سال ۱۸۸۱ء میں فضل دین ڈار کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے ایک دختر اور ایک صاحبزادہ میاں محمد صادق سال ۱۸۸۲ء میں تولد ہوئے۔ انہوں نے اپنی صاحبزادی کی شادی نہایت ہی دھوم دھام سے میاں خیر دین کے صاحبزادے میاں نذر محمد صوبیدار سے کی۔ میاں محمد صادق ابھی زیر تعلیم ہی تھے۔ کہ اُن کے والد میاں محمد بخش رحلت فرما گئے۔ میاں محمد صادق نے مڈل تک تعلیم حاصل کی وہ سیدھے سادے تن آسان نوجوان تھے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور پٹواری مال کیا۔ چونکہ اپنی سادہ لوحی سے وہ فیلڈ میں کام کو نبھانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے انہیں دفتر صدر قانون گوی گجرات میں بطور محرر مال لے لیا گیا۔ یہاں انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ تک کام کیا۔ اسی دوران اُن کی شادی میاں نواب دین ڈار جلال پوری کی دختر سے ہو گئی۔ جن کے بطن سے علاوہ دو دختران دو لڑکے میاں محمد فاضل اور میاں محمد مقبول پیدا ہوئے۔ میاں محمد فاضل بچپنے میں اور میاں محمد مقبول دس بارہ سال کی

گھر میں داغِ مفارقت دے گئے۔ میاں محمد صادق کی دُختر کلاں کی شادی ماسٹر محمد رفیق ولد محمد حسین ڈار سے ہوئی۔ جبکہ اُن کی دُختر خورد کی شادی میاں محمد منظور الٰہی پسر خوبیدار نذر محمد سے ہوئی۔ میاں محمد صادق نے اپنی جدّی اراضی مرض الموت کے دوران اپنی دختر خورد کے نام ہبہ کردی۔ اور اس طرح عملی طور پر اپنی بڑی صاحبزادی کو جو اپنے خاوند کی عدم توجہگی کا شکار تھی۔ اس ذریعہ معاش سے بیگانہ کردیا۔ چنانچہ وہ اپنی ہمشیرہ خورد کے ہمراہ گزر بسر کرتی رہیں۔ اور اُن کی وفات کے بعد آج بھی اپنے والد کے جدّی مکان واقعہ محلہ چابکسواران میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ اور اپنے بہنوئی کی کفالت میں ہیں۔

میاں نور محمد نمبردار کے تیسرے صاحبزادے میاں نبی بخش ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۱ھ ہجری (سال ۱۸۳۲ء) کو پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے اینگلو ورنیکلر فائنل امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ اور ملازمت کا آغاز بطور گرداور قانونگوی ضلع گجرات سے کیا۔ وہ محنتی۔ معاملہ فہم۔ خوش خلق، مردم شناس اور بالغ نظر نوجوان تھے۔ جلد ہی اپنی محنت اور دیانت سے اُنہوں نے افسرانِ ضلع کے دل میں گھر کرلیا۔ اُن کی وجاہت۔ انتظامی صلاحیت۔ علمی استعداد۔ مہارت چابکسواری۔ قابلیت اور ماتحت عملہ سے کام حاصل کرنے کا ملکہ جلد ہی اُنہیں ترقی کی منازل سے ہمکنار کر گیا۔ اور وہ بطور صدر قانون گوئی ضلع گجرات ترقی یاب ہوئے۔ افسران سے خوشنودی مزاج کی سندات سے وقتاً فوقتاً سرفراز ہوتے رہے۔ ضلع گجرات کے بندوبست سال ۱۸۹۱/۱۸۹۲ء میں اُنہوں نے نہایت تندہی سے کام کیا۔ آخر اپنی سرگرم اور باصلاحیت ملازمت سے

میاں نبی بخش صاحب

۱۹۱۷ء میں باعزت سبکدوش ہو کر مبلغ ۴۰ روپے ماہوار پنشن پر گھر گئے۔ ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اکثر و بیشتر اپنی جدی اراضی واقعہ بانٹھ پر گھوڑے پر سوار تشریف لے جاتے اور اراضی کا انتظام و انصرام اپنی نگرانی میں کراتے۔ وہ اہلِ شہر میں بالعموم اور خواص میں بالخصوص بہت عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس دور میں جب کہ انگریزوں کی حکومت اپنے عروج پر تھی اور سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ میاں نبی بخش کی فراست اور دوراندیشی نے بچوں کی تعلیم کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کر لیا۔ اُن کی ازدواجی زندگی کا آغاز سال ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ جبکہ اُن کی شادی اپنے چچا میاں رسول بخش کی اکلوتی صاحبزادی سے ہو گئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین دختران پانچ فرزندان میاں مختار نبی۔ میاں گلزار نبی۔ میاں محمد نظیر الحسن، میاں اقبال نبی اور میاں محمد اقبال نبی تولد ہوئے۔ میاں نبی بخش نے بعمر ۹۸ سال ۳۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اپنی جدی اراضی واقعہ موضع بانٹھ میں مدفون ہوئے۔

میاں نبی بخش کے پہلوٹھی کے فرزند میاں مختار نبی ۱۷ مارچ ۱۸۸۶ء کو بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں سکول میں داخل کئے گئے سال ۱۹۰۱ء میں میٹرک کا امتحان اُنہوں نے امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ اُن کے والدِ گرامی چونکہ محکمہ مال سے اُس وقت بطور گرداور منسلک تھے۔ اس لئے اُنہوں نے بھی محکمہ مال کے کام میں پرائیویٹ طور پر خاصی مہارت پیدا کر لی۔ اور پٹوار کا امتحان کریڈٹ سے پاس کر لیا۔ اُس زمانہ میں حکومتِ ہند نے ملک کی زرعی حیثیت کے پیشِ نظر جبکہ اس کی

آمدنی کا سب سے مؤثر اور اہم ذریعہ مالیہ اراضی کی فراہمی تھا پہلی بار محکمہ زراعت
کی سرکاری طور پر تشکیل کی ۔ میاں نبی بخش نے جو جاگیردار اور ملازم سرکار ہونے
کے باوصف زرعی معیشت کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ از خود
ایک اہم فیصلہ کر لیا ۔ اور میاں مختار نبی کو پہلے کانپور میں زراعتی تعلیم
کے لیئے بھیجا ۔ بعد میں اُن کی درخواست برائے ملازمت بطور انسپکٹر محکمہ زراعت
بھجوادی ۔ جلد ہی انٹرویو کیلیئے دعوت نامہ مل گیا ۔ اب سب سے بڑا مرحلہ
اپنے محبوب اور چہیتے بیٹے کو والدہ کی رضامندی سے ساتھ لے کر ضلع گجرات
سے باہر جانے کا تھا ۔ چنانچہ میاں صاحب نے اپنی زوجہ کو بتایا کہ وہ اپنے
بیٹے کو سیر و تفریح کے لیئے لے جانا چاہتے ہیں ۔ اس لیئے اُس کے پارچات
اور بستر تیار کر دیئے جاویں ۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے بیٹے کے
ہمراہ عازم سفر ہوئے ۔ میاں مختار نبی نہایت ہونہار ۔ دراز قامت ۔ وجیہہ
اور خوش پوشاک نوجوان تھے ۔ اپنے والد گرامی کی معیت میں اپنی بھرپور
جوانی کو زندگی کی اعلیٰ اقدار سے روشناس کروا چکے تھے ۔ انٹرویو میں
سُرخرو ہوئے اور اُن کی پہلی تقرری بعد ابتدائی ٹریننگ برائے تدریس زرعی
ادارہ لائلپور میں ہوئی ۔ جہاں سے اُنھوں نے اپنی اعلیٰ علمی استعداد کی بناء پر
متعدد سندات اور نقرئی تمغے حاصل کیئے ۔ یہاں اپنے والد کے ساتھ آغاز
میں جانے کے بارہ میں ذیلی واقعہ باعث دلچسپی ہوگا ۔ جب میاں مختار نبی
کی رہائش اور دیگر ضروریات کے انتظامات کے بعد اُن کے والد میاں نبی بخش
واپس گجرات تشریف لے آئے تو اُن کی زوجہ نے اپنے بیٹے کو
معہ سامان اُن کے ساتھ نہ پایا ۔ چنانچہ کمال تفکّر سے اُس کی نسبت استفسار
فرمایا ۔ میاں نبی بخش نے صرف اتنا فرمایا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے ۔

میاں مختار نبی صاحب پی اے ایس
ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ زراعت

اور اس طرح کہہ سن کر میاں صاحب اپنے دفتر چلے گئے جب بعد دوپہر واپس گھر لوٹے تو ان کی بیگم کی کیفیت بدلی تھی۔ اپنے چھینتے جوان بیٹے کی عدم موجودگی سے وہ انتہائی پریشان خاطر تھیں۔ چنانچہ میاں نبی بخش نے انہیں تمام بات وضاحت سے بتادی اور انہیں تسلی دی کہ ان کے بچے کے مستقبل کیلئے اس نئے محکمہ میں ان کی تقرری ایک نیک فال تھی۔ اپنی ٹریننگ پوری کرنے اور لائلپور میں معلمی کے فرائض سرانجام دینے کے بعد میاں مختار نبی کو جو بطور انسپکٹر زراعت بھرتی ہوئے تھے۔ گورداسپور (حال بھارت) کے زراعتی فارم کا سال ۱۹۰۹ء میں منیجر لگایا گیا۔ والدہ اور والد اکثر ان کے ہاں آتے جاتے رہے۔ اس دوران میں ان کی شادی سیالکوٹ کی مشہور خواجہ فیملی کے خواجہ اللہ دیا (REGMENTAL MUNSHI) رجمنٹل منشی کی دختر سے ہوگئی۔ جن کے بطن سے صرف دو دختران ہی تولد ہوئیں۔ میاں مختار نبی نے ان دونوں ہونہار بچیوں کی اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم و تربیت کی۔

میاں مختار نبی نے اپنی خداداد قابلیت۔ محنت۔ فراست۔ دیانت اور حسن کارکردگی سے جلد ہی مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۱۵ء کو بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ زراعت ترقی پائی اور اس حیثیت سے دہلی۔ جالندھر۔ گورداسپور۔ ہانسی۔ گوڑگاؤں (بھارت)۔ منٹگمری (حال ساہیوال) اور راولپنڈی میں تعینات رہے۔ اس دور میں تین یا چار اضلاع ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی نگرانی میں ہوا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اب ہر ضلع کے لئے علیحدہ ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر زراعت مقرر کیا گیا ہے۔ میاں مختار نبی صاحب الرائے اور نڈر افسر شمار کئے جاتے تھے اور انتہائی

بیباکی سے اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ لیکن ماسوائے رسمی محفلوں یا دوست احباب کے تبادلوں کے دوران الوداعی اشعار کہا کرتے۔ مسٹر ایف۔ ایل برین ڈپٹی کمشنر کی زیر قیادت ضلع گوڑگانواں میں اُنہوں نے دیہات سدھار میں نمایاں کام کیا۔ اس کام میں وہ اُن کے دستِ راست شمار ہوتے تھے۔ وہ زرعی ڈراموں میں بادشاہ کا کردار کیا کرتے تھے۔

اپنی انتظامی استعداد۔ نظم وضبط کی مہارت۔ قابلیت اور دیگر اوصاف حمیدہ کے پیشِ نظر اُنہیں اوّلاً ۱۷ دسمبر ۱۹۲۳ء کو عارضی طور پر ایگریکلچر سروس (کلاس وَن) میں ترقی دیکر ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ زراعت لگایا گیا۔ بعدہٗ وہ سال ۱۹۴۰ء میں راولپنڈی اور جالندھر ڈویژن میں مستقلاً ڈپٹی ڈائریکٹر تعینات رہے۔ اور سال ۱۹۴۲ء میں اسی عہدہ پر جالندھر سے ریٹائر ہوئے۔ وہ خاندان منگرال راجپوت کے پہلے اوّل درجہ کے سرکاری افسر تھے۔ اپنی تقرری بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے وقت سے وہ اپنی ذاتی کار کے مالک رہے

سال ۱۹۲۵ء میں شاہدرہ دروازہ کے باہر شاہدرہ روڈ پر ایک کنال اراضی میں اُنہوں نے دومنزلہ عمارت "مختار منزل" تعمیر کروائی جو اپنے وقت میں دیدنی عمارت تھی۔ اور یہیں پر اُنہوں نے پہلے اپنی بڑی صاحبزادی کی شادی شیخ محمد اکرم آئی۔ سی۔ ایس اور بعد میں اپنی دوسری صاحبزادی کی شادی سیّد رشید احمد ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سے کی۔ اُن کی زوجہ کی رحلت کے بعد اُن کی صاحبزادیوں نے جدی اراضی کے ساتھ ساتھ "مختار منزل" بھی فروخت کر دی ہے۔

میاں مختار نبی کا اپنے خاندان کی سماجی زندگی میں سب سے بڑا

اور انقلابی اقدام تعلیم نسواں کا فروغ تھا۔ چنانچہ اس کے لئے مخلوط تعلیم کا خطرہ مول لینا ایک جرأت مندانہ تجربہ تھا۔ جس میں وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اُن کی بڑی صاحبزادی خاندان کی پہلی گریجوایٹ خاتون تھیں۔ جبکہ اُن کی چھوٹی صاحبزادی پہلی ایم۔ اے خاتون جو حکومت کے وظیفہ پر دو سال برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے۔ کہ میاں مختار نبی ہی کی مساعی جلیلہ اور جرأت مندانہ اقدام سے قوم منگرال کی بچیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شعور پروان چڑھا۔ کیونکہ اُن سے پہلے خاندان کے کسی فرد کو بلکہ گجرات کی کسی فیملی کے سربراہ کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لئے اپنی بچیوں کو ضلع یا ملک سے باہر بھجوانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس دور میں لوگ عورت کی بے نقابی کو انتہائی معیوب خیال کرتے اور لڑکیوں کو درسگاہوں میں مخلوط تعلیم دلانا باعثِ ننگ وعار سمجھتے تھے۔ میاں صاحب خوب سمجھتے تھے۔ اور اکثر کہا بھی کرتے تھے کہ چند سال بعد اس تغیّر پذیر معاشرے میں طبقہ نسواں سے حجاب اور پردہ محض رسمی رہ جائے گا۔ اور لوگ بڑھ چڑھ کر تعلیم نسواں میں حصّہ لیا کریں گے۔

سچ ہے سہ

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

میاں مختار نبی اپنی عمر کے آخری سالوں میں باقاعدگی سے پابندِ صوم و صلوٰۃ رہے۔ وہ علی الصباح بعد از نمازِ فجر تلاوتِ کلامِ پاک فرماتے خاندان کے نوجوانوں کو برسرکار دبرسرروزگار دیکھنے کے ہمیشہ متمنی رہے اپنوں سے صلہ رحمی کرنا اُن کی زندگی کا نصب العین رہا۔ زکوٰۃ مال زندگی

ہو نکالتے رہے۔ طبعاً نیک دل اور صاف گو بزرگ تھے۔ اپنے رشتہ داروں میں دُور کے ایک بزرگ کی لڑکی کی پرورش بھی اُنہوں نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ سِنِ بلوغت کو پہنچنے پر اُس کا عقد خلیفہ شجاع الدین سپیکر پنجاب اسمبلی کے صاحبزادے خلیفہ علاؤ الدین سے بڑے دھوم دھام سے اپنی حقیقی بچیوں کی طرح کیا۔ اپنے بھائی اور برادر زادوں کی ہر مشکل میں کام آئے۔ غرضیکہ وہ بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں بیباکانہ اور بے لاگ ملازمت سرکار کے بعد وہ سال ۱۹۲۴ء میں ریٹائر ہو کر اپنی رہائش گاہ "مختار منزل" گجرات میں فروکش ہوئے۔ یہاں دوست احباب رشتہ داروں اور اہلِ غرض کا ایک مجمع اُن کی قیام گاہ پر موجود رہتا۔ اُنہوں نے یہاں پہنچتے ہی آفیسرز کلب کا ممبر بن کر اپنی شغلم کی مصروفیت کا اہتمام کر لیا تھا۔ اُس وقت کے جملہ حکام بشمول جناب بی ایس گریوال آئی۔ سی۔ ایس۔ ڈپٹی کمشنر گجرات اُن کے ہاں آتے جاتے اور یوں وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک معروف افسر کی طرح مقیم رہے اس دوران محکمہ سول سپلائز (جو بعد میں محکمہ خوراک میں تبدیل ہو گیا) کا انعقاد ہوا۔ اور حکومت نے اُن کو دوبارہ طلب کر کے بطور سول سپلائز آفیسر ضلع کیمبلپور مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے مہاراجہ جوناگڑھ نے اُنہیں بطور ڈائریکٹر زراعت اپنی ریاست میں تقرری کے لئے منتخب فرمایا۔ لیکن میاں صاحب نے قیام گجرات کو ہی ترجیح دی۔ سول سپلائز آفیسر کیمبلپور تعیناتی کے دوران وہ بیمار ہو گئے۔ اور اپنے داماد ایس۔ ایم۔ اکرام آئی سی۔ ایس کلکٹر شولاپور کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ماہ کے قیام کے بعد اُنہوں نے اپنی بیوی اور ہر دو صاحبزادیوں کی موجودگی میں ۲۳؍ اگست ۱۹۴۵ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی نعش بذریعہ

ٹرین صوبہ بمبئی سے گجرات (صوبہ پنجاب) لائی گئی اور قوم کا یہ گرانمایہ سپوت اپنی جدی جاگیر موضع بانٹھ میں اپنی والدہ اور والد کے پہلو میں سپردِ خاک ہُوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

میاں نبی بخش کے دوسرے صاحبزادے میاں گلزار نبی ۲۷ نومبر ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ متوازن قد اور تیکھے نقوش کے خوبصورت لڑکے تھے بچپن ہی سے گھوڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ گھر میں گھوڑے۔ گائے بھینس سبھی پال رکھے تھے۔ دودھ اور مکھن اُن کی خوراک کے اہم جزو تھے۔ پانچ سال کی عمر میں اُن کا داخلہ سکول میں ہوا۔ میٹرک پاس کر چکے تھے۔ کہ دفعتاً بیمار پڑ گئے۔ بخار نے طول پکڑا اور یوں مرض کی شدت سے انتہائی طور پر نقاہت کا شکار ہو گئے۔ والد اُس زمانہ میں گجرات میں ہی مقیم تھے۔ اُنہوں نے بہترین معالج سے استفادہ کیا لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ اور منگرال خاندان کا یہ ہونہار فرزند ۱۳ مارچ ۱۹۰۶ء کو بعمر قریباً سوا سولہ سال والدین کو داغِ مفارقت دے گیا۔ اس جوان مرگ سے میاں نبی بخش اور اُن کے کنبے کو انتہائی صدمہ ہوا۔ آخر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم مندمل ہوتا گیا۔ سچ ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

میاں نبی بخش کے تیسرے فرزند میاں محمد نظیر الحسن تھے۔ جو ۲۹ دسمبر ۱۸۹۱ء کو تولد ہوئے۔ اُن کا ناک نقشہ اپنے والد ماجد پر تھا۔ قد کاٹھ میں بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ابتدائی پرائمری تعلیم گورنمنٹ سکول سے سال ۱۹۰۸ء

میں مکمل کرنے کے بعد اُنہوں نے گجرات میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ گھر پہ رہنے کی وجہ سے والدِ گرامی کے مشیر اور گھریلو انتظام میں شریک کار رہے۔ صائب الرائے اور معاملہ فہم ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے گھوڑ سوار تھے۔ اُنہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز بطور سب انسپکٹر محکمہ امداد باہمی پنجاب سے کیا۔ طبیعت کی بے باکی۔ خودداری۔ خاندانی نجابت اور خداداد صلاحیتوں کا امتزاج کسی بڑے سے بڑے افسر کو بھی خاطر میں نہ لانے دیتا تھا۔ خوش پوشاک اور مغربی لباس کے دلدادہ تھے۔ اپنے کارِ منصبی کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لئے دوست دشمن۔ افسر ماتحت سبھی اُن کی تعظیم و تکریم کرتے۔ پنجاب کے متعدد اضلاع میں بطور سب انسپکٹر محکمہ امداد باہمی رہے۔ زندگی کا زیادہ حصہ اضلاع کیمبل پور اور راولپنڈی میں گزارا۔ کچھ سال ضلع جہلم میں بھی رہے۔ بالآخر سال ۱۹۳۰ء میں بطور آڈیٹر محکمہ امداد باہمی لاہور میں تبدیل ہوئے اور چند سال یہاں کام کرنے کے بعد اُنہوں نے از خود ریٹائرمنٹ حاصل کر لی۔ میاں محمد نظیر الحسن بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ اپنی سدا بہار طبیعت اور خوش مزاجی سے ہر محفل پہ چھا جاتے۔ بڑوں میں بزرگ۔ نوجوانوں میں دوست، بچوں میں سراپا شفقت اور صنفِ نازک کی مجلسوں میں پُرکشش قصہ گوئی کے "میاں جی"۔ عجیب مجموعہ اضداد کے حامل بزرگ تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سلامت محلہ موہنی روڈ لاہور میں اپنے خرید کردہ مکان میں مقیم رہے۔ اُن کا گھر بقول اُن کے سب کے لئے تفریح گاہ تھا۔ کبھی آن بھی وہ اکیلے نہیں ہوتے تھے۔ اُن کے حلقہ اربابِ ارادت میں ہر سن اور صنف کے افراد شامل تھے۔ بمشکل وہ اپنے لئے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی

میاں محمّد نظیر الحسن صاحب

کا وقت نکالتے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں باقاعدگی کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ خوش خوراک اور ہنس مکھ بزرگ تھے۔

عین جوانی میں اُن کی شادی راولپنڈی کے خواجہ خانوادہ کی ایک دوشیزہ دختر میاں مہر بخش سے ہوئی۔ یہ خاتون قبول صُورت، متوازن قدو قامت اور سلیقہ شعار ہونے کے علاوہ انتہائی حلیم الطبع تھیں۔ گھر میں میاں صاحب انتہائی گرم مزاج فرد تھے۔ اور اصول پرستی میں قدامت پرستی کی حدوں سے بھی ماورئی تھے۔ لیکن آفرین ہے۔ اس معتدل مزاج خاتون کے صبر و حلم پہ کہ کبھی حرفِ شکایت اُن کے لب پہ نہ آیا۔ اپنے بچوں اور شوہر کے لیے سراپا ایثار یہ خاتون ۳ جولائی ۱۹۴۲ء کو راہی ملکِ عدم ہوئیں۔ وہ بلند حوصلہ نیک سیرت اور ہمدرد خاتون تھیں۔ اُن کے بطن سے میاں صاحب کے ہاں علاوہ دو صاحبزادیوں کے چار فرزند تولد ہوئے۔ اُن کے ایک صاحبزادے اور ایک دختر گودی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میاں محمد نظیر الحسن نے زندگی بھر ملازمت سرکار کے علاوہ اپنی توجہ پورے طور پہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف مبذول رکھی۔ اُن کی اعلیٰ پرورش اور تعلیم کے لیے اپنے آپ کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے حصول کے بعد وقف کر دیا۔ ایک کامیاب اور کشمکش حیات سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد میاں محمد نظیر الحسن، دورانِ علالت چھوٹے صاحبزادے کے پاس راولپنڈی گئے جہاں ۲۸ اگست ۱۹۷۰ء کو انتقال فرمایا۔ جبکہ اُن کے یہی صاحبزادے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی نعش گجرات لائی گئی۔ اور اُنہیں اپنے والدِ گرامی کے قدموں میں دفن کیا گیا۔ اُن کے چالیسویں پر اُن کی عمر کے سالوں کے مطابق قرآن حکیم کے نسخہ جات غرباء اور حاجتمندوں میں تقسیم کیے گئے۔ میاں محمد نظیر الحسن کے

سب سے بڑے صاحبزادے میاں فیض الحسن یکم فروری ۱۹۱۶ء بروز سوموار تولد ہوئے۔ وہ اپنی جسمانی معذوری کی وجہ سے گو بڑے ہو کر بھی دوسرے بھائیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم تو نہ حاصل کر سکے لیکن اپنے والد کی مساعی سے انہوں نے میٹرک سال ۱۹۳۳ء میں پاس کر لیا۔ پرائمری سے میٹرک تک میاں محمد نظیر الحسن کا پرائیویٹ ملازم پنّوں نامی میاں فیض الحسن کو اپنی پشت پر اُٹھا کر سکول چھوڑ آتا اور پھر واپس لے آتا۔ میاں فیض الحسن باقاعدگی سے سکول کا کام گھر پر بھی کرتے شروع سے ہی اپنے لئے مقام پیدا کرنے کی لگن میں رہے۔ جسمانی معذوری کے باوجود وہ ایک حوصلہ مند فرد ہونے کے ناطہ سے تحصیلِ علم میں پیش پیش رہے۔ وہ انتہائی خوش خط طالب علم تھے۔ میٹرک کے بعد میاں فیض الحسن کی ملاقات اتفاقاً جگدیش سیٹھی پروڈیوسر ڈائریکٹر گولڈن ایگل موری ٹون بمبئی سے کیمبل پور میں ہوئی۔ جہاں کے وہ رہنے والے تھے۔ اور بمبئی سے گھر آئے ہوئے تھے۔ سیٹھی صاحب نے میاں فیض الحسن کو بمشاہرہ مبلغ ۶۰ روپے ماہوار بھرتی کیا۔ اس سلسلہ میں ان کو اپنے عظیم والد کی پورے طور سے اعانت، اخلاقی اور مادی امداد کی صورت میں حاصل رہی۔ چنانچہ میاں فیض الحسن نے بمبئی کا رُخ کیا۔ اور فلم انڈسٹری میں بطور کامیڈین فیضی کے فلمی نام سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی فلم جنگ جوانی تھی۔ بعدہ انہوں نے ہیرا نمبر ۱، لیڈر فیس، پورنیما، رفتہ، جاگرتی، تماشہ اور ملاری میں کامیاب رول ادا کئے۔ وہ متعدد ہندوستانی سپرہٹ فلموں کے کامیڈین مسٹر ایس۔ ایم یوسف کے شریک کار بھی رہے۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد تک وہ بمبئی میں مقیم رہے۔ حکومتِ ہند کی فلمی پالیسی سے وہاں کے مسلمان فن کار خاصے متاثر ہوئے۔ علاوہ ازیں میاں محمد نظیر الحسن نے

فلمسٹار میاں فیض الحسن المعروف فیضی صاحب ۔

بھی اپنے اس فرزند کو پے در پے خطوط میں پاکستان واپس چلے آنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ سال ۱۹۵۵ء میں وطن لوٹ آئے۔ اس دوران اُن کے برادرِ خورد میجر میاں بشیر الحسن نے گلبرگ میں اپنی ذاتی کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ میاں فیض الحسن اُس کوٹھی کے ایک حصّہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اور فلم انڈسٹری پاکستان جو اُس دور میں انتہائی ناسازگار حالات سے دوچار تھی، کی خدمت پر کمر بستہ ہو گئے۔ یہاں مسٹر ایم اقبال یوسف نے بطور پروڈیوسر ڈائریکٹر بہت سی کامیاب فلمیں بنائیں۔ جن میں فیضی کو کاسٹ کیا گیا۔ اور اسی طرح وہ کامیاب ترین فلموں کی کاسٹ میں برابر شریک رہے۔ آج بھی وہ اُسی لگن سے فلم انڈسٹری کی خدمت میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی مجرّد بسر کی ہے بھائیوں کی خدمتگذاری اور اُن کے بچوں کی چاہت ہی اُن کا سرمایۂ زندگی ہے۔ اپنی معذوری کے باوجود لاہور میں مقیم رہتے ہوئے بھی اپنی جدّی اراضی واقعہ موضع بانٹھ ضلع گجرات کا انتظام و انصرام تمام بھائیوں اور ہمشیرہ کی جانب سے وہی کر رہے ہیں۔ وہ انتہائی زیرک، تجربہ کار، معاملہ فہم، خوش پوش اور متواضع فردِ کنبہ ہیں۔ اُن کے ہاں فلمی اور غیر فلمی احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کراچی کی متعدد فلمی شخصیتیں اور فن کار لاہور آمد پر اُن کی میزبانی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان کے قریب قریب تمام چوٹی کے فن کاروں کی کامیاب فلمی ٹیموں میں اُنہیں شمولیت کے مواقع ملے ہیں۔

فیضی صاحب نے بتایا کہ اُن کی سب سے پہلی سوشل فلم جو تمام تر سٹار کاسٹ تھی، کا نام "رنگ محل" تھا جس میں اُنہوں نے ایک فرنگی کا رول انتہائی چابکدستی سے سرانجام دیا۔ یہ فلم وزیر اعظم بھارت پنڈت

جواہر لعل نہرو نے بھی دیکھی اور ان کا کردار بہت ہی پسند کیا۔ وزیر اعظم ہند نے انہیں شرفِ باریابی بخشا اور حوصلہ افزائی کی۔ جس سے فلم انڈسٹری میں خوشگوار ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ ہندوستانی فلموں میں اُن کی مانگ بڑھ گئی جس کے نتیجہ میں اُنہوں نے اوشا کرن۔ ہماری منزل۔ گرہستی۔ گماشتہ۔ بلبل برہا کی رات۔ بڑی دیدی۔ دیوار اور گزارہ میں اپنی اعلیٰ مہارت اور فلمی قابلیت کا لوہا منوایا۔ اُن کی یہ سبھی فلمیں سپر ہٹ شمار کی جاتی ہیں۔

نیفی صاحب کی پاکستان میں مراجعت بجائے خود اُس ملک کی فلم انڈسٹری کے لئے ایک نیک فال تھی۔ یہاں اُنہوں نے بہت سی کامیاب فلموں میں انتہائی محنت اور لگن سے زندگی کے بہترین رول ادا کئے۔ ان میں سے سویرا۔ رات کے راہی۔ زمانہ کیا کہے گا۔ چوکر۔ شہنائی۔ اولاد۔ بھرجائی۔ جوش۔ نیک پروین اور عورت ایک پہیلی قابل ذکر ہیں۔ اُن کی زیر تکمیل فلموں میں پنجابی فلم "جٹ کڑیاں توں ڈردا" اور اُردو زبان کی فلمیں "جینے کی راہ۔ خدا اور محبت" کے علاوہ فلم "ٹکراؤ" ہے۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود وہ ایک چست وہوشیار۔ چاک و چوبند اداکار ہیں۔ خوراک متوازن اور بچی تلی استعمال کرتے ہیں۔ عادات اور اطوار سادہ اور تصنع سے پاک۔ عزم و حوصلہ بلند۔ فراخ ضمیر اور اعلیٰ قدروں کے حامل انسان ہیں

اپنی گذشتہ زندگی کے حالات میں سے چند واقعات بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ معذور پیدا ہونے کے باوجود ذہین بچوں میں شمار ہوتا تھا۔ کبھی آن بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔ اپنے قیام بمبئی کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ ایک بار ٹیکسی کی انتظار میں ایک بس سٹاپ پر کھڑا تھا۔ کہ ایک بڑھیا نے معذور بھکاری سمجھ کر ایک آنہ خیرات کے طور پر دینا

چاہا۔ مجھے اُس کا یہ اسلوب ناگوار گزرا۔ اور میں نے تاؤ میں آنا چاہا لیکن بڑھیا
میرے تیور دیکھ کر بھڑک اُٹھی کہ لوگو اس عجیب سے بھکاری کو دیکھو کہ ایک
آنہ لینے سے انکار کرتا ہے۔ ایک آنہ نہیں تو کیا اسے چوّنی دوں۔ اس پہ
آس پاس کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ تو میری فلمی زندگی سے
شناسا تھے۔ وہ بڑھیا کی سادگی پر ہنس رہے تھے۔ اور جنہیں فلموں کے
دیکھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسے مذاق کے طور پر ایک اہم واقعہ شمار کر رہے
تھے۔ اور خوب لطف اُٹھانے کے موڈ میں تھے۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔
فیضی صاحب شوٹنگ سے واپسی پر ایک بس سٹاپ پہ کہیں جانے
کے لیئے کھڑے تھے۔ اچانک بس آگئی۔ ایک بھاری بھرکم جسم کی خاتون
جو اپنے کچھ خورد سال بچوں کے ہمراہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جلدی
میں بچوں کو پکڑ پکڑ کر بس پر سوار کروانے لگی اپنی اس بدحواسی کے عالم میں
فیضی صاحب کو بھی اُس نے کوتاہ قد ہونے کی بنا پر اپنا خورد سال بچہ
سمجھتے ہوئے کوٹ سے پکڑا۔ اور بس میں دھکیلنا چاہا لیکن جونہی فیضی صاحب
نے اُسے بے بسی کے عالم میں دیکھا تو اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ
SORRY (مجھے افسوس ہے) کہہ کر بس میں سوار ہو گئی۔ اور اس طرح
فیضی صاحب ایک خورد سالہ بچہ بنتے بنتے رہ گئے۔

فیضی صاحب کی داستانِ جدوجہد بہت طویل اور دلچسپ ہے۔ وہ
اس نظریہ کے تحت اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات بیان کرنے پر مصر تھے
کہ کوئی قاری یا فردِ قوم محض جسمانی معذوری کی بنا پر ہمت ہارتے ہوئے
دوسروں پہ بوجھ ثابت نہ ہو اور نہ ہی دل برداشتہ ہو کیونکہ ذاتی لگن اور

محنت ہی فاتح عالم ہوتی ہے۔ ورنہ ؎

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں عمرِ گزشتہ کو آواز دینے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی سوچ کی گہرائیاں اور اُپچ اسی اُدھیڑ بن میں ہے کہ ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

میاں محمد نظیر الحسن کے دوسرے فرزند میاں محمد بشیر الحسن ۲۸ جنوری ۱۹۴۱ء بروز منگل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد کی سب سے پہلی خوبرو، توانا اور صحت مند اولاد تھے۔ ان کی ولادت پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پانچ برس کی عمر میں انہیں سکول بھیجا گیا۔ پرائمری۔ مڈل۔ میٹرک۔ ایف۔ اے بی۔ اے اور ایم۔ اے انہوں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ متعدد گولڈ میڈل اور وظائف حاصل کیے۔ وہ خاندان منگراں کے پہلے ایم۔ اے سپوت ہیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بی۔ اے میں کیمبلپور سے آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد اُن کے والد نے اپنے ہونہار بچے کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر ضلع کیمبلپور سے لاہور میں اپنا تبادلہ کروالیا۔ اور سوہنی روڈ کے علاقہ میں اپنی رہائش گاہ کا اہتمام کیا۔ اپنے والد کے مستقلاً لاہور آنے سے پہلے میاں محمد بشیر الحسن نیلا گنبد کے علاقہ میں ایک ہوٹل میں فروکش رہے۔ اس جگہ اکیلے رہنے سے اُن میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ انتہائی محنت۔ کام میں لگن اور دیگر ذاتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا سلیقہ نکھر آیا۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد

میجر میاں محمد بشیر الحسن صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل سنٹرل سرکل لاہور۔

اُنہوں نے آئی۔سی۔ایس کے مقابلہ کے امتحان میں حصہ لیا۔ اُس سال ابتداً کُھلے (OPEN) مقابلہ کے لیے پانچ نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ چنانچہ میاں محمد بشیر الحسن تحریری امتحان اور انٹرویو میں چوتھے نمبر پر آگئے لیکن حکومتِ ہند نے اُس سال دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے نشستوں کی تعداد پانچ سے گھٹا کر تین کر دی۔ اور اس طرح میاں محمد بشیر الحسن کو انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں لے لیا گیا۔ اُن کی پہلی تقرری بطور سپرنٹنڈنٹ ڈاک خانہ جات کی گئی۔ یہاں اُنہوں نے کمال محنت و جانفشانی سے کام کیا۔ تقسیم ملک کے وقت وہ سرینگر سرکل کے سربراہ تھے۔ قیامِ پاکستان کے برطانوی اعلان کے تحت محکمہ مواصلات کے سابقہ انتظامات کی عبوری طور پر بحالی کا معاہدہ حکومت پاکستان اور مہاراجہ ہری سنگھ والئے جموں و کشمیر سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ محکمہ ڈاک و تار کے افسران و عملہ بدستور سابق ریاست جموں کشمیر میں کام کر رہے تھے۔ میجر بشیر الحسن سپرنٹنڈنٹ محکمہ ڈاک و تار نے حسبِ ہدایت سردار عبدالرب نشتر وزیر مواصلات حکومت ہند اپنے میل اور [illegible] سید موسیٰ اور میر تہنیت خان کی وساطت سے جولائی [illegible] میں لداخ اور گلگت کے دور اُفتادہ علاقوں میں پاکستانی پرچم لہرانے کے لیے بھجوا دیئے تھے۔ یاد رہے کہ لداخ کا کرگل سکردو اور بلتستان کا علاقہ درّہ زوجیلہ جو کہ ۱۲،۲۵۰ فٹ کی بلندی پر ہے کے دوسری جانب واقع ہے جبکہ گلگت کا علاقہ درّہ تراگبل (سطح سمندر سے بلندی ۱۰،۰۰۰ فٹ) اور درّہ رازدانی (بلندی ۱۱۰۰۰ فٹ) کے دوسری جانب واقع ہے۔ چنانچہ ریاست کے ان دور اُفتادہ علاقوں پر میجر بشیر الحسن کی وطن دوستی اور پاکستان سے والہانہ محبت کے باعث

سبز ہلالی پرچم وہاں پہنچتے ہی تمام ڈاک خانوں پہ لہرانے لگے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی مہاراج گنج سرینگر میں پاکستانی جھنڈا لہرایا گیا۔ اسی دن سرینگر کے مرکزی ڈاک خانہ اور تار گھر کی عمارت پر مسٹر کے۔ ایچ خورشید اور صوبہ بمبئی سے ریاست جموں کشمیر میں آئے ہوئے ادیبوں کی موجودگی میں چاند ستارے والا پاکستانی پرچم لہرایا گیا۔ جس کو پاکستانی افواج کے رخصت پر آئے ہوئے ریاستی باشندوں نے باقاعدہ ریاستی عوام کے اجتماع میں سلامی دی۔ اس پریڈ اور سلامی کی بیرونی ممالک سے آئے ہوئے انگریز اور دیگر باشندوں نے تصاویر بھی لیں۔ ریاستی باشندوں میں پاکستانی جھنڈا اُن کی ریاست کی سرزمین میں لہرائے جانے سے مسرت و شادمانی کی ایک بے پایاں لہر دوڑ گئی۔ میجر میاں بشیر الحسن کے اس اقدام سے ڈائریکٹر جنرل ہند محکمہ ڈاک و تار بہت جز بز ہوئے دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ نے میاں صاحب کو اپنی بلیک لسٹ میں کر لیا۔ اور اُن کا ذاتی جانی دشمن بن گیا۔ میجر میاں بشیر الحسن کی ان خدمات کا اعتراف مسلم کانفرنس کے عمائدین اور آزاد کشمیر کے قائدین نے واضح الفاظ میں کیا جن میں سردار محمد ابراہیم خان اور مسٹر کے۔ ایچ خورشید بھی شامل ہیں۔ اپنی اس کارکردگی کے بعد وہ اپنے معمول کے سرکاری دورہ کے دوران کوہ مری کے جانب گئے ہوئے تھے کہ ریاست میں گڑبڑ اور حکومت ہند کی افواج کی یلغار شروع ہو گئی۔ چنانچہ وہ واپس سرینگر نہ جا سکے۔ اُن کی پاکستان سے والہانہ محبت کی بنا پر ریاست کے ۱۵۰ ڈاک خانہ جات میں پاکستان کا ہلالی پرچم لہرایا گیا۔ اور اس تاریخی حقیقت کی بازگشت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسئلہ ریاست جموں و

میجر محمد بشیر الحسن صاحب ڈاکخانہ کچہری شیخوپورہ کی رسمِ افتتاح کے موقع پر

کچہری پوسٹ آفس شیخوپورہ کی رسمِ افتتاح کے بعد عملہ کے ہمراہ
میجر محمد بشیر الحسن صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل سنٹرل سرکل لاہور

میجر محمّد بشیر الحسن صاحب پی۔پی۔ایس پوسٹ ماسٹر جنرل سنٹرل سرکل لاہور اپنے دفتر میں

میجر محمد بشیر الحسن صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل سنٹرل سرکل بلڈنگ ہیڈ پوسٹ آفس گوجرانوالہ
کی رسم افتتاح کے موقع پر

کشمیر پر بحث کے دوران بھی سُنی گئی۔

اس سے پہلے دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ اپنی خدمات حکومت ہند
کو پیش کر چکے تھے۔ اور اپنی ملازمت کے دوران ہی محکمہ ڈاک و تار میں فیلڈ ڈیوٹی
متعدد جنگی محاذوں پر دے چکے تھے۔ جہاں پہلے تو وہ بطور کیپٹن اور بعد ۂ
بطور میجر متعین رہے۔ اپنی فوجی ڈیوٹی کے دوران انہوں نے اعلیٰ درجہ کی
فرض شناسی۔ فنی تجربہ کاری۔ انتظامی صلاحیتوں۔ معاملہ فہمی چابکدستی اطاعت
اور خوش خلقی کا مظاہرہ کیا۔ جس کی بناء پر جنگ کے اختتام پر انہیں ڈپٹی
پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور اور پھر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کراچی تعینات کیا گیا۔
وہاں سے انہیں دو مرتبہ مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں بطور پوسٹ
ماسٹر جنرل ڈھاکہ اور کلکتہ متعین کیا گیا۔ جہاں انہوں نے اپنی اعلیٰ استعداد اور
گراں قدر قومی و ملکی خدمات سے عوام و خواص کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اور
نہایت کامیاب افسر ثابت ہوئے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے چپہ
چپہ کا دورہ کیا اور وہاں سینکڑوں مقامات پر جدید ڈاک خانے کھلوائے
سقوط ڈھاکہ سے کچھ عرصہ پہلے اُن کو پوسٹ ماسٹر جنرل پشاور بنا کر
وہاں نیا سرکل تشکیل کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ جہاں انہوں نے نہایت کامیابی
سے کام چلایا۔ یہاں قریباً پانچ سال کام کرنے کے بعد انہیں پوسٹل
لائف انشورنس کے کام کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے کراچی
میں بطور جنرل مینجر لگایا گیا۔ اس محکمہ میں بھی انہوں نے اپنی فراست، محنت
تجربہ کاری۔ خوش خلقی اور کام کی لگن سے بہت ہی مفید کام کرتے
ہوئے انشورنس کی دُنیا میں اپنے محکمے کیلئے نیک نامی حاصل کی اور
انشورنس کرانے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کرایا۔ انہوں نے

کئی نئے سرکل تشکیل کروائے جنکی افادیت کو اپنے پرائے سبھی نے سراہا اور تسلیم کیا۔ آج کل وہ بطور پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور متعین ہیں۔ اپنے قیام کراچی کے دوران اپنی اعلیٰ تعلیمی استعداد میں اضافہ کے لیے انہوں نے پرائیویٹ طور پر پہلے ایف اے۔ ایل اور بعدہٗ ایل۔ ایل بی کر کے وکالت بھی پاس کر لی۔

ملازمت کے دوران آسام بنگال مشرقی پنجاب بمبئی اور دکن (بھارت) کے صوبوں میں شمالی برما اور بعد میں انگلستان۔ جاپان۔ چین وغیرہ میں بھی وقت گزارا۔ تقریباً دس برس تک کراچی میں دفتر ڈائریکٹر جنرل ڈاکخانہ جات سے منسلک رہے۔ اور بطور پوسٹ ماسٹر جنرل گیارہ سال تک پاکستان کے مختلف صوبوں میں کام کیا۔ وہ خاندان منگرال گجرات کے سب سے پہلے بلکہ واحد لا گریجوایٹ ہیں۔

اپنی تقرری بطور سپرنٹنڈنٹ ڈاک خانہ جات کے دوران ان کی شادی فیروز سنز لاہور کے مولوی فیروز الدین کے بڑے صاحبزادے جناب عبد المجید خان جو بعد میں چیئرمین فیروز سنز لمیٹڈ بھی رہے۔ کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے علاوہ ایک دختر دو فرزندان میاں محمد تجمل حسن اور میاں محمد رضوان الحسن تولد ہوئے۔

میاں محمد بشیر الحسن کے صاحبزادے میاں محمد تجمل حسن ۱۰ مئی ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ وہ نہایت ہی ہونہار۔ محنتی۔ سلیقہ شعار۔ خوش پوش اور رکھ رکھاؤ کے سعادتمند نوجوان ہیں۔ وہ آج کل پشاور یونیورسٹی میں میڈیکل کے سال آخر کے طالب علم ہیں۔

میاں محمد بشیر الحسن کے دوسرے فرزند میاں محمد رضوان الحسن ۱۸ جنوری

لفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) میاں محمّد ریاض الحسن صاحب
جنرل مینجر فوجی سیریل مینوفیکچرنگ پروڈکشن راولپنڈی

۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ وہ متوازن بدن۔ انتہائی چست و چوبند، زیرک، محنتی حاضر دماغ اور بلا کے ذہین نوجوان ہیں۔ اس کم سنی میں اُن کی معلومات اپنے ہم عمر بچوں سے فزوں ہیں۔ وہ آج کل کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کامیابی سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے میٹرک میں امتیازی کامیابی حاصل کر کے سکالرشپ لیا۔

میاں محمد نظیر الحسن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں ریاض الحسن ۳۰ جولائی ۱۹۲۱ء بروز ہفتہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرائمری۔ مڈل کے بعد میٹرک پاس کیا اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کنگ کمیشن کے حصول سے کیا۔ یہ جنگ عظیم دوئم کا زمانہ تھا۔ میاں محمد ریاض الحسن نے اپنے حسن کارکردگی۔ وجاہت۔ محنت اور کام کی لگن سے جلد ہی سیکنڈ لفٹنٹ سے بطور لفٹنٹ ترقی کی۔ اس کے دو سال بعد کیپٹن بنا دیئے گئے۔ حسن صورت۔ حسن سیرت اور بلندی اخلاق کے مظہر۔ نظم و ضبط اور انتظامی صفات سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے اعلیٰ فوجی استعداد کا مظاہرہ کیا۔ متعدد فوجی مشنوں پر بکارِ خاص بھجوائے جاتے رہے۔ اُن کی اعلیٰ کارکردگی سے متاثر ہو کر حکومت نے اُنہیں جلد ہی میجر بنا دیا اور پھر فوجی ملازمت میں کرنل کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوئے۔ مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد اُن کی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں فوجی فونڈیشن راولپنڈی میں پہلے فان گیس میں جنرل مینجر بنایا گیا۔ یہاں بھی اپنی روایتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اُنہوں نے اپنے لیئے ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ متعدد دفعہ بیرون ملک گئے اور اپنی انتظامیہ کے لیئے نئے تجربات کی روشنی میں گیس کی ترسیل

پیداوار اور تکنیکی شعبہ میں دُور رس نتائج کی حامل تبدیلیاں عمل میں لا کر اس قدرتی انعام کی افادیت کا ہر کہ و مہ کو قائل کیا۔ بہت سی نئی ایجنسیاں ملک کے مختلف حصوں میں قائم کرائیں۔ اور اس طرح اپنی محنت، دیانت اور حُسنِ کارکردگی سے اربابِ حل و عقد کو متاثر کیا۔ آج کل وہ جنرل مینجر فوجی سیریل مینوفیکچرنگ پروڈکشن لمیٹڈ راولپنڈی ہیں۔ وہ صاحبِ ذوق مرنجان مرنج۔ تجربہ کار اور کم گو شخصیت کے بڑے رکھ رکھاؤ کے فردِ قوم ہیں۔ حلقۂ احباب میں محبوب رفیق اور اچھے دوست ہیں۔ ایک شفیق باپ، مخلص دوست۔ اچھے ساتھی اور قابلِ قدر بھائی ہیں۔ اُن کی شادی چائنہ ہاؤس کشمیری بازار لاہور والوں کی ایک دوشیزہ سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ دو زیرِ تعلیم دختران اُن کے دو خورد سال لڑکے میاں محمد نوید الحسن اور میاں محمد نور الحسن بھی ہیں۔ میاں محمد نوید الحسن ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو تولد ہوئے۔ اور آجکل پرائمری کے طالب علم ہیں میاں نبی بخش کے چوتھے فرزند میاں اقبال دین چند ماہ زندہ رہنے کے بعد فوت ہو گئے۔

میاں نبی بخش کے پانچویں اور سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد اقبال تھی ۷ جولائی سنہ ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے وہ تیکھے نقوش اور سفید رنگت کے دراز قد نوجوان تھے۔ سب سے چھوٹے پسر ہونے کی بنا پر اُن پر ماں باپ کی شفقت قدرتی طور پر سب سے زیادہ تھی۔ پانچ سال کی عمر ہونے پر لوکل مشن سکول میں تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔ پرائمری کے بعد مڈل انہوں نے سال سنہ ۱۹۱۷ء میں کیا اور میٹرک سال ۱۹۱۹ء میں پاس کرنے کے چند سال بعد اُن کو بھی اپنے برادرِ بزرگ میاں

میاں محمد اقبال نبی صاحب

مختار نبی کی طرح محکمہ زراعت میں قسمت آزمائی کے لئے زراعتی کالج
لائلپور میں داخلہ کے لئے بھیجا گیا۔ وہ اپنی خداداد ذہانت اور شخصی اوصاف
کی بنا پر داخلہ کے لئے منتخب کر لئے گئے۔ یہاں اُنہوں نے انتہائی
محنت اور لگن سے کام کیا۔ وہ علاوہ تدریسی معمولات کے فٹ بال اور
رسہ کشی کی کالج ٹیموں کے ممتاز کھلاڑی تھے۔ سال ۱۹۱۶ء میں وہ چیمپئن
ٹگ آف وار ٹیم (CHAMPION TUG OF WAR TEAM) پنجاب
ایگریکلچر کالج لائلپور کے ممبر تھے۔ اسی سال وہ اپنے کالج کی فٹ بال ٹیم میں بھی
شامل تھے۔ وہ ایک تنومند نوجوان تھے۔ اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں
بھرپور حصہ لیتے تھے۔ سال اپریل ۱۹۱۸ء میں ہی اُس کالج سے فارغ التحصیل
ہو کر بطور انسپکٹر زراعت گورداسپور تعینات ہوئے۔ اس سے دو سال
قبل اُن کی شادی اپنے ماموں میاں حسین بخش کی سب سے چھوٹی صاحبزادی
سے ہو گئی۔ بعد میں سال ۱۹۱۹ء میں وہ وزیرآباد میں انسپکٹر زراعت متعین
ہوئے۔ وہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور خوش خلقی کی بنا پر سرکاری اور نجی
حلقوں میں نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اپنی
تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اپنے والد اور والدہ کی خدمت میں باقاعدگی سے
ارسال کرتے۔ اُن کی ملازمت کے دوران اُن کی وفاکیش زوجہ اُن
کے ایماء پر اُن کے بوڑھے والدین کی خدمتگذاری کے لئے مستقلاً گجرات
میں اُن کے آبائی مکان واقعہ محلہ چابکسواراں میں اقامت گزیں رہیں۔ انہوں
نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی موجودگی میں خود یہ قربانی اپنے والدین کے
لئے کی جبکہ اُن کے بھائیوں کی ازدواج اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ
اُن کی جائے تقرری پر رہائش پذیر رہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً گجرات آتے

اور والدین کی خبر گیری اہتمام سے کرتے. اپنے بڑے بھائیوں کا انتہائی احترام کرتے اور اُن کی اولاد کو بہت محبت اور پیار سے نوازتے. اپنی محنتِ شاقہ اور حساس طبعیت کی بناء پر وہ انتڑیوں کی دق میں مبتلا ہو گئے. لیکن اُنہوں نے اس بیماری کی چنداں پروا نہ کی. اور بدستور محنت سے کارِ سرکار سرانجام دیتے رہے. چنانچہ اپنی مختصر سی ملازمتِ سرکار کے دوران وہ ۲۷ر جون ۱۹۴۳ء کو بروز جمعرات عالمِ فانی سے رحلت فرما گئے. اس وقت اُن کی تین اولادوں میں سے صرف دو پسران میاں اعجاز نبی (مؤلف) اور میاں محمد افتخار نبی ہی موجود تھیں. کیونکہ اُن کے منجھلے فرزند میاں محمد ممتاز نبی صغیر سنی ہی میں بعمر ایک سال فوت ہو گئے تھے مؤلف کی عمر اُس وقت ۷ سال تھی. جبکہ میاں محمد افتخار نبی صرف چالیس دن کے تھے. میاں محمد اقبال نبی کا جسدِ خاکی اُن کے آبائی قبرستان واقعہ مسجد بیگم پورہ گجرات میں سپردِ خاک کیا گیا۔

تربت پہ تیری رحمتِ حق کا نزول ہو
حامی ترا خدا ہو، خدا کا رسول ہو

اس جوانمرگ سے میاں محمد اقبال نبی کے والد اور والدہ کی دُنیا اندھیر ہو گئی. ابھی اُن کی دُختر کی وفات کا زخم ہرا ہی تھا کہ تین دن بعد اُن کا پسر بھی راہی ملکِ عدم ہو گیا. اگرچہ میاں نبی بخش توہمات کے قائل نہیں تھے. لیکن پھر بھی خاندان میں یہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں. کہ چونکہ اُنہوں نے اُسی ماہ چند یوم پہلے سانپوں کے ایک جوڑا کو اکٹھے مار دیا تھا. اس لیئے اُن پر یہ اُفتاد پڑی کہ اُن کی دُختر اور پسر یکے بعد دیگرے تین دن کے اندر اندر وفات پا گئے. لیکن میاں نبی بخش زندگی بھر اسے

رضائے الٰہی سمجھتے اور بیان کرتے رہے وہ سختی سے اس امر پر ایمان رکھتے تھے۔ کہ ع

موت کا ایک دن معیّن ہے

میاں محمد اقبال بٹ کے سب سے بڑے فرزند میاں اعجاز بٹ (مؤلف) ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء بروز جمعہ تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جیمز پرائمری چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن سکول گجرات میں حاصل کی۔ مڈل تک اسلامیہ مڈل سکول موسومہ "آزاد سکول" میں رہے۔ آٹھویں جماعت گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری (حال ساہیوال) سے پاس کی۔ اور نویں جماعت میں داخلہ گورنمنٹ انٹرمیڈیایٹ کالج گجرات میں لیا۔ سال ۱۹۳۵ء میں اعلےٰ سیکنڈ ڈویژن میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میٹرک میں کامیابی حاصل کی۔ اور اسی کالج میں ایف اے آرٹس میں داخلہ لیا۔ ابھی ایف اے پاس نہ کرنے پائے تھے کہ سال ۱۹۳۷ء میں بطور امیدوار گرداور قانونگوی منتخب ہو گئے۔ اور یوں تعلیم کو خیرباد کہا۔

اپنی کالج کی زندگی میں فٹ بال کی ٹیم کے ممبر رہے۔ اور متعدد یونیورسٹی مقابلوں میں اپنے کالج کی نمائندگی کی۔ وہ کالج کی رسہ کشی کی ٹیم کے کپتان ہونے کے علاوہ کالج ڈیک ٹینس ٹیم کے سیکرٹری اور کالج باسکٹ بال ٹیم کے متواتر تین سال تک کپتان رہے۔ اور ہر سال پنجاب یونیورسٹی میں اپنی ٹیم کے ساتھ گجرات کالج کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ کالج کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی صدر تھے۔ کالج بزم اقبال کے صدر۔ کالج

---

[1] بایوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان سال ۱۹۶۹ء ۱۹۷۰ صفحہ نمبری ۷۹۹، ۸۰۰

میگزین حصہ اُردو کے سٹوڈنٹ ایڈیٹر اور کالج ڈرامیٹک سوسائٹی کے رکن اور اچھے مقرر تھے۔ کالج کی انگریزی ڈرامیٹک کلب کے ممبر بھی رہے۔ اُنہوں نے حصہ انٹرمیڈایٹ کے طالب علم کی حیثیت میں جغرافیہ میں دوسرا انعام تقریری مقابلہ میں سپیشل انعام اور انگریزی ڈرامہ میں اعلیٰ کارکردگی پر بھی انعام حاصل کیا۔ وہ کالج سکاؤٹس کی تنظیم کے بھی ایک سرگرم رکن تھے۔ اُنہوں نے فسٹ ایڈ کی ٹریننگ کا ڈپلومہ مڈل کلاس میں زیر تعلیم ہونے پر حاصل کر لیا تھا۔ اُنہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور کی مجلس عاملہ میں سال ۱۹۳۹ء میں ضلع گجرات کی شاخ کی نمائندگی کی۔ وہ اپنی کالج کی زندگی میں اور ملازمت سرکار کے دوران بالعموم شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے چنانچہ اُن کی متعدد نظمیں کالج میگزین اور لوکل اخبار محب کسان میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ وہ اپنے کالج کے ٹیوٹوریل گروپ (R) کے سال ۱۹۳۷ء میں سیکرٹری رہے۔ وہ اپنی کالج کی تعلیم کے دوران کالج کی ادبی۔ ثقافتی اور کھیلوں کی سرگرمیوں میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ گورنمنٹ انٹرمیڈایٹ کالج گجرات کی تاریخ میں پہلی بار انہیں کالج کلر بطور کپتان باسکٹ بال ٹیم دیا گیا۔

عملی زندگی کے آغاز کے طور پر گرداور قانونگوئی کی ابتدائی ٹریننگ کے لیئے سال ۱۹۳۹ء کی آخری سہ ماہی میں بندوبست ضلع امرتسر میں بھجوائے گئے۔ جہاں اُن کی تعیناتی اجنالہ تحصیل میں ہوئی۔ وہاں اُنہوں نے مواضعات دریا منصور۔ ڈڈیاں اور ڈھنڈھال میں کام بندوبست کی عملی ٹریننگ حاصل کر کے سرٹیفکیٹ تکمیل ٹریننگ حاصل کیا۔ اور سال ۱۹۴۰ء کی آخری سہ ماہی میں واپس ضلع گجرات میں آگئے

ڈسٹرکٹ کونسل ہال ڈیرہ غازیخان میں قومی یکجہتی کے موضوع پر شعری مقابلہ میں مؤلف اپنی نظم پڑھ رہے ہیں۔ اُنکے بائیں میاں عنایت مولا ڈپٹی کمشنر اور ہر دو اطراف دیگر افسرانِ ضلع تشریف فرما ہیں۔

پنجاب ہائی کورٹ کے جشنِ صد سالہ میں مؤلف اپنی انگریزی نظم سُنا رہے ہیں اُن کے بائیں جانب میاں محمد طفیل صاحب صدر بار کونسل اور جناب گل محمد قریشی ڈسٹرکٹ و سیشن جج ڈیرہ غازیخان سٹیج پر بیٹھے ہیں۔

یہاں تحصیل گجرات و تحصیل پھالیہ میں محکمہ مال کی مزید ٹریننگ کرنے کے بعد ۹ جون ۱۹۴۳ء کو نائب صدر قانونگوی گجرات تعینات ہوئے۔ جہاں سے دو سال کام کرنے کے بعد انہیں بطور گرداور بندوبست نیلی بار کالونی پاکپتن بھیجا گیا۔ وہاں انہوں نے بندوبست اراضی میں ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء کامیابی سے کار سرکار سر انجام دیا۔ قیام پاکستان کے بعد یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کو انہیں صدر قانونگوی گجرات بنایا گیا۔ بھارت سے مہاجرین کا ریکارڈ مال طلب ہونے پر دفتر فنانشل کمشنر میں فنانشل کمشنر بحالیات کی زیر نگرانی سنٹرل ریکارڈ آفس کی تشکیل عمل میں لائی گئی اور میاں اعجاز نبی کو یکم مئی ۱۹۴۹ء کو صوبہ پنجاب کے جملہ صدر قانونگویاں میں سے انتخاب کر کے صدر قانونگوی سنٹرل ریکارڈز لاہور لگایا گیا۔ ۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو انہیں بطور نائب تحصیلدار ترقی دی گئی۔ پہلی مرتبہ یکم جولائی ۱۹۵۳ء تا ۹ اگست ۱۹۵۳ء انہیں عارضی طور پر تحصیلدار لگایا گیا۔ جبکہ بعد میں ۷ مئی ۱۹۵۹ء سے مسلسل بطور تحصیلدار متعین رہنے کے بعد ۳ مئی ۱۹۶۶ء سے پراونشل سروس (درجہ اول) میں ترقی یاب ہوئے۔ اس تاریخ سے وہ بطور سیکٹر آفیسر پھلورہ اور پھر سیکٹر رسول پور ضلع سیالکوٹ میں متاثرین جنگ پاک بھارت کی آبادکاری پر لگائے گئے۔ اور پھر ۹ نومبر ۱۹۶۶ء کو بطور مجسٹریٹ درجہ اول ڈیرہ غازیخان تعینات ہوئے۔ جہاں وہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۹ء تک رہے۔ یہاں سے انہیں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ تحصیل شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ لگایا گیا۔ اور ساتھ ہی محکمہ مال کے امور میں دسترس ہونے کی بناء پر لینڈ ایکوزیشن کلکٹر کے اختیارات بھی تفویض کئے گئے۔ یہاں ان کا قیام ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء تک رہا۔

محکمہ مال کے افسر ہونے کی بناء پر جلد ہی اُن کی تقرری بطور افسر آبادی و
جنرل اسسٹنٹ ریونیو ملتان میں ہو گئی۔ جہاں اُنہوں نے ۹ ر اکتوبر ۱۹۶۸ء
سے ۸ ر اکتوبر ۱۹۷۰ء تک کام کیا۔ اس دوران میں کوآپریٹو فارمنگ سکیم
کے تحت ضلع ملتان کے ۵۵ چکوک کے الاٹیوں کو مالکانہ حقوق دینے کا
کام بطور کلکٹر اُنہوں نے بحسن و خوبی سرانجام دیا۔ اپنے قیام شکر گڑھ اور
ملتان کے دوران ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی طرف سے محرم ڈیوٹی پر حسن کارکردگی
اور ڈپٹی کمشنر ملتان کی طرف سے حبوب سرکار کی فراہمی کے سلسلہ میں
بہ ہدایت چیف سیکرٹری صاحب صوبہ پنجاب خطوطِ خوشنودی (LETTERS OF
APPRECIATION) اُنہیں جاری کئے گئے۔ ملتان سے اُن کی خدمات
محکمہ بحالیات میں بطور ڈپٹی سیکریٹری / ایڈیشنل کمشنر بحالیات سررشتہ
چیف سیٹلمنٹ کمشنر بحالیات مغربی پاکستان مستعار لی گئیں۔ جہاں
اُنہوں نے ۹ ر اکتوبر ۱۹۷۰ء تا ۱۶ ر جون ۱۹۷۱ء کام کیا۔ اور مہاجرین
کی اپیلوں کا بہت سا کام ختم کیا۔ اُن کو علاوہ دفتری امور بطور ڈپٹی
سیکرٹری سنٹرل ریکارڈز کا بھی انچارج بنایا گیا۔ اور ایکٹ بحالیات
کی دفعہ ۱۰-۱۱ کے تحت سماعت مقدمات کے لئے بھی اختیارات
چیف سیٹلمنٹ کمشنر مغربی پاکستان تفویض کئے گئے۔

۱۷ ر جون ۱۹۷۱ء سے ۱۱ ر مارچ ۱۹۷۳ء تک اُنہوں نے
بطور سیکشن آفیسر انتظامیہ محکمہ پبلک ہیلتھ انجنیئرنگ لوکل گورنمنٹ و
سماجی بہبود حکومت پنجاب کام کیا۔ اور ۱۲ ر مارچ ۱۹۷۳ء سے
بطور ڈپٹی سیکرٹری / رجسٹرار پنجاب لینڈ کمیشن لاہور سے منسلک ہو
گئے۔ یہاں سے اُن کی خدمات ۹ ستمبر ۱۹۷۳ء کو سنٹرل گورنمنٹ کے

یومِ پاکستان کے موقع پر مؤلف بطور مہمانِ خصوصی شکر گڑھ میں تقریر کر رہے ہیں۔ عقب میں تحصیلدار شکر گڑھ جناب فیض محمد اسلم سول جج اور خواجہ محمد اکبر (حال مینجر یونائیٹڈ بنک ڈنگپورہ برانچ سیالکوٹ) تشریف فرما ہیں۔

خواجہ محمد سرور۔ مؤلف۔ خواجہ محمد اکرم (سسر مؤلف)

محکمہ متروکہ وقف املاک بورڈ لاہور کو بطور ڈپٹی سیکرٹری / ڈائریکٹر سپرد
تفویض ہوئیں۔ جہاں سے ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کو اُنہوں نے ازخود رخصت
قبل از ریٹائرمنٹ برائے ایک سال حاصل کی اور اس کے ایک سال
بعد یعنی ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء سے اپنی ۳۴ سالہ بے داغ ملازمت
سرکار کے اختتام کے بعد ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۷۴ء
سے اب تک اُن کا وقت مطالعہ۔ تحقیق اور اس کتاب کی تالیف کے
علاوہ قوم منگرال کے شجرہ نسب کی تکمیل میں گزرا۔ اُن کا حلقہ احباب نہایت محدود
ہے۔ اور زیادہ تر وہ گھریلو زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

آغاز ملازمت کے وقت مؤلف کی تعلیمی سند میٹرک تک تھی۔ چنانچہ
اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اُنہوں نے سال ۱۹۵۹ء میں فاضل فارسی
کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ اور اُسی سال ایف اے کا امتحان
پاس کر لیا۔ بعد میں سال ۱۹۶۴ء میں بی۔ اے کر کے وہ گریجوایٹ بن
گئے۔ اپنے قیام ڈیرہ غازیخاں میں اُنہوں نے وہاں کے ڈگری کالج کی
متعدد ادبی نشستوں کی صدارت کی اور حکومت کی طرف سے مختلف
موضوعات پر ڈویژنل مقابلہ ہائے شعر و سخن میں قسمت ملتان کے ضلع
ڈیرہ غازیخاں کی طرف سے قومی یکجہتی پر نظموں کے مقابلہ میں شمولیت کی۔
اُن کی نظم جو اس تالیف کے آغاز میں شامل کی گئی ہے۔ ضلع کے منتظمین
کی جیوری نے اوّل نمبر پر قرار دی۔ بعد میں ضلع ملتان کے صدر مقام پر
کمشنر ملتان کی زیر صدارت ڈویژنل کمیٹی نے اس نظم کا دوسرے[1] نمبر پر انتخاب کیا۔

---

[1] چٹھی نمبری 66 (B) 109-45-BD مجریہ 6 جون 1969ء جناب کمشنر صاحب ملتان

اور ڈویژنل کونسل کے اجلاس منعقدہ ساہیوال میں دوسرا انعام مبلغ تین صد روپے کا چیک مؤلف کو برسرِ اجلاس دیا گیا۔

مؤلف کی شادی ۸ ر فروری ۱۹۴۸ء کو خواجہ محمد اکرم مرحوم کی دخترِ ثانی سے ہوئی۔ جو اُن کے تایا میاں مختار نبی کی زوجہ کی حقیقی پھوپھی کی پوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مؤلف اور اُس کی اہلیہ کو پہلی مرتبہ سال ۱۹۶۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت بذریعہ قرعہ اندازی میسر آئی۔ بعدہٗ سال ۱۹۷۶ء میں دوبارہ رحمتِ ایزدی سے حرمین الشریفین میں حاضری اور حج کے مواقع سے دونوں مشرف ہوئے۔ اپنے والدِ مرحوم کے حج بدل کے سلسلہ میں مؤلف کو حق سبحانہٗ کی خاص کرم نوازی سے سال ۱۹۷۸ء میں پھر حج بیت اللہ کی سعادت ملی۔ مؤلف کی ابتدائی ملازمت کا سلسلہ اُس کے شفیق تایا میاں مختار نبی کا مرہونِ منت تھا۔ اور مابعد کی ترقی اور کامیابی محض خداوندِ قدوس کے خاص انعام و رحمت کی مرہون تھی ورنہ:۔

من آنم کہ من دانم

مؤلف کو اس شرح و بسط سے اپنا تذکرہ پسند تو نہ تھا لیکن محض اپنی تگ و دو اور محنت کے ذکر سے نوجوانانِ قوم کو جہدِ مسلسل کی طرف راغب کرنا مقصود ہے۔ تاکہ وہ کسی آسرا کے بغیر ہوتے ہوئے ہرگز جی چھوڑ کر عزم اور محنت کی لگن سے بے بہرہ نہ ہوں۔ کیونکہ سے

کشتیاں سب کی کنارے پہ پہنچ جاتی ہیں
ناخدا جن کا نہ ہو اُن کا خدا ہوتا ہے

میاں محمد اقبال نبی کے دوسرے فرزند میاں محمد ممتاز نبی جنوری ۱۹۱۶ء میں تولد ہوئے۔ ابھی گودی ہی میں تھے کہ بخار میں مبتلا ہوئے۔ والدہ انہیں
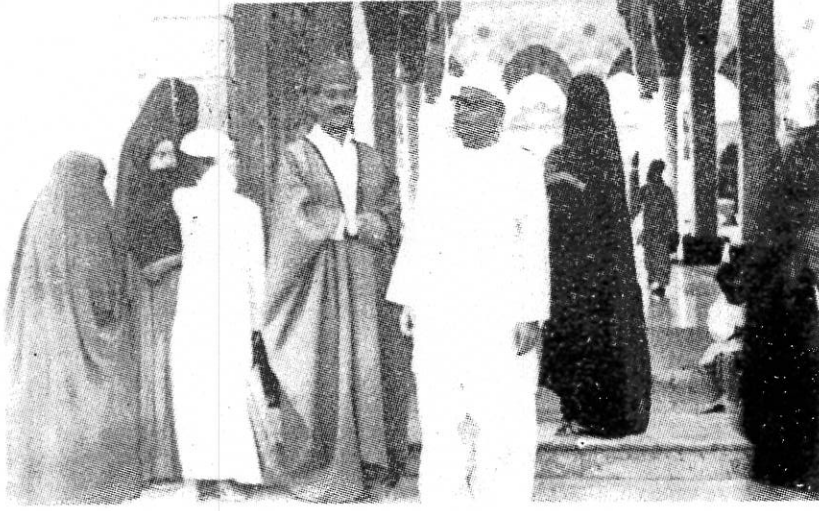
مؤلف مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) باب النساء کے باہر

مؤلف اور بیگم قمر اعجاز میدانِ عرفات کے
جبلِ رحمت پر۔ عقب میں سفید ستون جہاں
سرورِ کائنات نے حجۃ الوداع کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا

ایک علیحدہ کمرہ میں لٹا کر خود باورچی خانہ میں کام کرنے چلی گئیں. کہ دفعتاً اُنہوں نے ایک چیخ سنی. بھاگ کر واپس آئیں تو دیکھا کہ بچہ کے گال پر سُرخی مائل طمانچہ کا نشان موجود تھا اور منہ سے جھاگ چھوٹی ہوئی تھی. اس کے ساتھ ہی یہ معصوم بچہ عالمِ جاودانی کو سدھار چکا تھا. یوں یہ نومولود ایک ماہ اور دس یوم اس دارِ فانی میں گذار کر داغِ مفارقت دے گیا ؎

پھُول تو کھِل کر بہار جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھِلے مرجھا گئے

آج تک یہ عقدہ حل نہ ہو سکا. کہ اس بچہ کی موت آیا بخار کی شدت کی بناء پر ہوئی یا وہ کسی آسیب کا شکار ہو کر فوت ہوا. بہر حال اللہ کے کاموں میں کِسے دخل ہے۔ اُسے یوُں ہی منظور تھا. اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ؏

وہی ہوتا ہے ، جو منظورِ خدا ہوتا ہے

میاں محمد اقبال کے تیسرے صاحبزادے میاں محمد افتخار نبی ۲۰ مئی ۱۹۲۴ء بروز منگل تولد ہوئے. اُس وقت میاں محمد اقبال نبی مکمل طور پر مرض الموت کے ہاتھوں مجبور اور صاحبِ فراش تھے. میاں محمد افتخار نبی غایت درجہ حسین اور متوازن ناک نقشہ کے حامل پیارے سے بچے تھے۔ والد ماجد ہر ایک سے اپنے اس نومولود کے بارہ میں دریافت کرتے اور اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے. لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی. میاں افتخار نبی ابھی بمشکل ایک ماہ اور دس یوم کے تھے کہ اُن کے بیمار والد اللہ کو پیارے ہو گئے. میاں افتخار نبی اپنے بھائی اور والدہ کے ساتھ اب اپنے دادا جان میاں نبی بخش کی کفالت میں پرورش پاتے رہے. ابتدائی پرائمری تعلیم اُنہوں نے چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول گجرات میں حاصل کی جس کے

مڈل اور میٹرک زمیندارہ ہائی سکول میں پاس کیا۔ بعدہٗ زمیندارہ کالج گجرات میں ایف اے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے کے حصول کے بعد اپنے والد اور دادا کی وفات کی وجہ سے فکرِ معاش میں سرگرداں ہوئے طبیعت میں جلد بازی سیماب پائی۔ اور کچھ کر گزرنے کی اُمنگ دل میں چٹکیاں لیتی۔ اپنے بڑے بھائی (مؤلف) کے ملازمت پر گھر سے باہر چلے جانے کی صورت میں گھر کی نگہداشت اور کسی بزرگ کے دستِ شفقت کی عدم موجودگی کی وجہ سے طبیعت میں لاپرواہی اور خودسری پیدا ہو گئی۔ اور یوں اُنہوں نے اپنے لیئے راہیں خود متعین کیں۔ کالج کی بے فکری کے زمانہ میں اُنہوں نے نوجوان مقرر۔ بے باک اور نڈر صاف گو نوجوان کی صورت میں نام پیدا کیا۔ والد کے اندوختہ کی اُن کے نام بنک کی طرف سے منتقلی نے فکرِ معاش سے کسی قدر اُنہیں خاصہ عرصہ کے لیئے مستغنی کر رکھا تھا۔ اس لیئے وہ کسی کو خاطر میں کم ہی لاتے تھے۔ بالآخر دوسری جنگِ عظیم کے دوران اُنہوں نے اپنے تایا میاں مختار نبی کی وساطت سے بطور گراؤنڈ انجنیئر رائل ایئر فورس اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فوج کی پابند اور محنت طلب زندگی میں وہ خود کو چنداں مطمئن نہ پاتے تھے۔ اس لیئے جلد ہی اس سے اُنہوں نے بہت کوشش کے بعد خلاصی پائی۔ پھر خود ہی اُس دور میں محکمہ خوراک گجرات میں درخواست گزار کر بطور کلرک بھرتی ہو گئے۔ قریباً سال بھر یہاں کام کرنے کے بعد طبیعت اس سے بھی سیر ہو گئی۔ اب ایک دفعہ پھر وہ بے کار ہو گئے، اپنی جدّی اراضی اُنہوں نے فروخت کر دی۔ اور اس طرح والد کی جانب سے اندوختہ کے خاتمہ کی کمی کو پورا کیا۔ ساتھ ہی اُنہوں نے محکمہ ریلوے میں بطور ٹکٹ کلکٹر

میاں محمّد افتخار نبی صاحب

ملازمت کر لی۔ اسی دوران اُن کی شادی ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگے۔
کہ ریلوے کی ملازمت اُن کی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے کفیل
نہیں ہو گی۔ چنانچہ اسے بھی اُنہوں نے خیر باد کہا۔ اور ایک عزیز کے
ایماء پہ کامرشل سٹال و پاٹری ورکس کی تشکیل کر کے حکیم دتہ پہاڑہ
ضلع ڈیرہ دون (بھارت) منتقل ہو گئے۔ یہاں اُنہوں نے کچھ عرصہ کام کیا۔
اور مستقلاً تجارت کا پیشہ اپنانے کی ٹھان لی۔ لیکن اس دوران محنت
کی وجہ سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ کاروبار
بھی چھوڑ چھاڑ وہ واپس گجرات آ گئے۔ تقسیم ملک کا زمانہ تھا۔ سال ۱۹۴۷ء
کے آغاز میں وہ اپنے چند عزیز نوجوان رشتہ داروں میاں مسعود اختر اور
میاں محمود اختر کے ہمراہ ایران جانے کے لئے بمبئی روانہ ہو گئے۔ لیکن تقسیم
ملک کے ہنگاموں کی دہشتناک خبریں پڑھ کر گجرات واپس لوٹ آئے۔
اور بیرون ملک جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اوائل سال ۱۹۴۸ء
سے ہلکے بخار اور کھانسی میں مبتلا ہو گئے۔ اور مؤلف کی استدعا پر معہ
فیملی اُن کے ہاں اُٹھ آئے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن طبیعت کسی
طرح نہ سنبھلی۔ چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو خود اعتمادی۔ خاندانی وجاہت
خوش پوشی۔ بے باکی اور تواضع کا یہ حسین پیکر خالق حقیقی سے جا ملا
اور یوں اپنے واحد بھائی (مؤلف) کو اس بھری دنیا میں یکہ و تنہا
چھوڑ گیا۔ والدہ کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا اور خاندان کا
ہر فرد کچھ اس طرح نوحہ خوان تھا جیسے زبان بے زبانی سے گویا ہو کہ ؎

آہ ہم سب سے سرگرداں ہو کر
تم کہاں چل دیئے جواں ہو کر

مرحوم کی تدفین مسجد بیگم پورہ کی حدود میں اپنے والدِ مرحوم کے پہلو
میں آبائی قبرستان میں عمل میں لائی گئی اور یوں یہ سیمابی صفت کا حامل
نوجوان قوم اپنی مختصر سی زندگی میں گرم و سرد دوران کا ایک ساتھ نظارہ
کرنے کے بعد ابدی نیند سو گیا اس کی بیوہ چند یوم بعد اپنے میکے چلی گئی۔
اور وہاں اُس نے عقدِ ثانی کے بعد اپنی نئی دنیا بسالی۔ میاں محمد افتخار بھی
کی زندگی تمام تر ایک وسیع تجربہ گاہ بنی رہی جس میں انہوں نے سود و زیاں سے
قطع نظر کبھی زندگی کو زمانہ کے تیز دھارے پر چھوڑا اور کبھی اس کے
مخالف سمت تیر کر حصولِ منزل کی تلاش کی۔ وہ ایک ہمدرد بھائی۔
مخلص دوست۔ فراخ طبیعت رشتہ دار۔ خوش پوش نوجوان۔ زیرک اور
شگفتہ مزاج فرزندِ قوم تھے۔ جب تک زندہ رہے۔ بھرپور زندگی بسر کی اور
جب وفات پائی تو "پیسہ نہ رکھ کفن کر" کے مصداق سرخرو حاضرِ حق ہوئے۔
ادبی ذوق اور انگریزی بول چال میں اہلِ زبان کی سی دسترس
رکھتے تھے۔ غرضیکہ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ جنہیں اگر
کسی شفیق بزرگ کی پناہ میسر آجاتی تو اُن کے محاسن اور نکھر کر سامنے
آجاتے اور قوم و خاندان کے لیئے باعثِ فخر و افتخار ثابت ہوتے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میاں نورو خاں کے چوتھے فرزند میاں گیلانی بخش تھے۔ جو سال
۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں پرائمری تعلیم کے لیئے
سکول میں داخل کیئے گئے۔ اور پھر حصہ مڈل میں داخلہ لیا سال ۱۸۸۱ء
میں مڈل پاس کرنے کے بعد فارغ التحصیل ہوئے۔ جوانی میں ہی

گھوڑ سواری میں کمال حاصل کیا۔ بہت وجیہہ۔ تنومند۔ قدآور۔ خوش پوش
اور خوش پوشاک ہونے کے علاوہ ذوقِ سلیم کے حامل رنگین مزاج
اور رکھ رکھاؤ کے فردِ قوم تھے۔ چونکہ سرکاری ملازمت کی طرف اُن کا
رجحان نہیں تھا۔ اس لیے ابتداً بطور رئیسِ شہر گھوڑے پر سوار اپنی
اراضیات کو جاتے اور جدّی اراضیاتِ کنبہ کا انتظام و انصرام کرنے
تک اپنے کو مشغول رکھتے۔ علاقہ میں نہایت عزت اور وقار کی گزران
کے باعث نہایت ہی احترام سے دیکھے جاتے۔ اُن کی آواز اپنے برادرِ
بزرگ میاں نبی بخش کی طرح پاٹ دار تھی۔ اور انہی کی طرح دراز قامت
گندم گوں رنگت اور انتظامی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ عین جوان سالی
میں اُن کی شادی ہوئی۔ پہلی بیوی کے ہاں سے صرف دو لپسران ہی متولد
ہوئے اور وہ زوجہ وفات پاگئیں۔ اُنھوں نے عقدِ ثانی موضع کھیڑا نوالہ
کی ایک دوشیزہ سے کیا۔ لیکن اُن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ میاں گیلانی
بخش نے عملی زندگی میں صرف میونسپل کمیٹی گجرات کی ملازمت بطور
داروغہ صفائی شہر گجرات کی۔ اُن کی انتظامی خوبیوں کے اپنے اور
پرائے سبھی معترف تھے۔ اُن کا رعب دبدبہ بطور داروغہ صفائی تمام
شہر میں مثالی تھا۔ اپنی مدتِ ملازمت کمیٹی گجرات مکمل کرنے کے بعد وہ
کل وقتی نگرانی اراضیات جدّی کی کرنے لگے۔ عام طور پر علی الصبح
ناشتہ کے بعد گھر سے گھوڑے پر سوار چاہ ٹھاکر والا موضع بانٹھ جو کہ
اُن کے گھر سے بمشکل ایک میل کی مسافت پر ہے چلے جاتے۔ دوپہر کا
کھانا مزارعہ گھر سے اُن کے لیے لے جاتا۔ اور بھینس کا دودھ دوہنے
کے لیے صبح و شام بھی مزارعین میں سے ہر ایک باری باری اُن کے ہاں

آیا کرتا۔ چاہ ٹھاکر والہ پہ ایک چھوٹا سا پھلدار درختوں کا باغیچہ اور پھولوں کی کیاریاں بھی اُنہوں نے اپنے شوق باغبانی کی تسکین کے لیئے مشترکہ اراضی میں لگوا رکھا تھا۔ جب بھی اُن کے کُنبہ یا اُن کے دوسرے حصّہ دار چاہ ٹھاکر والہ میاں نبی بخش یا اُن کے افرادِ کنبہ وہاں آتے تو باغ اور اُس کے نواح میں مکمّل پردہ ہوتا۔ کوئی مزارعہ یا راہرو اُس طرف آنے کی جرأت نہ کرتا اراضیات کی دیکھ بھال اور اُن کا انتظام نہایت حسن و خوبی سے کیا کرتے۔
وہ فقراء کے بھی معتقد تھے اور اکثر خانقاہ حضرت شاہ جہانگیر واقعہ موضع غازی کھوکھر حاضری دیا کرتے۔ ایک دن خانقاہ مذکور کے جانشین و گدی نشین سیّد محکم شاہ نے میاں صاحب کو اپنا سرکش گھوڑا سدھارنے کیلئے کہا۔ اُس کی آرزو کی تکمیل کے لیئے میاں صاحب بلا معاوضہ ڈیڑھ ماہ تک گھوڑے کو رواں کرتے رہے۔ وہ خود ایک جگہ کھڑے ہو کر ایک لمبے رسّہ سے گھوڑے کو چابک کی ضرب سے ایک گول دائرہ میں گھنٹہ بھر دوڑاتے جس سے جانور سردیوں کے ایام میں بھی پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ اس کے بعد اُس کی پُشت پر زین کس کر سواری کرتے اور اس معمول کو دُہراتے رہے۔ اس مشقت کے دوران ایک رات سیّد محکم شاہ چراغی جلانے کے لیئے مزار حضرت شاہ جہانگیر میں گئے تو اُن پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اور اسی لمحہ صاحب قبر نے اُنہیں فرمایا کہ تم کام تو لیتے ہو لیکن سفید پوشں کو کپڑوں کی دھلائی تک نہیں دیتے۔ اگلی صبح جب میاں صاحب گھوڑے کو سدھارنے سے فارغ ہوئے تو سید محکم شاہ نے اُنہیں اپنا دوپٹہ جو میاں صاحب اکثر اپنے گلے میں دیگر شرفاء شہر کی طرح لٹکائے رکھتے تھے کھو لینے کو کہا۔ میاں صاحب نے تعمیلِ حکم کی۔

شاہ صاحب نے اس میں روپے ڈال دیتے اور میاں صاحب نے اُس کو پلّو میں باندھ لیا۔ گھر پر گنتی کی تو پورے چالیس دنوں کے حساب سے مبلغ چالیس روپے تھے۔ گھوڑے کی سدھائی کے بعد جب کبھی میاں صاحب دربارِ شاہ جہانگیر پر حاضری دیتے تو شاہ صاحب اسی قدر رقم اُن کی جھولی میں اصرار کر کے ڈال دیتے کہ یہ درویش کے حکم کی اتباع میں تھا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور میاں نبی بخش کی زندگی بھر ستمبر ۱۹۳۰ء تک میاں گیلانی بخش اپنی صوابدید کے مطابق مشترکہ اراضی کا انتظام و انصرام کرتے رہے۔ اپنے بھائی کے ایامِ مرض الموت میں اراضی کے حاصل اور پیداوار کے حصّہ کی تقسیم کے سلسلہ میں بھائیوں میں عدم فہمیدِ حساب کی وجہ سے ایک دو سال سے رنجیدگی پیدا ہو گئی اور پھر یہی صورتِ حال تھی جب میاں نبی بخش نے رحلت فرمائی۔ اُس وقت میاں گیلانی بخش بھی بیمار تھے اس لیے اُن کی اپنے ایثار پیشہ برادرِ بزرگ سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ بعد میں تندرست ہونے پر وہ اکثر اپنی بیوہ بھاوجہ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اراضی مشترکہ کی تقسیم اور ملحقہ کھیتوں کی حدبندی کے تنازعہ کی وجہ سے میاں گیلانی بخش اور اُن کے نامور بھتیجے میاں مختار نبی میں عدالتی نزاع چند سال رہا اور اس طرح سرکاری طور پر تقسیم اراضی کے باوجود پھر چچا بھتیجے میں زندگی بھر پہلے سے مراسم استوار نہ رہ سکے۔ اسی عالم میں میاں گیلانی بخش بیمار پڑے اور آخر ۲۳ نومبر ۱۹۴۴ء کو واصل بحق ہوئے۔ اُن کی دو اولادیں میاں نو بہار الدین اور میاں

فضل بہار الدین پہلی زوجہ سے ہی ہوئیں۔ میاں فضل بہار الدین صغیر سنی
میں ہی اپنی والدہ کی موجودگی میں فوت ہو گئے۔ اس طرح میاں گیلانی
بخش کا سلسلۂ ذکور و اناث اُن کے پسر میاں نوبہار الدین سے چلا۔
میاں گیلانی بخش کے صاحبزادے میاں نوبہار الدین سال ۱۸۸۸ء
میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرائمری اور مڈل کے بعد میٹرک تک تعلیم
حاصل کی۔ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور سب انسپکٹر پولیس
سال ۱۹۱۳ء سے کیا۔ انتظامی استعداد، پُروقار شخصیت۔ رُعب و
دبدبہ۔ ذہانت۔ وجاہت اور کام کی لگن کے خصائل اُنہوں نے اپنے
والدِ گرامی سے ورثہ میں پائے تھے۔ وضع داری۔ بیباکی۔ فرض شناسی
سے متصف ہونے کی بناء پر ملازمت کے دوران کسی کو خاطر میں نہ لاتے
تھے۔ والدین کی خدمت گزاری بھی دلجمعی سے کرتے۔ اپنی سوتیلی
ماں کی ایک سعادتمند پسر کی طرح دلجوئی کرتے۔ اُنہوں نے اپنی ملازمت
کے دوران اضلاع ڈیرہ غازی خان۔ مظفر گڑھ۔ ملتان۔ جہلم اور راولپنڈی
میں بطور سب انسپکٹر انچارج تھانہ ہائے پولیس کام کیا۔ وہ ہندو مسلم
فسادات ملتان کے دوران شہر کے مشہور تھانہ کُپ میں جون ۱۹۱۷ء
میں انچارج تھانہ تھے۔ جواں سالی میں اُنہوں نے کمال مہارت اور
معاملہ فہمی کا ثبوت دیا اور شہر کے امن و امان کو سنبھالا دیا۔ جس پر ہر کہ و
مہ نے اُنہیں خراجِ عقیدت ادا کیا۔ اُن کو اراضیات کی خرید سے
بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُن کے اندوختہ سے اُن کے والد نے موضع
بانسٹھ میں جدّی اراضی کے علاوہ اور زرعی اراضی بھی آبادی گاؤں مذکور
سے ملحق خرید کی۔ اُن کی پہلی شادی اپنے تایا میاں نبی بخش کی دُختر کلاں

میاں نوبہار الدین صاحب

میاں محمد ظفر صاحب

میاں محمد مسعود اختر صاحب
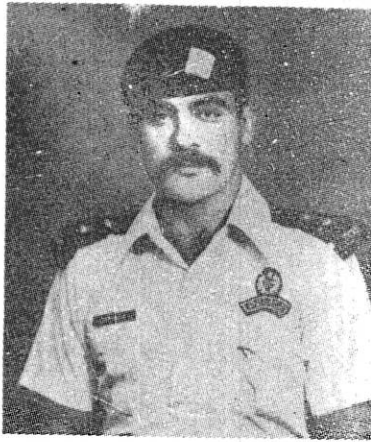
میاں محمد محبوب اختر صاحب سب انسپکٹر پولیس

سے سال ۱۹۱۸ء میں ہوئی جن کے بطن سے علاوہ ایک صاحبزادی کے
چار لڑکے میاں محمد ناصر - میاں محمد ظفر - میاں محمد اختر اور میاں سلیم اختر
تولد ہوئے - اپنی وفا کیش - صاحبِ اوصاف اور گھریلو قسم کی ذی وقار
زوجہ کی وفات کے کچھ سال بعد میاں نوبہار الدین کے عقدِ ثانی کی بات
میاں محمد اشرف کی دُخترِ ثانی کے بارہ میں چلتی رہی - تاآنکہ یہ بات طے
ہوگئی - عین نکاح کے دن حق مہر پر فریقین میں غلط فہمی کی بنا پر بارات
واپس ہوگئی اور اس طرح میاں محمد اشرف کے لیے تشویش اور رنجش
کے مواقع پیدا ہو گئے - چونکہ بارات کی واپسی کا اعلان میاں مختار نبی
نے بدیں الفاظ کیا تھا کہ "حضرات باہمی تصفیہ کے بعد آپ کو تشریف
آوری کی مکرر زحمت دی جائے گی" - اس لیے یہ سمجھا گیا کہ شاید اُن
کی وجہ سے ہی حق مہر کا تنازعہ پیدا ہوا ہے - لیکن یہ بات حقیقت
سے کوسوں دُور تھی - اُنہوں نے صرف اپنے چچا میاں گیلانی بخش کی
تعمیلِ حکم میں بطریقِ احسن برادری والوں کو واپس بھجوایا تھا - بہرحال
کچھ عرصہ کی گفت و شنید کے بعد میاں نوبہار الدین کا عقدِ ثانی میاں
محمد اشرف کی صاحبزادی مذکور سے ہوگیا - اور اس طرح یہ معاملہ بخوبی
طے ہوگیا لیکن میاں محمد اشرف اور اُن کی فیملی سے میاں نبی بخش اور
اُن کی فیملی کے تعلقات کشیدہ ہی رہے اور باوجود ایک ہی محلہ میں
رہائش پذیر ہونے کے دِلوں میں گرہ بیٹھی رہی - اگرچہ ظاہری علیک
سلیک موجود تھی لیکن عملی طور پر لین دین قطعی بند رہا - اور اسی کیفیت
میں بزرگان کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا - میاں نوبہار الدین کے
ہاں زوجۂ ثانی سے تین صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے میاں محمد محمود اختر

میاں محمد مسعود اختر اور میاں محمد محبوب اختر تولد ہوئے۔ میاں نوبہار الدین
مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد سال ۱۹۴۳ء میں بطور سب انسپکٹر
پولیس ہی ریٹائر ہو گئے۔ لیکن ایک قابل پولیس افسر اور ماہر تفتیش کنندہ
ہونے کی بنا پر اُن کو محکمۂ انسداد رشوت ستانی مرکزی حکومت ہندوستان
میں بطور انسپکٹر پولیس بعد از ریٹائرمنٹ پھر رکھ لیا گیا اور اسی ملازمت
ثانی کے دوران وہ ۹ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو قیام پاکستان سے کچھ ماہ پہلے
وفات پا گئے۔ اُن کے وصال کے چند سال پہلے اراضی مشترکہ واقع
چاہ ٹھاکر دوالہ موضع بانٹھ پر ایک کھیت کی حد براری کے سلسلہ میں میاں
مختار نبی سے اختلافات کی بنا پر تعلقات چنداں خوشگوار نہ رہے تھے۔
اور عدالتی تصفیہ کے باوجود یہ اختلافات فریقین کی وفات تک جاری
رہے۔ اگرچہ اُن کی اولادیں باہم ملتی رہیں اور ایک دوسرے کا ہر طرح
سے احترام کرتی ہیں۔ اس عدالتی چارہ جوئی سے نہ صرف اراضیات
کی باہمی تقسیم عمل میں آگئی بلکہ باہمی وفاداریاں بھی بٹ گئیں۔ بہرحال یہ
بزرگوں کے اصول کی بات تھی۔ نئی پود نے جس کو اراضیات کے انتظام
میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی نہ تو اس قدیمی نزاع کو کوئی اہمیت دی اور
نہ پھر ایک دوسرے سے اس موضوع پر گفت و شنید کی۔ اُن کے
باہمی مراسم بفضلِ خدا معتدل ہیں اور بڑوں کے بارہ میں وہ اسی جملہ پر
اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

رموزِ مملکتِ خویش خُسرواں دانند

میاں نوبہار الدین کی زوجہ اوّل سے اُن کے صاحبزادے میاں محمد ناصر
اور میاں محمد اختر صغیر سنی میں ہی اپنی واحد ہمشیرہ کے ساتھ ساتھ اللہ کو

پیارے ہو گئے۔ صرف دو اولادیں میاں محمد ظفر اور میاں محمد سلیم اختر پروان چڑھیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

میاں محمد ظفر ۲۷ اگست ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور میٹرک کے بعد ایف اے انہوں نے سال ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج گجرات سے کیا اور اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے سال ۱۹۳۹ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا۔ گریجوایشن کے چند سال بعد ملازمت کے حصول میں گزر گئے۔ بالآخر سال ۱۹۴۳ء میں راولپنڈی میں آرڈیننس ڈپو میں بطور سویلین گزیٹڈ آفیسر (کلاس II) بھرتی ہوئے۔ جو کہ بعد آرڈیننس آفیسر سویلین کے نام سے منسوب کی گئی۔ اپنی اس ملازمت کے دوران انہوں نے جنگِ عظیم دوم میں صوبہ بہار۔ بنگال اور آسام میں خدمات سرانجام دیں۔ علاوہ ازیں وہ نوشہرہ۔ راولپنڈی۔ جہلم۔ لاہور اور کوئٹہ بھی اسی حیثیت میں تعینات رہے۔ جہاں تک بھرتی کے وقت سے اختتام ملازمت کا تعلق ہے انہوں نے اپنے والدِ محترم کی طرح ایک ہی منصب پر قائمی کی روایت کو برقرار رکھا اور یکم جون ۱۹۷۱ء کو اپنی صوابدید پر ریٹائرمنٹ بطور آرڈیننس آفیسر سویلین ہی حاصل کی۔ وہ بیباک۔ معاملہ فہم۔ فرض شناس اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے حامل کارندہ سرکار تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر۔ کامیاب صاحبِ قلم۔ انگریزی گفتگو اور طرزِ کلام میں اہلِ زبان کے ہم پلہ ہیں۔ اپنی معلومات اور تجاویز سے دوسروں کو حتمی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ انہوں نے ملازمت کے دوران اپنے حصہ اراضی اور جدی مکان کو اپنی سوتیلی والدہ اور بھائیوں کی تحویل میں دیئے رکھا اور

کبھی اس بارہ میں اُن سے تعرض نہیں کیا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ
پر وہ راولپنڈی سے اپنے وطن گجرات لوٹ آئے اور یہاں آکر اپنی
جدی اراضی اور مکان کی تقسیم کے بعد معہ فیملی فروکش ہوئے۔ وہ اپنے
زمانۂ طالب علمی میں فٹ بال کے اعلیٰ درجہ کے کھلاڑی تھے اور کالج
کی طرف سے متعدد بار یونیورسٹی میچوں میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج
گجرات اور گورنمنٹ کالج لاہور کی نمائندگی کرتے رہے۔ سال ۱۹۷۱ء
میں ہی وہ سرزمینِ حجازِ مقدس میں تلاش روزگار کے لیے پانچ
چھ ماہ تک مقیم رہے اور اُسی سال سعادتِ حج سے بھی مشرف
ہوتے۔ وطن واپسی پر صرف ایک ماہ کے لیے سروس شوز فیکٹری
گجرات میں ملازمت کی لیکن اُن کی طبع آزاد کو یہ غلامی راس نہ
آئی اور یہ ملازمت اُنہوں نے چھوڑ دی۔ اب وہ پھر ہمہ وقت
اراضی جدی کے انتظام و انصرام میں لگ گئے۔ آج کل وہ بیرونِ
ملک جانے کی کوشش چھوڑ کر پھر سروس فیکٹری گجرات میں کام کر
رہے ہیں ـــــــــ اُن کی شادی اپنے والد کے ماموں زاد
بھائی کی دختر سے اُن کی ملازمت سرکار کے جلد ہی بعد ہو گئی۔
جن کے بطن سے دو صاحبزادیاں اور ایک فرزند میاں محمد بلال
تولد ہوئے۔

میاں محمد ظفر صاحب کے فرزند میاں محمد بلال ۱۹؍اپریل ۱۹۵۲ء
کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے واحد پسر ہونے کے سبب ماں باپ
اور بزرگ بہنوں کی عزیز ترین متاع ہیں۔ وہ خوش شکل۔ دراز قد۔
سُرخ و سفید۔ وجیہہ اور محنتی نوجوان ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد زمیندارہ

کالج گجرات میں اُنہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ ابھی بی۔ اے
پاس نہ کر پائے تھے کہ سال ۱۹۷۵ء میں سروسز انڈسٹریز ٹیکسٹائیل
گجرات میں ملازم ہو گئے۔ جہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ سال
۱۹۷۶ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا۔ وہ تکنیکی علم بھی سیکھ رہے
ہیں۔ آج کل وہ فیکٹری مذکور کے سٹور کے آفیسر انچارج ہیں۔ وہ
ایک انتہائی ذمہ دار۔ تابعدار۔ محنتی۔ ذہین اور خوش خلق نوجوان
ہیں۔ اُن کا حلقۂ احباب خاصا وسیع ہے۔ اپنے والد کی طرح انگریزی
بول چال میں خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے قیام کالج اور سکول
میں کھیلوں۔ ورزش اور پولٹیکل تحریکوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے ہیں
میاں نوبہارالدین کی زوجۂ اوّل سے اُن کے دوسرے صاحبزادے
میاں محمد سلیم اختر سال ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوتے۔ وہ انتہائی صحت مند
دراز قامت، اور سلیم الطبع نوجوان تھے۔ اُنہوں نے مڈل تک تعلیم
پائی۔ مرگی کے موذی مرض کا شکار ہونے کے باعث وہ اپنی اعلیٰ
تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ جوانی کے آغاز سے یہ دورے بڑھتے گئے
والدہ کا انتقال سال ۱۹۲۴ء میں ہو چکا تھا۔ والد اس دوران نکاح
ثانی کر چکے تھے اس لیے وہ اپنے دادا اور دادی کی تحویل میں
پرورش پانے لگے۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ اپنے گھر واقع تنبل بازار
سے صبح صبح ہی اپنے ننہال محلہ چابکسواراں آجاتے۔ یہاں اپنی
نانی اور مامی (والدہ مؤلف) سے وہ بہت مانوس تھے۔ اُن کے
پاس بیٹھ کر اپنی والدہ مرحومہ کی باتیں بہت اشتیاق اور عقیدت سے
سنتے۔ اکثر اوقات ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی اپنی نانی کی معیت

میں تناول کرتے ۔ یہاں پر بھی وہ اکثر مرگی کے دورہ کا شکار ہو جاتے
اور کافی عرصہ بے حال اور بلا شد بُدھ پڑے رہنے کے بعد
ہوش میں آتے ہی اپنے گھر کی راہ لیتے ۔ متعدد دفعہ دورانِ راہ
اُنہیں بازار میں ہی اس موذی مرض کے دورے پڑ جاتے اور اطلاع
ملنے پر اُن کے لواحقین اُن کی خبر گیری کرتے اور ہوش آتے ہی
اُنہیں گھر لے جاتے ۔ بلوغت کے بعد پڑنے والے دوروں میں بے قابو
ہو جاتے اور اُن کو قابو میں لانا کسی کے بس کا روگ نہ ہوتا ۔ چنانچہ اُن
کے اہلِ خانہ اُن کو زنجیروں سے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیتے تاکہ
وہ گھر سے باہر نہ نکل سکیں ۔ لیکن ننہال سے اُن کی عقیدت و محبت
اُنہیں پا بہ جولاں بھی محلہ چابکسواراں میں لے آتی ۔ مؤلف نے خود
کئی مرتبہ ایسی حالت میں اُن کو مکان کی منزل پر چڑھایا جبکہ اُن کے
پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں ۔ وہ کہا کرتے کہ میں اپنی امّی کی
باتیں سننے کے لیے نانی اماں اور ماموں جی کے پاس آتا ہوں اور گھر
والے مجھے زنجیریں ڈال کر آنے سے روکتے ہیں ۔ وہ انتہائی سمجھدار
حاضر دماغ ۔ وجیہہ اور حساس نوجوان تھے جو بیماری کے ہاتھوں انتہائی
طور پر مجبور تھے ۔ رُک رُک کر بہت ہی پیاری پیاری باتیں کیا کرتے
آخر اسی مرض میں مبتلا وہ سال ۱۹۴۳ء میں داصل بحق ہوئے ۔

گھر والوں سے شکوہ سہی، امّی سے محبت
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور!

میاں نوبہار الدین کی زوجۂ ثانی سے سب سے بڑے فرزند میاں
محمد محمود اختر ۱۶ ستمبر ۱۹۲۹ء بروز اتوار تولد ہوئے ۔ وہ بہت

ہی سُرخ وسفید۔ گول مٹول اور پیارے سے بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے
بعد اُنہوں نے میٹرک اور پھر ایف اے تک تعلیم حاصل کی کہ والد کا سایہ
سر سے اُٹھ گیا۔ گھر میں سبھی اُنہیں لاڈ پیار سے پیش آتے۔ دادا والد سے
بھی دو سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔ گجرات میں وہ گھر میں سب سے
بڑے مرد ہونے کی بنا پر خود سر ہو گئے۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔
اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ قریباً ایک مربعہ اراضی موضع بانٹھ ملحقہ شہر گجرات
خاندان کی ملکیت تھی۔ جو حتمی طور پر اُن کی تحویل میں تھی۔ دن آسودگی
سے گزرتے رہے۔ بعد میں اُنہوں نے چند غرض مند اصحاب کے
ایما پر زمین کی مٹی کھدوانے اور اینٹ کے بھٹہ والوں کے پاس
فروخت کرنے میں سہولت خیال کی اور یوں تھوڑی سی اراضی کے علاوہ
تمام مشترکہ اراضی گڑھوں کی صورت اختیار کر گئی۔ چند سال اُنہوں نے
سیر و تفریح اور عیش و نشاط میں بسر کیے۔ بالآخر سال ۱۹۴۹ء میں افواج
پاکستان میں بطور سپاہی بھرتی ہو گئے۔ شدہ شدہ وہ حوالدار اور پھر
نائب صوبیدار ہو گئے۔ لیکن بایں ہمہ اُن کی رنگینی مزاج میں کوئی فرق
نہ آیا۔ اُن کی شادی سال ۱۹۶۱ء میں اُن کی سوتیلی دادی کے رشتہ دار
موضع کیپڑانوالہ ضلع گجرات کی ایک قبول صورت دوشیزہ سے ہو گئی۔
جس کے بطن سے علاوہ دو دختران چار صاحبزادے میاں عامر ذیشان
میاں طاہر محمود۔ میاں طیب محمود اور میاں قاسم محمود تولد ہوتے۔ میاں
عامر ذیشان ۲۷ جولائی ۱۹۶۲ء کو میاں طاہر محمود ۳۰ جولائی ۱۹۶۴ء
کو میاں طیب محمود ۲۹ جون ۱۹۶۶ء کو اور میاں قاسم محمود ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء
کو علی الترتیب پیدا ہوئے۔ اوّل الذکر تینوں صاحبزادے سکول میں پڑھ

رہے ہیں۔ حال ہی میں میاں محمد محمود اختر نے اپنے حصّہ کی جملہ جدّی اراضی فروخت کردی ہے اور اب زرعی اراضی سے اُن کا کوئی واسطہ باقی نہیں رہا۔ میاں نوبہار الدین کے لڑکے میاں محمد مسعود اختر ۲۵ر جولائی سال ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنی پرائمری اور مڈل تعلیم کے بعد اُنہوں نے میٹرک پاس کیا۔ لیکن لااُبالی طبیعت اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل نہ ہوئی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی کی عدم موجودگی کی بنا پر اراضیاتِ جدّی کا انتظام و انصرام اور اراضی کی احداثی میں اُنہوں نے بھی نمایاں حصّہ لیا۔ گھوڑ سواری کا بہت ہی شوق تھا۔ طبیعت آزادہ روی کی شائق اور کسی بھی گھریلو پابندی سے گریزاں تھی۔ چنانچہ سلسلۂ تعلیم منقطع ہوتے ہی دُنیا کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ موضع بانٹھ تحصیل گجرات کی آبادی سے ملحقہ اپنے والد کی خرید کردہ اراضی پر جو خانگی تقسیم میں اُن کے حصّہ میں آئی اُنہوں نے رہائشی تعمیر عمل میں لاتے ہوئے دسمبر سال ۱۹۶۴ء میں اپنی پسند کی شادی کرلی اور آج کل بھی وہیں اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ مقیم ہیں۔ اہلِ خاندان کے رنج و خوشی میں دونوں میاں بیوی شریک ہوتے ہیں۔ میاں محمد مسعود اختر بہت ہی خوش اخلاق۔ محنتی اور رکھ رکھاؤ کے نوجوان ہیں۔ اپنی سواری کے شوق کی تسکین کے لیے اچھی نسل کا گھوڑا اب بھی اُن کے پاس موجود ہے۔ جس پر سوار ہوکر وہ اپنی والدہ محترمہ کو ملنے اکثر شہر میں آتے رہتے ہیں۔

میاں نوبہار الدین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد محبوب اختر یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو تولّد ہوئے۔ وہ نہایت ہی خوبصورت نازک اندام اور صحت مند بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اُنہوں نے

میٹرک پاس کیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لیا۔ اور اپنی محنت لگن اور جذبہ سے بی اے پاس کیا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں وہ بطور اے ایس۔ آئی محکمہ پولیس پنجاب سے سیلیکٹ گئے۔ اپنی ابتدائی ٹریننگ کے بعد آج کل وہ اسلام آباد میں شعبہ ٹریفک پولیس میں بطور سارجنٹ منسلک ہیں۔ وہ دراز قامت۔ وجیہہ۔ حوصلہ مند۔ فرض شناس اور معاملہ فہم نوجوان ہیں۔ اُن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔

---

باب یازدہم

# میاں محمد مقصود اور اُن کے وُرثاء

راتے عبدالحکیم کے تیسرے اور سب سے چھوٹے پسر میاں محمد مقصود کے بارہ میں مفصل طور پر معلومات ناپید ہیں۔ کیونکہ اُن کی اولاد میں سے کسی نے بھی اپنی تاریخ اور کارناموں کو بقیدِ تحریر لانے یا روایات کو زندہ رکھنے کی طرف توجہ نہ دی۔ یوں بھی اعلیٰ تعلیم کا فقدان اس کنبہ کی تاریخ کو زمانہ کی گردش کا شکار کرنے کا معاون بنا۔ روایات اور بزرگوں کی زبانی یادداشت ہی وہ ماخذ ہیں جن پر تکیہ کرتے ہوئے خامہ فرسائی ممکن ہے۔ میاں محمد مقصود کے پیشہ اور رزق کمانے کے بارہ میں بھی نقاب کشائی کرنے والے مفقود ہیں۔ بہرحال اس قدر معلومات فراہم ہو سکی ہیں کہ جہاں اُن کے دونوں برادرانِ بزرگ میاں کمال الدین (ملازم فوج) اور میاں محمد اعظم (ملازم مہاراجہ رنجیت سنگھ) تھے وہاں اُنہوں نے بھی گجرات کے اُس وقت کے دیوان کے ہاں منشی گیری کا کام سنبھال لیا۔ اور یوں اپنی روزی کما کر اہلِ کنبہ کا پیٹ پالتے رہے۔ اُن کے ہاں دو پسران ہی میاں چراغدین اور میاں خیرالدین تولد ہوئے۔ انگریزوں کے تسلط گجرات پنجاب کے بعد انگریزی فوجِ سرکار کے رسالہ کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے میاں محمد مقصود بھی اُس دور میں

نمایاں حیثیت کے حامل تھے ۔ ایک روایت کے مطابق وہ اور
امام الدین ڈار دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ذاتی محافظ بھی رہے۔
واللہ اعلم بالصواب ۔
میاں محمد مقصود کے پسر میاں چراغ دین سال ۱۸۲۷ء میں پیدا
ہوئے ۔ اُنہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی اور محکمہ مال میں بطور
پٹواری اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا ۔ وہ قدیم وضع کے دلدادہ اور مستحسن
اقدار کے حامل ۔ خوش پوش ۔ ذہین اور ہمدرد بزرگ تھے ۔ اپنے حلقہ پٹوار
میں مقبول اور صاحب سطوت اہلکار شمار کیے جاتے تھے ۔ لوگ اپنی
اولادوں کی شادیاں تک اُن کے صلاح و مشورہ سے کرتے ۔ اُنہیں
اپنی ملازمت اور اثر و رسوخ کی بنا پر سوسائٹی میں ایک خاص مقام
حاصل تھا ۔ گھر میں آسودگی تھی ۔ اپنی ملازمت کے دوران اپنے اندوختہ
سے اُنہوں نے دو مربعہ اراضی ضلع سرگودھا میں خرید کی ۔ یکے بعد دیگرے
دو شادیاں کیں ۔ لیکن کسی سے اولاد نہ ہوئی ۔ محلہ چابکسواران میں اُن
کی اپنی جدی اقامت گاہ تھی ۔ ملازمت پٹوار سے سبکدوشی کے
بعد اُن کا گزارہ اپنی پیدا کردہ اراضی واقع ضلع سرگودھا پر تھا ۔ اُنہوں
نے انتہائی کوشش کی کہ اُن کے بھتیجوں میں سے کوئی اس اراضی کا
انتظام و انصرام سنبھال لے لیکن اُن میں سے کسی نے بھی پردیس جا کر
بسنا قبول نہ کیا ۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں کے دوران اُنہوں
نے یہ اراضی فروخت کر دی اور وہ اور اُن کی زوجہ اس رقم سے اپنی
گزران کرتے رہے ۔ چونکہ یہ اراضی ضلع سرگودھا کے ایک چک میں
واقعہ تھی اس بنا پر میاں چراغ دین "بابا چک والا" اور اُن کی زوجہ

"اماں چک والی" کے نام سے یاد کیئے جاتے ۔ وہ نہایت ہی حساس اور ہمدرد بزرگ تھے ۔ایک موقعہ پر مؤلف کو اُن کے تایا میاں محمدؐ نظیر الحسن کے ایما پر دادا صاحب میاں نبی بخش نے بحری جہازوں پر ملازمت کے لیے سال ۱۹۲۹ء میں کراچی جانے کے لیے تیار کر دیا۔ میاں چراغ دین کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُنہوں نے مؤلف کی دادی کو واضح الفاظ میں کہا کہ یتیم بچے کو اس صغیر سنی میں کیوں سمندر کی لہروں کے سپرد کرنے پر آپ لوگ تل گئے ہیں ۔ چنانچہ اُن کی سرزنش پر مؤلف کے بارہ میں یہ اقدام خارج از امکان ہوا ورنہ ہر قسم کی تیاری مکمل ہو چکی تھی ۔ اور یوں مؤلف کا سلسلۂ تعلیم جاری رہ سکا ۔ میاں چراغ دین کو بے اولاد ہونے کا احساس اس قدر شدید تھا کہ ایک دفعہ حاضری پر مؤلف کو فرمانے لگے کہ بیٹا وعدہ کرو کہ میری وفات پر میری قبر پر فاتحہ خوانی کیا کرو گے ۔ چنانچہ میں نے وعدہ کر لیا ۔ اور آج تک جب بھی مجھے بیگم پورہ قبرستان میں حاضری کا موقعہ ملتا ہے میں اہتمام سے اُن کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتا ہوں ۔ یہ بزرگ اور نیک طینت انسان بروز ہفتہ ۱۰ رجون ۱۹۳۲ء کو فوت ہوئے ۔ اُن کی عمر ۱۰۵ سال تھی ۔ وہ احاطہ مزار مولانا علاؤالدین محمدؐ یوسف محی الدینؒ میں آسودۂ خاک ہوئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؎

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میاں محمدؐ مقصود کے دوسرے فرزند جن سے اُن کا سلسلۂ ذکور و اناث چلا میاں خیر الدین تھے ۔ اُن کی تاریخ پیدائش کے بارہ میں بھی معلومات مفقود ہیں ۔ ابتدائی تعلیم پرائمری تک تھی ۔ ملازمت

کا آغاز بطور چپڑاسی دفتر ڈپٹی کمشنر گجرات کیا۔ حلیم الطبع۔ سیدھے سادھے
غریب طبیعت۔ باخدا بزرگ تھے۔ جوانی میں شادی ہوئی۔ علاوہ
ایک دختر تین صاحبزادے میاں محمد سرور۔ میاں محمد دین اور
میاں نذر محمد تولد ہوئے۔ اپنی مختصر گنجائش میں بچوں کی تعلیم کی
طرف بساط بھر دھیان دیا۔ اور اُن کی بطریق احسن پرورش میں
کوشاں رہے۔ نہایت مرنجاں مرنج اور اپنے کام سے کام رکھنے
والے انسان تھے۔ کبھی حکام یا اہلکاروں کو شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ جب
تک جیتے ایک عام آدمی کی طرح گزر بسر کی ماسوائے ملازمت سرکار اور
کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ ہاں اُن کے بڑے بھائی میاں چراغ دین
ضرور اُن کی ہر طرح سے اعانت فرماتے۔ میاں خیرالدین اپنے بڑے
بھائی کی موجودگی میں بیمار ہو گئے اور داعی اجل کو لبیک کہا۔

میاں خیرالدین کے بڑے صاحبزادے میاں محمد سرور نے مڈل
تک تعلیم حاصل کی اور سرکاری ضلعی ہسپتال میں بطور کمپونڈر ملازمت
سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ضلع کی متعدد ڈسپنسریوں میں
کام کرنے اور مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ
واقعہ محلہ چابکسواراں گجرات میں بقیہ ایامِ زندگی بسر کرنے چلے آئے۔
انہیں کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا جس کی تسکین کے لیے انہوں نے
نہایت خوبصورت ڈربے اور چھتریاں مکان کی چھت پر بنا رکھی تھیں
زیادہ وقت گھر پر اسی شغل میں گزارتے۔ ملازمت کے دوران اُن
کی شادی ہو چکی تھی۔ اس شادی سے اُن کے ہاں دو پسران ہی میاں
احسان اللہ اور میاں امان اللہ تولد ہوئے۔ میاں محمد سرور کو اپنے پسران

کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ چنانچہ اپنی ملازمت کے دوران اُنہوں نے دونوں بچوں کو سکول میں داخلہ بھی دلوایا۔ وہ ذاتی طور پر نہایت زیرک۔ معاملہ فہم۔ خُوش خلق اور فرض شناس ملازم سرکار تھے۔ تمام عمر میانہ روی میں بسر کی۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پسارے اور نہایت ہی بھرپور اور خودداری کی زندگی گزار کر ۴ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو بعمر ۸۵ سال اس دارِ فانی سے رُخصت ہوئے۔

میاں محمد سرور کے بڑے صاحبزادے میاں محمد احسان اللہ تھے اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور کلرک دفتر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر گجرات کیا۔ وہ دراز قامت۔ خُوش شکل۔ بارعب محنتی اور وضعدار نوجوان تھے۔ اُن کی شادی اپنے چچا میاں محمد دین کی سب سے بڑی صاحبزادی سے ہوئی جو کہ قبول صورت۔ نیک بخت اور سیدھی سادھی گھریلو قسم کی دوشیزہ تھیں۔ اُن کے بطن سے صرف ایک صاحبزادی ہی تولد ہوئی تھی کہ میاں احسان اللہ کی طبیعت اُن سے بھر گئی۔ اگرچہ تاحیات یہ نیک نہاد خاتون اُنہیں کے حبالۂ نکاح میں رہیں پھر بھی میاں احسان اللہ نے اُن کے نان و نفقہ یا حقوق کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور وہ زندگی بھر اپنے حقیقی برادران اور دیور میاں امان اللہ کی زیرِ کفالت رہیں۔ میاں احسان اللہ ترقی یاب ہو کر ہیڈ کلرک دفتر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ہو گئے۔ اور اُنہوں نے ملازمت کے دوران ہی اپنی پسند کی شادی محلہ ہی میں مقیم ایک شادی شدہ خاتون سے کر لی جس کے خاوند سے طلاق لے لی گئی تھی۔ اس خاتون کے بطن سے میاں احسان اللہ کے ہاں علاوہ پانچ صاحبزادیوں کے دو پسران میاں

نصراللہ اور میاں مظہر اللہ تولد ہوئے۔ اپنی ملازمت کے آخری ایام میں میاں احسان اللہ لاہور میں تعینات تھے۔ وہیں اُنہوں نے وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ اُن کے جلد ہی بعد اُن کی زوجۂ ثانی بھی اُن سے جا ملیں اور اُن کے پسران اور دُختران نے لاہور ہی میں مستقلاً رہنا پسند کیا۔ اُن کی بچیوں نے اپنے برادران کی اعانت سے سمن آباد لاہور میں درس وتدریس کا کام شروع کیا اور اس طرح یہ لوگ قوتِ لایموت کے حصول میں سرگرم کار ہو گئے۔

میاں نصراللہ نے مجرد زندگی بسر کرنا مناسب خیال کیا۔ جبکہ میاں مظہر اللہ نے حال ہی میں اپنے ننہال گجرات میں شادی کی ہے۔ میاں احسان اللہ کی زوجۂ اوّل سے واحد دُختر کی شادی ہو چکی ہے۔ جبکہ زوجۂ ثانی سے صرف ایک دُختر کی ازدواجی زندگی اُن کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی ہے۔ دوسری بچیاں تعلیمی وتدریسی زندگی میں منہمک ہیں۔ یہ کُنبہ اب مستقلاً لاہور میں آباد ہے۔ اور بہت ہی کم اپنے گجرات کے جدّی محلہ چاکسواراں میں وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کے والد نے اپنی زندگی میں ہی اپنا حصّہ مکان فروخت کر دیا تھا۔

میاں محمد سرور خان کے پسرِ ثانی میاں محمد امان اللہ خان نے بھی میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ طبعاً وہ منشی گیری کی طرف مائل تھے۔ پہلے پہل ضلع گجرات کی کچہری میں ایک وکیل کی منشی گیری کا پیشہ اختیار کیا۔ یہاں سے تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ اُن کی شادی عین جوانی میں اپنے چچا میاں محمد الدین کی دُخترِ ثانی سے ہو گئی جن کے بطن سے صرف ایک صاحبزادی تولد ہوئی تھی کہ میاں محمد امان اللہ

کا رجحانِ طبع دوسری جانب ہو گیا۔ چنانچہ پہلی منکوحہ کی موجودگی میں ہی اُنہوں نے اپنی پسند کی لاہور ہی سے دوسری شادی کر لی۔ اور دھوبی منڈی۔ پُرانی انارکلی لاہور میں منتقل ہو گئے۔ اس عقدِ ثانی سے اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں محمد امان اللہ نے اپنی محنت، فرض شناسی، ہنرمندی، خلوص اور تجربہ سے وکلاء لاہور اور منشیانِ وکلاء میں خاصا اثر رسوخ پیدا کیا اور متعدد دفعہ وہ وکلاءِ لاہور کے منشیوں کی تنظیم کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنے علاقہ دھوبی منڈی میں اُنہوں نے ایک سماجی تنظیم "اللہ والی ٹولی" کا انعقاد کیا جس کے وہ پہلے کپتان چنے گئے۔ اُنہیں اپنی زوجہ ثانی کے ہمراہ دو مرتبہ سعادتِ حج بیت اللہ نصیب ہوئی۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں ایک مخصوص مقام رکھتے تھے۔ اُنہوں نے عرصہ تک اپنے بڑے بھائی کی منکوحہ اول کو جو اُن کی چچازاد بھی تھیں۔ اپنی بھتیجی کے ساتھ اپنی کفالت میں رکھا اور کسمپرسی کی حالت میں اُن کی خبر گیری کی۔ وہ ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور گجرات میں اپنے دیگر افرادِ کنبہ کی معیت میں قبرستانِ ترہنگی میں آسودۂ خاک ہوتے ہیں۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

میاں خیر الدین کے فرزند ثانی میاں قمر الدین سنِ بلوغت تک پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ بہت خوش شکل اور ذہین فرزند تھے۔

میاں خیر الدین کے تیسرے صاحبزادے میاں محمد الدین نے پرائمری

تک تعلیم پائی۔ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور چپڑاسی تحصیل کیا۔ جوانی میں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ آمدنی کم تھی لیکن کثیر الاولاد تھے۔ غایت درجہ حلیم الطبع اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ اُن کی زوجہ بھی کمال محنت اور مشقت سے اپنی اولاد کی پرورش اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے سلسلہ میں اپنے میاں کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ غایت درجہ شریف اور گھریلو قسم کی خاتون تھی۔ اُن کے بطن سے میاں محمدّالدین کے تین صاحبزادے میاں عبدالحق، میاں محمدّ مرید احمد اور میاں محمدّ بشیر احمد تولد ہوئے۔ اُن کے علاوہ چھ[6] دختران بھی تولد ہوئیں۔ میاں محمدّالدین نے اپنی مدت ملازمت بطور چپڑاسی پوری کرنے کے بعد تھوڑے عرصہ میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کو میاں علاؤالدین محمدّ یوسف محی الدینؒ[7] کی طرف سے مرحمت کردہ غلافِ کعبہ کا ایک ٹکڑا حصہ کفن بنانے اور اس کے ساتھ مدفون ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جملہ خویش و اقارب اُن کی اولاد کے شریکِ غم رہے۔ اور ہر طرح سے اُن کی اعانت اور دلجوئی کرتے رہے۔

میاں محمدّالدین کے سب سے بڑے لڑکے میاں عبدالحق نے بھی معمولی لکھنے پڑھنے تک تعلیم پائی۔ اُن کو عملی زندگی سے روشناس کرنے کے لیے میاں مختار نبی گوڑگانواں (بھارت) میں اپنے ہمراہ لے گئے۔ محکمہ زراعت میں میاں مختار نبی وہاں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر متعین تھے۔ میاں عبدالحق کو وہاں فصلوں کے کیڑے مکوڑے مارنے اور سپرے کرنے پر ملازم کرایا گیا۔ میاں عبدالحق وہاں بہت مشہور ہو گئے۔ وہاں سے میاں مختار نبی کے تبادلہ پر بعدہٗ میاں عبدالحق

راولپنڈی تشریف لے آئے۔ یہاں اُنہیں دفتر میں بطور چپراسی کام کرنے کا موقعہ ملا۔ جس سے وہ مزید تجربہ حاصل کرنے کے بعد ایک منجھے ہوئے کارکن بن گئے۔ میاں مختار نبی نے ان کی ایک خوردسالہ ہمشیرہ کو بھی اپنی کفالت میں لیا اور اُس کی موزوں پرورش فرماکر شاندار طریقہ پر ایک معزز گھرانے میں شادی کردی۔ میاں مختار نبی کی وفات کے بعد میاں عبدالحق کی دستگیری کا سہرا پیجر میاں محمد بشیرالحسن کے سر رہا۔ جنہوں نے اُنہیں بطور پوسٹ مین (چٹھی رساں) محکمہ ڈاک میں ملازم کرادیا۔ اپنی اس ملازمت کے پچیس سال پورے کرنے کے بعد میاں عبدالحق سال ۱۹۷۶ء کے آغاز میں اس شرط پر ملازمت سرکار سے سبکدوش ہوئے کہ اُن کی جگہ اُن کے صاحبزادے کو بھرتی کیا جاوے۔ ملازمت کے دوران ہی میاں عبدالحق کانوں سے مکمل طور پر بہرے ہو گئے تھے۔ اس لیے سبھی خویش واقارب اپنے پرائے نے اُنہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے نہایت فراخدلی سے یہ مشورہ قبول کرتے ہوئے ملازمتِ سرکار کو خیرباد کہا۔ اُن کی شادی جوانی میں ہی ہوگئی تھی اس خاتون کے بطن سے علاوہ دو دختران ان کے چار پسران میاں ضیاءالحق، میاں مظہرالحق، میاں اظہرالحق اور میاں ظفرالحق تولّد ہوئے۔ میاں عبدالحق نے اپنی ملازمت بڑے کروفر سے سرانجام دی۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اور جب کبھی اُن کے محسن ترقی یاب ہوتے تو فرمایا کرتے کہ اُن کی ترقی خود میری ترقی ہے۔

میاں عبدالحق کے سب سے بڑے فرزند میاں ضیاءالحق ہیں۔ اُنہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور چپراسی

دفتر اسسٹنٹ ڈائریکٹر پوسٹل لائف انشورنس گجرات گیا۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح احساس برتری کا شکار ہیں۔ طبیعت میں لاابالی پن بدرجۂ غایت موجود ہے۔ اُن کی شادی سال ۱۹۸۷ء کے آغاز میں اپنی پھوپھی زاد سے ہو چکی ہے۔ اُن کی متلون مزاجی گھر پہ بھی رنگ دکھاتی رہتی ہے۔

میاں عبدالحق کے فرزند ثانی میاں مظہرالحق بھی پرائمری سے آگے تعلیم میں نہیں بڑھ سکے لیکن طبیعت میں انکساری اور احساسِ فرض اُن کی خصوصیات ہیں۔ اُنہوں نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز بطور چپراسی محکمہ پوسٹل لائف انشورنس گجرات کیا ہے۔ وہ ایک ذمہ دار نوجوان ہیں۔ طبیعت میں ٹھہراؤ اور کام کی لگن نے اُنہیں ایک محنتی نوجوان بنا دیا ہے۔ اُن کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔

میاں عبدالحق کے تیسرے صاحبزادے میاں اظہرالحق بھی تعلیم حاصل کرنے میں اپنے دوسرے بھائیوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اُن کے لیے بھی اپنے سب سے بڑے بھائی کی طرح اعلیٰ النسب ہونے کا بھرپور احساس کسی کے آگے خمیدہ سر ہونے سے مانع اور سدِ راہ ہے۔ چند سال وہ ڈاکٹر میاں محمد آفتاب اصغر کے ہاں لاہور میں اقامت گزین رہے۔ اپنی مخصوص جبلت اور احساسِ برتری نے جلد ہی اُنہیں یہ گھر چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا اور اس طرح یہ نوجوان پھر واپس گجرات چلا آیا۔ غالباً اپنی اعلیٰ نسبی کا احساس اُسے معمولی ملازمت کرنے سے بھی باز رکھے ہوتے ہے۔ اور شاید یہی ایک ثبوت اُس کے راجپوت قوم کا ایک فرد ہونے کی ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔ آج کل وہ کشمکشِ حیات میں سرگرداں ہیں۔ غالباً وہ اس احساس سے

کلیتاً عاری ہے کہ ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا

میاں عبدالحق کے سب سے خورد سال لڑکے میاں ظفرالحق ہیں جو بمشکل چھ سال کے ہوں گے لیکن تعلیمی رجحان کا فقدان اور والدہ کی بے وقت وفات کی وجہ سے یوسف بے کارواں کی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ خُدا جانے اُن کا مستقبل کیا ہوگا ؎

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خُدا کی باتیں خدا ہی جانے

میاں محمدّ الدین کے فرزند ثانی میاں محمد مرید احمد نے اپنے گھریلو حالات کے پیشِ نظر قطعی طور پر تعلیم حاصل نہ کی۔ چند سال بعد جب سِن شعور کو پہنچے تو بازار ملحقہ محلہ چابکسواراں میں بابو درزی کی دُکان پر خیاطی سیکھنے بیٹھ گئے۔ دو ایک سال یہاں کام سیکھا اور جب کچھ کام کرنے کے قابل ہوتے تو ملحقہ دوکان لالہ نوبت رائے درزی پر کام کرنے لگے۔ تقسیم ملک کے بعد اُنھوں نے یہیں پر اپنی علیحدہ خیاطی کی دوکان کھول لی۔ غیر متشرع لمبی داڑھی رکھ لی اور خُوب محنت اور لگن سے کام کرنے لگے۔ ایک دفعہ بازار صرافاں سے گزر رہے تھے۔ کہ ایک تانگہ بان نے اُن کے سر پر پگڑی اور لمبی داڑھی کی بنا پر غلطی سے سِکھ شمار کرتے ہوتے آواز دی "سردار جی ذرا بچ کے" اس پر میاں صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ اور اُس تانگہ بان کے خوُب لتے لیے۔ بعد میں کسی عزیز نے اس بے تکی داڑھی پر اعتراض کرتے ہوتے کہا کہ جب آپ مسجد میں کبھی شاذ ہی قدم رکھتے ہیں تو دراز ریشی

کے کیا معنی۔ اس پر پڑے کہ "میں نے اپنے شوق سے رکھی ہوئی ہے کسی کو اس سے کیا"۔ اپنی روزی خود کماتے کسی پر بوجھ بننا گوارا نہ تھا۔ پینتیس ۳۵ یا چالیس کے پیٹے میں ہوں گے کہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ والدہ کی بہت پہلے وفات اور اپنی اُفتادِ طبیعت کے باعث اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی ؎

وہ صُورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں !
دیکھن کو جن کے اب بھی اکھیاں ترستیاں ہیں !

میاں محمد الدین کے تیسرے اور سب سے خورد سال فرزند میاں محمد بشیر احمد مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے بھی معمولی تعلیم حاصل کی۔ وہ جملہ بھائیوں سے متوازن ناک نقشے کے نوجوان ہیں۔ اُنہوں نے بلوغت سے پہلے ہی بابو مہتاب الدین ڈار کی خیاطی کی دُکان پر کام سیکھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک ماہر کاریگر ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے دوران ہی اُن کے اُستاد اور مالکِ دوکان نے اُن کی شادی اپنی دُختر سے کر دی۔ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز سے ہی اُن کو ذمہ داری کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ تاآنکہ اُنہوں نے لاہور منتقل ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چند سال کامیابی سے پُرانی انارکلی لاہور میں خیاطی کی دوکان چلائی۔ ازاں بعد وہ کویت چلے گئے۔ وہاں کافی سال کام کیا۔ اپنی محنت، حُسنِ کارکردگی اور فرض شناسی سے کام کرنے پر خاصا اثاثہ فراہم کرتے ہوئے اپنی اولاد کی جو گجرات میں اپنی والدہ کی کفالت میں تھے تعلیم و تربیت کا اعلیٰ انتظام کیا۔ معقول رقم باقاعدہ گھریلو اخراجات کیلئے

کے لیے گجرات بھیجتے رہے۔ چند ہی سال پہلے واپس وطن لوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی مختصر سی جدی قیام گاہ واقعہ محلہ چاکسواراں سے قطع نظر محلہ فتو پورہ گجرات میں اپنا ذاتی مکان خرید کیا۔ اور آج کل اُسی میں فروکش ہیں۔ اب ارادہ کر رہے ہیں کہ چند سال کے لیے پھر کویت یا کسی دوسری ریاست عرب امارات میں چلے جائیں تاکہ جب تک ہمت جوان ہے اچھی گذران کے لیے تگ و دو جاری رکھیں۔ اُن کے ہاں چار پسران میاں محمد طارق۔ میاں محمد عارف۔ میاں محمد عابد اور میاں محمد طاہر پیدا ہوئے۔ جو اپنی والدہ کی سلیقہ شعاری اور والد کی سرپرستی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر کامیاب زندگی کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ میاں محمد بشیر احمد تعلیم کی افادیت سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔ اُن کا حتمی نظریہ ہے کہ ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت!
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت!

میاں محمد بشیر احمد کے بڑے فرزند میاں محمد طارق نے ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور کالج میں داخلہ لیا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد آج کل وہ وزارتِ داخلہ حکومتِ پاکستان اسلام آباد میں بطور سٹینوگرافر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ نہایت ہی حساس۔ فرض شناس اور محنتی نوجوان ہیں۔ اُن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔

میاں محمد بشیر احمد کے دوسرے صاحبزادے میاں محمد عارف متوازن شخصیت کے نوجوان ہیں۔ اپنے والد کی طرح محنتی اور فرض شناس

نوجوان ہیں۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش روزگار میں ملک سے باہر قسمت آزمائی کے لیے چلے گئے۔ آج کل دوبئی میں کسی غیر ملکی فرم کے ملازم ہیں اور اپنے والدین کی خدمت میں باقاعدگی سے نان و نفقہ کے لیے رقوم ارسال کرتے ہیں۔ انتہائی تابعدار اور سعادتمند نوجوان ہیں۔ اُن کی شادی بھی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔

میاں محمد بشیر احمد کے دیگر دونوں پسران میاں محمد عابد اور میاں محمد طاہر خورد سال ہیں اور درجہ پرائمری میں زیر تعلیم ہیں۔

میاں خیرالدین کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند میاں نذر محمد تھے۔ اُنھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور سپاہی افواج سرکار انگلشیہ کیا۔ وہ دراز قامت۔ باوقار وجیہہ۔ محنت کش اور باحوصلہ انسان تھے۔ اپنی وفاکیشی اور کام سے والہانہ لگن سے ترقی یاب ہو کر شدہ شدہ بطور صوبیدار مستعفی ہوئے۔ اپنے دادا کی اولاد میں وہی واحد فرد تھے جو اپنی صلاحیتوں کی بناء پر اس منصب جلیلہ تک پہنچے۔ عین عالم شباب میں اُن کی شادی میاں محمد بخش کی دُختر سے ہوئی۔ جو نہایت ہی سلیقہ شعار۔ خوش وضع اور گھریلو خاتون تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ ایک دُختر کے دو پسران میاں محمد منظور الٰہی اور میاں محمد اقبال تولد ہوئے۔ میاں نذر محمد نے اپنا ذاتی مکان بن شاہدولہ متصل مسجد بیگم پورہ تعمیر کروایا اور بطریق احسن ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اس میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہ ایک شفیق باپ۔ ہمدرد ساتھی۔ زیرک اور بردبار انسان تھے۔ ریاست کشمیر سے خاندانی پیر محمد صادق شاہ صاحب جب بھی تشریف لاتے

اُن کے ہاں قیام فرماتے اور اُن کی وساطت سے دیگر اہلِ خاندان کے فرداً فرداً مہمان بنتے۔ اُنہوں نے اپنے حصّہ مکان واقعہ محلّہ چابکسواران کو فروخت کر دیا اور مستقلاً اپنے تعمیر کردہ مکان میں اُٹھ آئے۔ وہ ایک بھرپور اور نیک نام زندگی گزارنے کے بعد ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء بروز منگل راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

میاں نذر محمّد کے بڑے صاحبزادے میاں محمّد منظور الٰہی مورخہ یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو تولّد ہوئے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک پاس کیا۔ اپنی عملی زندگی اور ملازمت کا آغاز اپنے تایازاد بھائی میاں محمّد احسان اللہ خاں کی مساعی سے بطور کلرک محکمہ صحت کیا۔ اپنی محنت۔ اعلیٰ استعداد۔ لگن اور صاف گوئی سے بتدریج ترقی کرتے کرتے اکاؤنٹنٹ دفتر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ اسی عہدہ سے مُلتان سے ملازمت پُوری کرنے کے بعد یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو ریٹائر ہوئے۔ اُن کی شادی اپنے حقیقی ماموں میاں محمّد صادق کی دُختر ثانی سے ہوئی جن کے بطن سے علاوہ ایک دُختر کے دو پسران میاں محمّد مقصود اور میاں محمّد ایوب تولّد ہوئے۔ اپنی ملازمت کے دوران میاں محمّد منظور الٰہی کی منکوحہ اپنے والد اور بڑی ہمشیرہ کے ہمراہ میکے ہی میں مقیم رہی۔ حتّیٰ کہ اُن کے والد میاں محمّد صادق مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اسی دوران میاں محمّد صادق نے اپنی تمام جدّی اراضی اپنی دُختر ثانی زوجہ میاں محمّد منظور الٰہی کے نام ہبہ کر دی۔ اور ایک طرح سے اپنی دُختر بزرگ کو جو بوجہ غیر آبادی میکے میں اپنی بقیہ زندگی کے ایام گزار رہی تھیں۔ اس واحد ذریعہ معاش

میاں محمد صادق صاحب

صوبیدار میاں نذر محمد صاحب

میاں محمد منظور الٰہی صاحب

سے عملی طور پر عاق کر دیا۔ اپنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد میاں محمد منظور الٰہی نے اپنی دختر کی شادی میاں محمد الدین کے نواسے میاں صلاح الدین پسر محمد امین ڈار سے کر دی اور اُسے بطور خانہ داماد اپنے پاس رکھ لیا۔ اس طرح اُنہوں نے اپنے داماد کے اشتراک سے زرعی اراضی جو اُنہیں اپنی بیوی کی طرف سے ملی تھی کا انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اراضی مذکور پر اُنہوں نے ٹیوب ویل کی تنصیب کروائی اور آج کل بھی وہ اسی کھیتی باڑی میں عملی حصّہ لے رہے ہیں۔ میاں محمد منظور الٰہی کی ملازمت کے دوران اُن کے ہر دو پسران مذکور اپنے والد کی عدم توجہگی کا شکار رہے۔ چنانچہ اُن کی تعلیم اُدھوری رہ گئی۔ میاں منظور الٰہی نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنا حصّہ مکان واقعہ بن فتو پورہ اپنے برادرِ خورد کے پاس فروخت کر دیا اور خود اپنے سُسر میاں محمد صادق کے جدّی مکان واقعہ محلّہ چابکسواران میں بطورِ خانہ داماد اُٹھ آئے۔ یوں زندگی میں پہلی بار اُن کے بچوں کو والد کی صحیح معنوں میں کفالت میسّر آئی۔

میاں محمد منظور الٰہی کے پسران میاں محمد مقصود اور میاں محمد ایوب دونوں اب سنِ بلوغت کو پہنچ چکے ہیں۔ دونوں نے نجی طور پر قالین بافی سیکھی ہے۔ کبھی کبھی اس کام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بڑا صاحبزادہ اپنے چچا میاں محمد اقبال کے پاس سرائے اورنگ آباد عالمگیر میں اُن کے دیسی مطب میں اُن کا ہاتھ بٹانے بھی گاہ بگاہ چلا جاتا ہے جبکہ پسرِ خورد اپنے والد کے زمیندارہ میں اُن کے

داماد کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہر دو نوجوان بچوں کے بارہ میں سوچنا اور اُن کا مستقبل بنانا میاں محمد منظور الٰہی کی ایسی ذمہ داری ہے۔ جس سے وہ خود ہی عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔ اُن کے دونوں صاحبزادے انتہائی سلیم الطبع، سادہ طبیعت۔ محنتی۔ اور وفا شعار ہیں۔

میاں نذر محمد کے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد اقبال ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مڈل پاس کیا۔ تعلیم کی جانب زیادہ رجحان نہیں تھا۔ ابتدا بحریہ میں ملاح بھرتی ہوئے۔ بعد میں سول ہسپتال گجرات میں ڈسپنسر بنے۔ کچھ عرصہ ڈسپنسری راجڑ میں متعین رہے۔ آج کل سرائے اورنگ آباد عالمگیر میں اپنی نجی حکمت یونانی کی دوکان کھول رکھی ہے۔ اُن کی شادی ڈسپنسر ہونے کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ ان کے ہاں دو لڑکیوں کے علاوہ تین پسران میاں حامد اقبال۔ میاں نوید اقبال اور میاں تنویر اقبال پیدا ہوئے۔ اُن کی بڑی صاحبزادی کی شادی ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوتے تھے کہ وہ فوت ہو گئے۔ اُس کے چالیسویں کے فوراً بعد اپنی دوسری صاحبزادی کی شادی اُنہوں نے وہیں کر دی۔ اُن کے صاحبزادے ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔

---

باب دوازدہم

# ریاست میں منگرال قوم کی مردم شماری سال ۱۹۱۱ء اور رجحانات

پنجاب میں راجپوت قوم کی گوت منگرال کی مستند یا سرکاری طور پر مردم شماری کے انعقاد کے بارہ میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بندوبست ۶۸-۱۸۶۷ء کے دوران مرتبہ تاریخ میں بھی اور مابعد ضلع گجرات کے سکونتی راجپوتوں کی جملہ گوتوں کو "قوم راجپوت" کے عنوان میں ہی ضم کرکے قوم راجپوت کی مردم شماری کی گئی ہے۔ اور نہ ہی منگرالانِ سکونتی ضلع ہذا نے اس بارہ میں آج تک کوئی اہتمام کیا ہے۔ اس لیے صحیح مردم شماری قوم منگرال راجپوت کے بارہ میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ریاستی سکونت پذیر افراد قوم کی مردم شماری سال ۱۹۱۱ء میں تفصیلاً یہ معلومات موجود ہیں۔ یہ مردم شماری جناب متین الاذکی خان کی مرتب کردہ تفصیلات کے مطابق بطور انڈکس شمار نمبر ۱۷ نقشہ نمبر ۱۱۱ × تحتی قوم راجپوت منگرال بشمول مردم شماری ریاست جموں و کشمیر سال ۱۹۱۱ء یہ تفصیل ذیل درج ہے۔ اس بارہ میں مزید تحقیق نہیں کی جا سکی۔ کہ آیا ریاست

کی مابعد کی افراد شماری میں اس مخصوص قوم کی انفرادیت کو برقرار رکھا گیا ہے یا اسے بھی راجپوت قوم کی صف میں ضم کر دیا گیا ہے بہر حال قارئین کے لیے ریاست میں سال ۱۹۱۱ء میں منگرالان کی تعداد کا ضلع وار اور صنف وار تعین باعثِ دلچسپی ہوگا۔ اس ضلع وار تقسیم آبادی قوم منگرالان کے تحت کل افرادِ قوم جو اس سال تک ریاست کی حدود میں مقیم تھے ۷۰۲۷ تھے۔ ان میں سے ذکور ۳۵۰۵ تھے جبکہ اناث ۳۵۲۲ تھیں۔ اس طرح اُس وقت مرد ۴۹/۸۷۹ (49.879) فی صد تھے جبکہ عورتیں ۵۰/۱۲۱ (50.121) فی صد تھیں۔ گویا وہ مردوں سے صرف 0.242 فی صد زیادہ تھیں۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں مردوں کو اپنی شادی بیاہ اور خاص طور پر قومیت میں پاکیزگی خون کو برقرار رکھنے کے راستہ میں اس وقت بھی بظاہر کسی دشواری یا رکاوٹ کا سامنا یا مرحلہ درپیش نہیں تھا۔

| نام ضلع | کل تعداد | ذکور | اناث |
|---|---|---|---|
| جموں | ۱۷ | ۱۷ | - |
| جسروٹہ | ۲ | ۲ | - |
| ریاسی | ۴۲۹ | ۲۵۷ | ۱۷۲ |
| میرپور | ۵۹۳۷ | ۲۸۱۷ | ۳۱۲۰ |
| علاقہ پونچھ | ۵۳۹ | ۳۲۶ | ۲۱۳ |
| کشمیر جنوبی معہ شہر | ۲۷ | ۱۳ | ۱۴ |
| مظفرآباد وزارت پہاڑ | ۷۶ | ۷۳ | ۳ |
| میزان کل | ۷۰۲۷ | ۳۵۰۵ | ۳۵۲۲ |

بظاہر اس مردم شماری میں رائے عبدالحکیم اور اُن کے تایازاد بھائی رائے طالب خان اور اُن کے ورثا جو مستقلاً ریاست کشمیر سے ہجرت کر چکے تھے شامل نہیں کیئے گئے۔ مؤلف کے مرتبہ اور تکمیل کردہ شجرہ نسب کے مطابق اوائل ۱۹۷۶ء تک ایک محتاط اندازہ کے تحت ذکور خانوادہ رائے عبدالحکیم کی تعداد ۱۵۸ تک جا پہنچی ہے۔ جبکہ مستورات کی تعداد ۱۹۵ ہے۔ اگر خواتین کی اس تعداد میں سے دیگر خانوادوں سے بیاہ کر لائی گئی ۶۰ خواتین کو کم کر دیا جائے تو خالصتاً تعداد منگرال خواتین ۱۳۵ آتی ہے۔ اس لحاظ سے رائے عبدالحکیم کی ذُرّیت ذکور و اناث ۲۹۳ قریباً ایک صدی کے دوران بڑھی۔ اور اگر باہر سے بیاہ کر لائی جانے والی خواتین کو بھی اس تعداد میں شامل کر لیا جائے تو پھر کل تعداد افراد منگرال راجپوت مقیم ضلع گجرات ۳۵۳ ہو جائیگی اگر اس تعداد کو ایک صدی پر پھیلایا جائے تو اوسط ایزادی افراد کُنبہ فی سال ۳ آئے گی۔ جو کہ فی الواقعہ انتہائی کم ہے۔ اسی طرح ذکور ۱۵۸ کے مقابلہ میں خانوادہ منگرال راجپوت گجرات کی تعداد اناث صرف ۱۳۶ ہے جس کی وجہ سے ہماری قوم کی بچیوں کے ازدواج کے سلسلہ میں کسی آن بھی والدین کو ضرورتِ رشتہ اور بر کی تلاش کے لیے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ اسی کمی کا محرک بیرونِ خاندان سے اس دوران ۶۰ خواتین کو دیگر خانوادوں سے بیاہ کر لانا تھا جس کی بناء پر تقدسِ خون کی دیرینہ اور راجپوتی قدروں سے انحراف کی صورت پیدا ہوئی۔ اور پھر اس جدید رجحان نے منگرال راجپوت خانوادہ کی دوشیزاؤں کے لیے دوسرے اور غیر خاندانوں میں ازدواج کی

بھی راہیں کھول دیں۔ اور اس طرح اسلاف کے اپنی نسل اور خون کی پاکیزگی کے تحفظ کے غیر اسلامی نظریہ کی نفی ہوئی۔ تاہم اپنے تعصب کی بڑائی اور تنگ نظری کی قباحت کا قلع قمع ہوا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

زیرِ نظر تالیف میں چونکہ صرف گجرات میں قیام پذیر افرادِ منگرال قوم کا تذکرہ ہی مقصود ہے اس لیے صرف اُنہی کی نسبت کوائف اور اعداد وشمار کا اعادہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی اُن کے موجودہ رجحانات کا تجزیہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا۔ اس سلسلہ میں گوشوارہ ذیل سے وضاحت ہو جائے گی :-

| تعداد زندہ افراد تا آغاز سال ۱۹۸۶ء | شعبہ جات کارکردگی | اوسط فی صد |
|---|---|---|
| ۱۳ | ملازمت سول | ۱۶٪ |
| ۳ | ملازمتِ فوج | ۴ |
| ۱۵ | ملازمت نجی اندرونِ و بیرونِ ملک | ۱۴ |
| ۶ | تجارت پیشہ | ۷ |
| ۶ | بنکنگ و انشورنس | ۷ |
| ۲۹ | زیرِ تعلیم و تدریس | ۳۵ |
| ۵ | محنت و مزدوری | ۶ |
| ۴ | صنعت و حرفت | ۵ |
| ۳ | امامت و مذہبی امور | ۴ |
| ۱ | زمینداری | ۱ |
| ۱ | فلم انڈسٹری | ۱ |
| میزان ۸۶ | | |

موجودہ نسل کے رجحانات بالا سے واضح ہے کہ جہاں تک سیاسی
زندگی میں بھرپور حصہ لینے کا تعلق ہے منگرالانِ گجرات نے من حیث القوم
اس طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ ماسوائے ایک بار جبکہ میاں
محمد فیاض اصغر نے سال ۱۹۶۴ء میں اپنے حلقۂ انتخاب سے بنیادی
جمہوریت کے لیے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے کسی فردِ قوم نے
اس جھنجھٹ میں پڑنا مناسب خیال نہیں کیا۔ شاید روزی کمانے کی
تگ ودَو نے اس شعبۂ زندگی میں قدم جمانے کا یارا ہی نہیں چھوڑا
اور ہر فرد یہی سمجھے بیٹھا ہے کہ ؎

فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یوں بھی ہر مکتبِ فکر کا اپنا مقام اور منزل ہوتی ہے۔ اپنے
اسلاف سے ورثہ میں پائی گئی عادات و خصائل کسی نہ کسی حد تک
ضرور ہویدا ہوتے ہیں۔ چونکہ مورثِ اعلیٰ رائے عبدالحکیم اور اُن کے
پسران نے ملازمت اور محنت کی عظمت کے علاوہ اپنا رجحان تعلیمی
تقاضوں کے تابع رکھا یہی اطوار اُن کے ورثا میں گھر کر گئے اور
آنے والی نسلیں اگرچہ اپنے اپنے ادوار کی ضروریات سے متاثر
ضرور ہوئیں پھر بھی ابتدائی رجحان غالب رہا۔ تعلیم کی طرف نئی پود کا
رُجحان بڑھ کر ۳۵ فیصد ہو گیا جو آیندہ کے لیے ایک نیک فال ہے۔
اس کے بعد سول ملازمت اور نجی و بیرونِ ملک ہجرت بغرضِ حصولِ
رزق کا نمبر ہے جو ملا کر ۳۰ فیصد ہوتا ہے۔ تجارت۔ بنکنگ و انشورنس
میں بھی ۱۵ فیصد افراد قوم خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس

طرح ان جملہ ملازمت پیشہ مدات میں کلھم افرادی قوت کا ۱۰ فی صد حصہ سرگرمِ عمل ہے۔ دفاعِ ملک میں بحیثیت افسران ۴ فیصد نمائندگی قوم منگرالانِ گجرات کی رہی ہے۔ جبکہ محنت کش طبقہ میں نمائندگی ۶ فیصد ہے۔ صنعت وحرفت کے میدان میں میاں مسعود اصغر نے بجلی کی پنکھا سازی میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ جبکہ لوکل سروس انڈسٹریز میں میاں محمد بلال نے بطور افسر انچارج سٹورز اپنی مہارت اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ میاں محمد مقصود اور میاں محمد ایوب نے قالین سازی میں مزدور کی عظمت کے چراغ روشن کیے۔ اور اس طرح آج کے دور کے تقاضوں کی تکمیل میں ۵ فیصد کی نمائندگی حاصل کی۔ امامت اور مذہبی امور کے میدان میں روحانیت کے فروغ میں میاں علاؤالدین محمد یوسف محی الدین اور انکے پسران اور پوتوں نے بھرپور جدوجہد کی اور اس طرح اس شعبہ میں اُن کی ذات سے ۴ فیصد کی نمائندگی ہوئی۔ فلمی دُنیا میں بطور فلمی سٹار فیضی نے نام پیدا کر کے قوم منگرال کے لیے ۱ فیصد نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ جبکہ زمینداری میں ذاتی کاوشوں کی بدولت میاں محمد مسعود اختر خود زمیندار کاشت کار بنے۔

جہاں تک راجپوت قوم کے خصائل کا تعلق ہے اس کا بنیادی ڈھانچہ شجاعت اور نبرد آزمائی کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ مرورِ ایام سے اس میں خوشگوار تبدیلیاں آتی گئیں تاہم سرشت میں جوش، غصہ، غیرت اور عزتِ نفس کا عنصر موجود رہنے کے باوصف زندگی کے متعدد دیگر شعبہ ہائے کار میں دلچسپی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی رہی اور زندگی کی روانی میں اُس کا ساتھ دینے کی خواہش نے یہی سبق دیا کہ

تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

قانونِ قدرت ہے کہ جو قومیں وقت کی آواز پر کان نہیں دھرتیں وہ گردشِ دوراں کا شکار ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ مقام شکر ہے کہ منگرالانِ گجرات نے نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کے بعد اس حقیقت کو جلد ہی بھانپ لیا کہ وقت کی ضرورت انقلاب ہے۔ اور جمود موت کا دوسرا نام ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

ہمیں اب بھی وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور وقت کا ساتھ دینا چاہیئے کیونکہ ؎

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں اس کی رواروی میں

---

# تذکرۂ خواتین!

اِسلام نے عورت کو مرد کے مساوی حقوق ودلیعت کرکے بنتِ حوّا کی اہمیت اور مرتبہ کو اجاگر کرنے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ عورت کی فضیلت زمانۂ صُلح وجنگ میں نمایاں ہے۔ تاریخِ اسلام میں ازواجِ مطہرات کی متعدد غزوات میں باری باری شمولیت عملی اور دست بدست جنگ میں ضرار بن ازور کی بہن خولہ کے مجاہدانہ کارنامے۔ قدیم ہند میں رضیہ سلطانہ۔ نورجہاں۔ جھانسی کی رانی۔ چاند بی بی بیگم ممتاز محل اور دیگر خواتین کی دانش وحکمت کی داستانیں۔ یورپ میں ملکہ کیتھرائن۔ مس فلورنس نائٹ انگیل۔ جوان آف آرک۔ ملکہ وکٹوریہ اور غیرہم کے تاریخی نام عورت کی افادیت اور تدبر وحکمت کی مُنہ بولتی مثالیں ہیں اور اُن کی اعلیٰ اقدار نے اُنہیں تاریخ کے اوراق کی زینت بنا کر جاوداں بنا دیا ہے۔ اس لیے منگرالانِ گجرات کی مستورات جنہوں نے زندگی کے مخصوص شعبہ ہائے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیئے اور جن کی آغوش میں قوم کے مایۂ ناز فرزندان نے پرورش پائی کا تذکرہ اس تالیف میں نہ کرنا سپاس گزاری کے منافی ہے بلکہ یہ عالمگیر حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ع

## وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

خانوادہ منگرالانِ گجرات میں خواتین کی گروہ بندی متعدد زمروں میں کچھ یوں کی جاسکتی ہے۔ اولاً وہ خواتین جو اندرونِ خاندان بیاہی گئیں۔ پھر وہ جو بیرونِ خاندان سلسلۂ ازدواج سے منسلک ہوئیں۔ ثانیاً ایسی خواتین جو دیگر اقوام سے بیاہ کر لائی گئیں۔ ابتدآً مؤلف کا نظریہ صرف اُن خواتین کی نشاندہی کرنا تھا جو اپنے طبقہ میں مخصوص خصائل و مقام کی امین تھیں لیکن چونکہ منگرال قوم کی نصف سے کچھ زیادہ نفری خواتین پر مشتمل ہے اس لیے بزرگوں کی جملہ ازدواج کی نشاندہی اور ان کی نسبت حتی المقدور معلومات فراہم کرنے کے پیشِ نظر اب جملہ خواتین کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں میری معلومات کا ماخذ والدہ محترمہ اور میری ماموں زاد ہمشیرہ کے علاوہ قوم کی چند ایک دیگر معزز خواتین تک محدود ہے۔ اکثر صورتوں میں اُن کے جزوی حالات اور تاریخ ہائے ولادت اور وفات کے بارہ میں شواہد مفقود ہیں۔

باوجود انتہائی کوشش اور تجسس کے مؤلف کو رائے عبدالحکیم کی زوجہ اور اُن کے پسران میاں کمال الدین۔ میاں محمد اعظم اور میاں محمد مقصود کی ازدواج کے ناموں اور کارناموں کا ادراک نہیں ہوسکا۔ پھر بھی اس حد تک ضرور بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہ اُن کی جُملہ خواتین باعزم و ہمت ہونے کے علاوہ جفاکش۔ وفاشعار اور گھریلو قسم کی عورتیں تھیں جنہوں نے نہ صرف ہجرت کی صعوبتوں کو بخندہ پیشانی قبول کیا بلکہ اُنھوں نے نئی جگہ پر آکر اپنے افرادِ کنبہ و اہلِ خانہ کی ہر طرح سے اعانت کی جس سے ان نو واردان کو اپنی آبادکاری میں آسانی اور احساسِ تحفظ نصیب ہوا۔

اگر یہ ذی حوصلہ خواتین اپنے آبائی وطن اور خویش و اقارب کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتیں تو منگرالانِ گجرات کی تاریخ آج قطعی مختلف ہوتی۔

## (میاں کمال الدین کے وُرثا اور خواتینِ کُنبہ)

میاں کمال الدین صاحب کے پسر میاں عبدالوہاب کے لڑکے میاں نظام دین کی شادی مسماۃ امام بی بی سے بیرونِ خاندان ہوئی۔ اُن کے ہاں علاوہ تین فرزندان ایک دُختر مسماۃ حاکم بی بی تولد ہوئیں۔ جو قبول صُورت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ عنفوانِ شباب میں اُن کی شادی اندرونِ خاندان میاں فیروزدین پسر میاں امیر بخش سے ہوئی جن کے بطن سے صرف ایک فرزند میاں ظہورالدین تولد ہوئے تھے۔ مسماۃ امام بی بی کے پسران میاں قمرالدین و میاں فضل دین لاولد وفات پاگئے جبکہ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں محمدالدین کی شادی مسماۃ فضل بی بی سے بیرونِ خاندان سرانجام پائی۔ مسماۃ فضل بی بی کے بطن سے علاوہ چار پسران تین دُختران مسماۃ سعادت بیگم۔ مسماۃ قناعت بیگم اور مسماۃ فرخندہ بیگم عرف رفعت بیگم تولد ہوئیں۔

مسماۃ سعادت بیگم کی شادی اندرونِ خاندان میاں محمد رشید ولد میاں وزیر بخش سے ہوئی۔ شادی کے چند سال بعد وہ بلا اولاد فوت ہوگئیں۔ مسماۃ قناعت بیگم کی شادی بھی اندرونِ خاندان میاں محمد اشرف ولد میاں وزیر بخش سے ہوئی۔ یہ خاتون بھی کچھ عرصہ بعد بے اولاد فوت ہوگئیں۔ جبکہ مسماۃ فرخندہ بیگم کی شادی بھی اندرونِ کُنبہ میاں محمد سردار خان پسر میاں حسین بخش سے ہوئی۔ چونکہ میاں محمد سردار خان کی پہلی زوجہ سے

دُختر کا نام بھی فرخندہ اختر تھا۔ اس لیے ان کا نام تبدیل کر کے رفعت بیگم
رکھا گیا۔ اُن کے بطن سے علاوہ ایک فرزند دو دُختران مسماۃ فریدہ سُلطانہ
اور مسماۃ عابدہ سُلطانہ تولد ہوئیں۔ مسماۃ فریدہ سلطانہ نے میٹرک کرنے
کے بعد تدریسی کام کر کے اپنے علمی ذوق کی تسکین کی۔ وہ خوب رُو
دراز قد اور متوازن شخصیت کی حامل دوشیزہ ہونے کے علاوہ نہایت
درجہ سلیقہ شعار دُختر قوم ہیں۔ اُن کی شادی مرزا خورشید بیگ اوورسیئر
پشاور (شمال مغربی سرحدی صوبہ) سے ہو چکی ہے۔ اور اپنے گھر میں
شاد و آباد ہیں۔ جبکہ اُن کی ہمشیرہ خورد مسماۃ عابدہ سلطانہ نے بھی میٹرک
پاس کرنے کے بعد تدریس کا کام کیا۔ وہ بھی اپنے نامور والد کی طرح
قبول صورت۔ نازک اندام۔ حسین و جمیل اور سرو قامت دُختر قوم ہیں۔
اُن کی شادی بھی حاصل پور (سابقہ ریاست بہاولپور) کے زمیندار
اور رئیس سیّد خادم حسین سے ہو چکی ہے۔ اور کامیاب ازدواجی زندگی
بسر کر رہی ہیں۔ میاں کمال دین کی ذرّیت میں سے یہ پہلی دونوں میٹرک
پاس خواتین ہیں۔

میاں محمّد الدین کے فرزند اکبر میاں محمّد نواز کی شادی خاندان سے
باہر مسمّاۃ کریم بی بی سے ہوئی لیکن ان سے کوئی اولاد تولّد نہ ہوئی۔
چند سال کی ازدواجی زندگی کے بعد اُن کو طلاق ہو گئی اور میاں محمّد نواز
نے عقدِ ثانی مسماۃ زینب بی بی دُختر اللہ دتہ ٹھیکیدار سکنہ ڈسکہ ضلع
سیالکوٹ سے کیا۔ لیکن ان کے بطن سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ
خاتون انتہائی سلیقہ شعار اور گھریلو قسم کی عورت ہیں۔ اس نکاح سے
پہلے وہ بھی بیوہ تھیں۔

میاں محمد الدین کے پسرِ ثانی میاں محمد ریاض نے قریباً ۴۰ سال قبل خاندان سے باہر موضع گکھڑ ضلع گوجرانوالہ کی ایک خاتون مسمّاۃ فاطمہ بیگم سے شادی کی۔ لیکن اُن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُن کی موجودگی میں ہی میاں محمد ریاض نے مسمّاۃ زبیدہ بیگم دُختر امام دین سکنہ ضلع سیالکوٹ سے عقدِ ثانی کیا۔ اس خاتون کے بطن سے علاوہ ایک موجود صاحبزادہ کے پانچ دُختران مسمّاۃ ساجدہ ریاض۔ مسمّاۃ شاکرہ ریاض۔ مسمّاۃ حاضرہ ریاض مسمّاۃ شاہدہ ریاض اور مسمّاۃ زاہدہ ریاض تولّد ہوئیں۔ یہ سب بچیاں انتہائی خوش وضع وخوش اطوار ہونے کے علاوہ نہایت درجہ سلیقہ شعار اور گھریلو قسم کی دوشیزائیں ہیں۔

میاں محمد الدین کے تیسرے لڑکے میاں محمد نشاط نے اپنی پسند کی شادی مسماۃ شمشاد بیگم سے اوائلِ عمر میں ہی خاندان سے باہر کی۔ یہ خاتون قبولِ صورت اور وفاشعار ہونے کے علاوہ گھریلو کام کاج میں ماہر اور اپنے خاوند کی خدمت گزار رہیں۔ وہ میاں محمد نشاط کی وفات سے اب تک اُن کے گھرانے میں مقیم ہیں۔

میاں محمد الدین کے سب سے خورد سال لڑکے میاں محمد جواد کی شادی خاندان سے باہر مسمّاۃ عنایت بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے واحد دُختر مسمّاۃ ثریّا بیگم تولد ہوئی۔ لیکن شادی کے چند سال بعد ہی میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو گئے جو طلاق پر منتج ہوئے اور اس طرح مسمّاۃ عنایت بیگم کے ساتھ اُس کی بچی بھی اپنے ننہال چلی گئی۔ جہاں وہ اب بھی مقیم ہے۔ میاں محمد جواد نے چند سال پیشتر عقدِ ثانی مسمّاۃ امیر بیگم دُختر فضل حسین سے خاندان سے باہر کیا ہے۔ اس خاتون سے

ابھی تک اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ خاتون نہایت صابر۔ سلیقہ شعار اور محنتی ہونے کے علاوہ انتہائی طور پر وفا شعار ہیں۔

## میاں محمد اعظم کے پسر میاں رسول بخش کے ورثاء اور اُنکی خواتینِ کنبہ

میاں محمد اعظم کے صاحبزادے میاں رسول بخش نے دو شادیاں کیں اُن کی زوجہ اوّل مسماۃ امیر بیگم سے صرف ایک فرزند میاں امیر بخش تولد ہوئے۔ اور چند سال بعد یہ نیک بخت خاتون رحلت فرما گئیں۔ میاں رسول بخش نے اُن کی وفات کے کچھ عرصہ بعد مسماۃ جنت بی بی سے شادی کی جن کے بطن سے علاوہ تین فرزندان ایک دُختر مسماۃ بیگم بی بی (جو مولف کی دادی صاحبہ تھیں) تولد ہوئیں۔ مسماۃ بیگم بی بی انتہائی خوبصورت۔ دراز قد۔ حلیم الطبع۔ خوش اخلاق۔ باوقار۔ صاحبِ عفت و عصمت خاتون تھیں انہیں اس بارہ میں فخر و مباہات تھا کہ وہ اپنے چار بھائیوں کی واحد ہمشیرہ تھیں۔ نماز و روزہ کی پابند۔ پردۂ شرعی عمر بھر اختیار کیا۔ البتہ زندگی کے آخری ایام میں اور اس سے چند سال پہلے چادر اُوڑھا کرتی تھیں۔ عین عنفوانِ شباب میں اُن کی شادی اپنے چچا میاں نور وخاں کے دوسرے صاحبزادے میاں نبی بخش سے سال ۱۸۸۵ء میں ہو گئی جو اس زمانہ میں محکمہ مال میں گرداور قانونگوی تھے اور بعد میں بطور صدر قانون گوی گجرات ترقی یاب ہو گئے۔ مسماۃ بیگم بی بی پردہ کی اس گونہ پابند تھیں کہ جب بھی گھر سے باہر جاتیں تو پالکی میں سفر کرتیں۔ اپنے خاوند کے ساتھ اُن کی ملازمت کے سلسلہ میں ڈنگہ یا سرائے عالمگیر جانے کے لیے اُن کی ڈولی گھر سے کہار اُٹھا کر ریلوے سٹیشن لے جاتے اور گاڑی کے دروازہ تک لگا کر اُنہیں ٹرین میں سوار

کیا جاتا اور پھر اسی طرح سفر کے اختتام پر اُنہیں گاڑی سے پالکی میں منتقل کر کے گھر پہنچایا جاتا۔ اُن کے خاوند جاگیردار اور ملازم سرکار ہونے کے باوصف شہر کے معززین اور شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ اور اسی اہتمام سے مستاۃ بیگم بی بی کا مرتبہ اور توقیر تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بندوبست سال ۱۹۱۱/۱۹۱۲ء کے دوران نائب مہتمم بندوبست گجرات سردار ہیرا سنگھ نے میاں نبی بخش کو کہا کہ میری سردارنی آپ کی بیگم سے ملنا چاہتی ہے اس لیے اپنی بیگم کو کسی دن ہمارے گھر بھجوائیں۔ میاں نبی بخش نے فوراً کہا کہ میں بطور صدر قانونگوی آپ کا ماتحت ضرور ہوں لیکن میری بیگم کسی کی ماتحت نہیں ہے۔ اور پھر شریفوں کے حرم مذاہب غیر کے افراد کے گھروں میں جانا قطعی طور پر معیوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عارضی طور پر میاں صاحب نے اپنے افسر کی ناراضگی مول لے لی لیکن اپنے خانوادہ کے وقار اور اصول کی قربانی سے گریز کیا۔

مستاۃ بیگم بی بی کے بطن سے میاں نبی بخش کے جلیل القدر اور منکسر المزاج گجرات کے نامور ورثا نے جنم لیا۔ علاوہ چار فرزندان اُن کے ہاں تین دختران مستاۃ فیروزاں بی بی۔ مستاۃ زبیدہ بی بی اور مستاۃ محمودہ بی بی تولد ہوئیں۔ جن کا ذکر اپنے مقام پر کیا جائے گا۔ مستاۃ بیگم بی بی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب خاتون تھیں۔ وہ اپنے نامور والد میاں رسول بخش کی ہم شکل اور سرو قامت خاتون تھیں صلہ رحمی، شفقت۔ ایثار۔ شرافت اور خاندانی نجابت کی مُنہ بولتی تصویر تھیں۔ خاوند کی چاہت سے پُورے طور پر مطمئن اور گھریلو زندگی میں منہمک اپنی زندگی کو انتہائی سادگی سے گزارنے کے بعد اوائل اپریل ۱۹۳۳ء میں اپنے نامور خاوند کی وفات

محترمہ بیگم بی بی صاحبہ　محترمہ زیب اکرام صاحبہ　محترمہ فیروزہ بیگم مختار نبی صاحبہ

کے قریباً آٹھ سال بعد واصل بحق ہوئیں۔ اپنی ازدواجی زندگی کی با فراغت گزران کے بارہ میں اکثر فرمایا کرتی تھیں کہ مجھے اپنے عظیم والد کی دُعا ہے کہ "دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو"۔ سو میں نے اپنے سُسرال میں میکے کی طرح فراخی دیکھی"۔ یہاں جاگیر سے اجناس کی فراہمی کثرت سے ہوتی۔ گھر میں دو دو بھینسیں اور گائیں۔ دودھ کی کثرت اور گھی منوں کے حساب سے اکٹھا موجود ہوتا لیکن دودھ اور گھی سے زندگی بھر نہ نہائی اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے ورنہ خاوند کی طرف سے میرے باپ کی دُعا کے پورا کرنے میں کوئی کسر نہ تھی"۔ ماہ بماہ یا ایک ماہ چھوڑ کر دوسرے ماہ اپنے موجود اہلِ خانہ اور بچوں کے ہمراہ میاں نبی بخش کی معیت میں جاگیر واقع موضع بانٹھ پر گھر سے کھانے کی تیاری کرانے کے بعد تانگہ پر تشریف لے جاتیں۔ یہاں چاروں اطراف پردہ کا مکمل انتظام ہوتا۔ کسی مزارع یا دیگر آدم زاد کو جرأت نہ تھی کہ اس طرف آسکتا۔ عجب پکنک کا سا سماں ہوتا۔ اپنے بہو بچوں سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ ہر ایک بچے اور اس کے اہلِ کنبہ کو گھر پر مٹھائی اور برفی تیار کروا کر اُن کی ملازمت کے مقام پر باہتمام وقتاً فوقتاً بھجوایا کرتی تھیں۔ اپنے سب سے بڑے بیٹے کے بارے میں فرمایا کرتیں "میرا مختاراں والا بڑے اختیاراں والا"۔ مؤلف کو اعجاز کی بجائے "میرا بھلا" (جج) کہا کرتیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ انہی کی دُعاؤں اور پُکار کا صدقہ ہے کہ میں پی سی ایس بنا اور بطور مجسٹریٹ اور دیگر عہدوں پر متعین رہ کر فریقین کے مابین "جج" کے فرائض ادا کرتا رہا۔ غرض وہ ایک ہمہ صفت موصوف خاتون تھیں جن کی زبان یا عمل سے زندگی بھر کسی کی دل آزاری نہ ہوتے دیکھی اور نہ کسی سے سُنی۔ وفات کے بعد اُن کی

تدفین اپنے نامور اور جلیل القدر شوہر کے پہلو میں اپنی جاگیر چاہ ٹھاکر والہ موضع بانٹھ میں شہر گجرات سے قریباً کوئی پون میل کے فاصلہ پر عمل میں لائی گئی۔ یاد رہے کہ اُن کے خاوند میاں نبی بخش نے اپنی زندگی میں ہی اپنی اور اپنی زوجہ محترم کی قبر پختہ تعمیر کروا دی تھی۔ کیونکہ انہیں ادراک تھا کہ ؎

موت کا ایک دِن معیّن ہے

اور ایسی حالت میں جبکہ اُن کی اولاد کے ذمہ دار افراد ضلع گجرات سے باہر دور دراز مقامات پر سرکاری خدمات سرانجام دے رہے تھے اپنی بے وقت موت کی صورت میں وہ کسی دیگر فرد خانوادہ منگرالاں کی مرہونِ منت ہو کر اپنی خودداری پر اپنے بعد بھی آنچ آنے نہ دینا چاہتے تھے۔ کیوں نہ ہو ؎

تُو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو

عینِ دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

غرضیکہ جب یہ صاحبِ اوصاف حمیدہ خاتون فوت ہوئیں تو اُنہوں نے اپنے ورثاء کے لیے بہت گراں قدر ورثہ چھوڑا اور اپنے کسی بھی وراث پر اپنی تدفین اور دیگر اخراجاتِ میت کا بار تک نہ ڈالا۔ اور یوں یہ نیک نہاد خاتون اس عالمِ فانی میں نقشِ دوام چھوڑ گئیں۔ خداوند قدوس انہیں غریقِ رحمت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں جگہ ارزانی فرمائے آمین ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں

میاں رسول بخش کے پسر میاں امیر بخش کی شادی مسماۃ بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے واحد پسر میاں فیروز دین ہی تولّد ہوئے۔ انہوں نے دو عقد کیے۔ اُن کی زوجہ اوّل مسماۃ حاکم بی بی دختر میاں نظام دین خاندان منگرال راجپوت سے تھیں، جن سے صرف ایک ہی فرزند میاں ظہور الدین تولّد

ہوتے تھے کہ اُن کی آپس میں ناچاقی ہوگئی۔ چنانچہ میاں فیروز دین نے اُنہیں طلاق دے دی۔ اور بعد میں راولپنڈی سے ایک بیوہ خاتون مسمّاۃ حیات بیگم سے عقدِ ثانی کیا۔ یہ خاتون خاندانِ منگرال سے باہر سے بیاہ کر لائی گئیں۔ ان کے بطن سے صرف ایک دُختر مسمّاۃ امیر بیگم تولد ہوئیں۔ جو دونوں آنکھوں سے معذور آج کل دورِ کہولت میں دن گزار رہی ہیں۔ اُن کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی لیکن اُن کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔

میاں ظہورالدین کی شادی بھی موضع ساہنوالہ ضلع سیالکوٹ میں خاندان منگرال سے باہر ایک خاتون مسمّاۃ رحیم بی بی سے ہوئی جن کے بطن سے واحد فرزند میاں عبدالعزیز تولد ہوئے۔ جنہوں نے تین شادیاں کیں۔ اُن کی سب سے پہلی شادی اُن کی حقیقی ماموں زاد مسمّاۃ سردار بیگم سے اُس وقت ہوئی جبکہ اُن کے سُسرال والے ملکِ برہما میں تجارت کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ اس خاتون سے صرف ایک فرزند ہوا جو پیدا ہوتے ہی فوت ہوگیا۔ بعد میں فریقین میں کچھ غلط فہمی ہوگئی اور اس طرح میاں بیوی میں تفریق ہوگئی۔ چنانچہ اُنہوں نے بعد میں لاہور کی ایک بیوہ خاتون سے نکاح ثانی کیا لیکن اس سے بھی نباہ کی صورت نہ بن سکی۔ اور اُسے بھی طلاق دیدی گئی۔ میاں عبدالعزیز اپنے والد کے ہمراہ برہما چلے گئے۔ دورانِ قیام برہما اُنہوں نے ایک خاتون مسمّاۃ مقبول بیگم سے جو برہما کی رہنے والی تھیں نکاح کر لیا۔ اُن کے بطن سے بھی ایک فرزند تولد ہوا جو پیدا ہوتے ہی فوت ہوگیا۔ میاں عبدالعزیز اور اُن کے والد کی برہما سے واپسی وطن پر یہ خاتون اُن کے ساتھ ہی گجرات تشریف لے آئیں اور آج کل اپنے خاوند کے ساتھ گوجرانوالہ میں مقیم ہیں۔

میاں رسول بخش کے دوسرے صاحبزادے میاں وزیر بخش کی شادی اپنے چچا میاں نور خان کی صاحبزادی مسمّاۃ ریشم بی بی سے ہوئی۔ جو قبول صورت، سلیقہ شعار۔ سرو قامت اور رکھ رکھاؤ کی خاتون تھیں اُن کے بطن سے علاوہ پسران تین دُختران مسمّاۃ سردار بیگم۔ مسمّاۃ سعید بیگم اور مسمّاۃ شہزادہ بیگم تولد ہوئیں جو اپنی ماں کی طرح خوش وضع اور گھریلو خواتین تھیں۔ اُس دَور میں تعلیمِ نسواں کی طرف رجحان بہت ہی کم یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہاں بعض گھروں میں یا مساجد کے ائمہ کی زیرِ نگرانی بچوں اور بچیوں کو قرآنِ پاک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان خواتین کو بھی ابتدائی مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا گیا۔ جوان ہونے پر ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ مسمّاۃ سردار بیگم کی شادی اپنے خاندان میں ہی میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین پسر میاں الٰہی بخش سے ہو گئی۔ چونکہ میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کلّی طور پر مذہب اور تحصیل علوم شرعی میں منہمک رہتے تھے اور گھریلو انتظام اور انصرام کو مذہب کی اعلیٰ اقدار کے مطابق ڈھالنے پر بضد تھے اس لیے اُنہیں اپنی منکوحہ سے اپنے معیار کے مطابق گھریلو زندگی بسر کرنے کے مواقع میسّر نہ آ سکے۔ پھر اُن کی سخت گیری اور عادات کی پختگی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے میں بھی آڑے آئی۔ چنانچہ چند سال کے بعد ہی یہ بے جوڑ ناطہ طلاق پر منتج ہو کر ٹوٹ گیا۔ لیکن اس حقیقت کا ایک تلخ پہلو میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کے لیے زندگی کا ایک کربناک باب وا کر گیا۔ اُن کی ہمشیرہ مسمّاۃ نذر بی بی جو انتہائی قبول صورت۔ شریف۔ زاہدہ۔ عابدہ اور وفا شعار خاتون تھیں کا نکاح اُن کی مطلقہ

بیوی مسماۃ سردار بیگم کے بھائی میاں ضیاء الدین سے ہو چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی انتہائی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ اس طلاق کے بعد خاندان کے ہر دو اطراف تلخیاں بڑھیں اور مسماۃ نذر بی بی کو محض وٹہ کا رشتہ ہونے کی بنا پر طلاق ہو گئی اور یوں ایک ہنستا بستا گھرانہ تباہ ہو گیا۔ نند بھاوج ہر دو کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور دونوں کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح مسماۃ نذر بی بی اپنے بھائی میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کے گھر اٹھ آئیں اور اُن کی جوانی اور بڑھاپا یہاں پر ہی یادِ الٰہی میں بسر ہوا ؎

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ دوراں یوں بھی دیکھے ہیں

مسماۃ سردار بیگم مذکورہ نے طلاق کے کچھ سال بعد میکے میں ہی وفات پائی۔ مسماۃ ریشم بی بی کی دخترِ ثانی مسماۃ سعید بیگم ایک آنکھ سے معذور تھیں۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میکے میں ہی بطور تارک الدنیا بسر کی۔ اپنی عمر کے آخری چند سالوں کے دوران وہ سعادتِ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئیں۔ زیادہ عرصہ اور مرض الموت کے وقت بھی وہ اپنے بھائی میاں محمد رشید اور اُن کے بیٹے میاں عبد الہادی کی کفالت میں رہی۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اُنہوں نے نہایت ہی سادہ زندگی بسر کی۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں دماغی توازن کھو بیٹھی تھیں۔

مسماۃ ریشم بی بی کی تیسری صاحبزادی مسماۃ شہزادہ بیگم قبول صورت دراز قامت اور بھرپور جوانی کی حامل خاتون تھیں۔ اُن کی شادی خاندان سے باہر میاں محمد امین فاروقی سے ہوئی جو اُس وقت نائب تحصیلدار تھے۔ اور جنہوں نے اپنی مساعیِ جمیلہ اور ذاتی کاوش سے ریلوے

سٹیشن گجرات سے ملحق بستی امین آباد کی بنیاد رکھی اور جن سے اولادیں ذکور و اناث ہوئیں۔ اُن کے تین بیٹے اور تین دختران تھیں۔

میاں وزیر بخش کے بیٹے میاں ضیاء الدین کی پہلی شادی مسماۃ نذیر بی بی دختر میاں الٰہی بخش سے ہوئی تھی جس کا مفصل ذکر پہلے گزر چکا ہے اُن کا عقدِ ثانی خاندانِ منگرال سے باہر ایک خاتون مسماۃ خورشید بیگم سے ہوا۔ جن کے بطن سے صرف ایک صاحبزادی مسماۃ محمودہ بیگم تولد ہوئیں۔ اس خاتون کی شادی اپنے خاندان منگرال میں ہی میاں دوست محمد پسر میاں محمد اکبر سے ہوئی جس کے بطن سے اُن کی متعدد اولادیں ہیں اُن کا تذکرہ حصہ ذکور کتاب ہذا میں ہو چکا ہے۔ مسماۃ محمودہ بیگم اپنے بچوں کے ہمراہ لاہور میں مستقلاً آباد ہیں کیونکہ اپنی زندگی میں ہی اُن کے خاوندِ مرحوم گجرات سے نقل مکانی کر چکے تھے۔

میاں وزیر بخش کے فرزندِ ثانی میاں محمد اشرف کی شادی خاندان سے باہر مسماۃ سکینہ بی بی سے ہوئی۔ یہ خاتون حسین و جمیل، سرو قامت معتدل مزاج، سلیقہ شعار اور گھریلو عورت تھیں۔ وہ اپنی معاملہ فہمی اور تدبر کی بناء پر خاندان میں عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ اُن کے ہاں علاوہ چار پسران دو دختران مسماۃ روشنک اختر اور مسماۃ اصغری بیگم تولد ہوئیں۔ مسماۃ روشنک اختر کی شادی خاندان سے باہر میاں محمد سعید فاروقی (مرحوم)، انسپکٹر پولیس سے ہوئی جبکہ مسماۃ اصغری بیگم کی شادی خاندان میں ہی میاں نوبہار الدین (مرحوم)، سب انسپکٹر پولیس پسر میاں گیلانی بخش سے ہوئی۔ ہر دو خواتین انتہائی زیرک، سلیقہ شعار، صاحبِ فراست، مہمان نواز، خلیق اور

صاحبِ اولاد ہیں۔ مسماۃ سکینہ بی بی پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے کے علاوہ مخیر
خاتون تھیں۔ اُن کو اپنی نند مسماۃ سیدہ بیگم کی معیت میں حجِ بیت المکرم اور
حاضریِ دربارِ رسالت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اُنہوں نے بھرپور اور
زاہدانہ زندگی گزارنے کے بعد بعمر ۷۷ سال ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء کو داعیِ اجل
کو لبیک کہا۔ وہ اپنے اہلِ خاندان اور مرحوم شوہر کی قُربت میں مسجد
بیگم پورہ کے احاطۂ قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

میاں محمد اصغر پسر میاں محمد اشرف کی شادی خاندان سے باہر
مسماۃ سردار بیگم سے ہوئی جو قبول صورت۔ دراز قد۔ متوازن جسم اور اُبھرتے
ہوئے خدوخال کی فرشتہ سیرت خاتون تھیں۔ گھر میں واحد پسر کی منکوحہ
ہونے کے ناطہ سے بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتیں۔ ازدواجی
زندگی انتہائی کامیاب اور مسرت آگیں تھی۔ میکے اور سُسرال ہر دو جگہ
روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ ان کے بطن سے علاوہ چھ صاحبزادوں کے
چار دختران مسماۃ فردوس اختر زوجہ شیخ محمد الطاف فاروقی انسپکٹر پولیس
سکنہ امین آباد گجرات۔ مسماۃ زرینہ ناز زوجہ مرزا شرافت علی بیگ سکنہ
راولپنڈی۔ مسماۃ جمیلہ ناز زوجہ ملک ظفر حسین اعوان سکنہ مقبرہ پانڈی شاہ
گجرات اور مسماۃ کوثر خاتون زوجہ مرزا عزیز جان سکنہ پشاور تولد ہوئیں
یہ جملہ خواتین ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فرداً فرداً ازدواجی زندگی
سے منسلک ہوئیں۔ ان سب کے نکاح منگرال خاندان سے باہر ہوئے۔
مسماۃ سردار بیگم نے ۲۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو بعمر ۷۱ سال وفات پائی۔

میاں محمد اصغر کے صاحبزادے میاں محمد فیاض اصغر کی شادی بھی
خاندان منگرال سے باہر اپنی پھوپھی زاد مسماۃ شکیلہ ناز دختر شیخ محمد سعید فاروقی

سے ہوئی - یہ خاتون اپنی خاندانی نجابت اور شرافت سے متصف ہیں
اپنے سسرال سے جہیز میں ملی ہوئی امین آباد میں سکنی اراضی پر از خود
تعمیر کردہ کوٹھی میں اقامت گزیں ہیں۔ اُن کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار
ہے۔

میاں محمد فیاض اصغر کے ہاں اُن کے بطن سے علاوہ دو پسران چار
صاحبزادیاں مسماۃ رضوانہ فیاض - مسماۃ تابانہ فیاض - مسماۃ نعمانہ فیاض اور
مسماۃ عالیہ فیاض تولد ہوئیں ۔ اول الذکر دونوں صاحبزادیوں نے میٹرک
تک تعلیم حاصل کی ہے ان کی شادیاں اپنے خاندان سے باہر ہو چکی
ہیں - اور وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں - مسماۃ رضوانہ فیاض کی شادی
فلائٹ لفٹیننٹ شیخ فضل الرحمان سے ہوئی - جبکہ مسماۃ تابانہ فیاض
محمد انور خان مینجنگ پارٹنر اسٹیل انڈسٹریز سیالکوٹ سے بیاہی گئیں
مسماۃ نعمانہ فیاض اور مسماۃ عالیہ فیاض ابھی زیر تعلیم ہیں اور دونوں ہونہار
بچیاں ہیں -

میاں محمد اصغر کے منجھلے صاحبزادے میاں محمد مسعود اصغر کی شادی
خاندان سے باہر دسمبر ۱۹۵۱ء میں وزیر آباد میں شمن برج کے مشہور جرال
راجپوت خاندان کی دوشیزہ مسماۃ پروین بانو سے ہوئی - یہ خاتون انتہائی
سلیقہ شعار - قبول صورت اور فراخ حوصلہ ہونے کے علاوہ ایک
گھریلو قسم کی عورت ہیں - اُن کے بطن سے صرف تین دختران ہی تولد
ہوئیں - جن کے نام علی الترتیب مسماۃ ماہ پارہ مسعود - مسماۃ ماہ رُخ
مسعود اور مسماۃ ارم مسعود ہیں - مسماۃ ماہ پارہ مسعود نے میٹرک
فسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے - اور کالج میں داخلہ لے لیا ہے وہ

محترمہ ڈاکٹر خالدہ آفتاب صاحبہ ایم اے پی ایچ ڈی

میاں آیاز اصغر   میاں اعزاز اصغر

تدریسی شعبہ میں کام کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ مسماۃ ماہ رُخ مسعود میٹرک کی طالبہ ہیں جبکہ مسماۃ اِرم مسعود حصّہ مڈل میں زیرِ تعلیم ہیں۔

میاں محمّد اصغر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر میاں محمّد آفتاب اصغر نے سال ۱۹۷۶ء میں اپنے قیامِ مملکتِ ایران کے دوران ڈاکٹر خالدہ صدیق ایم اے، پی ایچ ڈی دُختر جناب صدیق حسن انصاری سب رجسٹرار علی گڑھ سے شادی کر لی۔ یہ خاتون قبول صورت۔ بلند اخلاق۔ ذہین۔ وفا کیش اور معاملہ فہم ہونے کے علاوہ ایک گھریلو عورت ہیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیمی استعداد سے قطعِ نظر فارغ اوقات میں تالیف و تصنیف کے علاوہ گھر کے عام کام کاج میں بھی حصّہ لیتی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ خاندانِ منگرال گجرات کی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی بہو ہیں۔

میاں وزیر بخش کے تیسرے صاحبزادے میاں محمّد اکبر کی شادی خاندان سے باہر شہر گجرات ہی کے مولوی احمد دین کی دُختر مسماۃ تاج بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے علاوہ دو پسران ایک بچّی بھی تولد ہوئی لیکن یہ بچّی گود میں ہی فوت ہو گئی۔ اس دوران مسماۃ تاج بیگم بھی راہی ملکِ عدم ہو گئی۔ اُن کی وفات کے چند سال بعد میاں محمّد اکبر نے اپنی ملازمت کے دوران ایک غیر مسلمہ بیوہ مسماۃ اللہ دئی سے بمقام سولن نکاحِ ثانی کیا اور انہیں مشرف بہ اسلام کر کے اُن کا اسلامی نام مسماۃ اقبال بیگم رکھا۔ وہ نہایت ہی خوش اخلاق۔ قبول صُورت۔ سلیقہ شعار اور گھریلو قِسم کی خاتون تھیں۔ اُن کی کوئی اولاد میاں محمّد اکبر سے نہیں تھی۔

میاں محمّد اکبر کے صاحبزادے میاں محمّد اسلم نے بھی خاندان سے

باہر اپنے پسند کی خاتون مسماۃ سردار بیگم سے نکاح کیا۔ یہ خاتون انتہائی ملنسار۔ خوش اطوار اور قبول صورت تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین پسران چار لڑکیاں مسماۃ کشور سلطانہ زوجہ شیخ محمد اعجاز (مرحوم) سب انسپکٹر پولیس۔ مسماۃ پروین سلطانہ زوجہ محمد اختر۔ مسماۃ گلشن سلطانہ زوجہ الطاف حسین اور مسماۃ نسرین سلطانہ زوجہ محمد رفیق پیدا ہوئی تھیں جو تمام خاندان سے باہر بیاہی گئیں۔

میاں محمد اکبر کے فرزند ثانی میاں دوست محمد نے پہلی شادی مسماۃ اقبال بیگم سے بیرون خاندان کی لیکن کچھ عرصہ بعد فریقین میں ٹھن گئی۔ اور یہ نزاع طلاق پر منتج ہوا۔ میاں دوست محمد نے نکاحِ ثانی بھی خاندان سے باہر بابو مہتاب دین ڈار کی صاحبزادی مسماۃ بادشاہ بیگم سے کیا۔ یہ دوشیزہ غایت درجہ حسین۔ صحت مند۔ غریب الطبع اور کم گو تھی جوانی میں ہی کسی آسیب کے سایہ سے متاثر ہو گئی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد یہ بھی وفات پا گئیں۔ اِن ہر دو ازدواج سے میاں دوست محمد کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بالآخر اُنہوں نے خاندان میں سے ہی ایک بیوہ مسماۃ محمودہ بیگم دختر میاں ضیاءالدین سے تیسرا نکاح کیا۔ ان کے بطن سے پانچ لڑکے ہی تولد ہوئے۔ یہ خاتون اپنے بچوں کے ہمراہ اپنے خاوند کی زندگی میں ہی نقلِ مکانی کر کے لاہور قیام پذیر ہو گئی تھیں اور اپنے خاوند کی وفات کے بعد بھی وہیں اقامت گزین ہیں۔

میاں وزیر بخش کے چوتھے فرزند میاں محمد رشید کی شادی مسماۃ حاجرہ بی بی ساکنہ سیالکوٹ سے خاندانِ منگرال سے باہر ہوئی۔ یہ عورت ایک سگھڑ بیوی۔ وفا کیش ساتھی۔ ذی وقار خاتون اور متوازن ناک نقشہ کی حامل تھیں

اُن کے بطن سے ایک فرزند کے علاوہ تین دختران تولّد ہوئیں۔ اُن کی دختر مسماۃ شفقت النساء کی شادی سیالکوٹ کے ڈاکٹر محمد ابراہیم رانا سے ہو گئی۔ جبکہ دختر ثانی مسماۃ شمیم اختر کی شادی ڈاکٹر عبدالعزیز رانا کے ہمراہ ہوئی۔ اس لحاظ سے ہر دو ہمشیرگان ایک ہی کنبہ میں بیاہی گئیں تیسری صاحبزادی مسماۃ نسیم اختر کی شادی خواجہ مظفر اقبال سے ہو چکی ہے۔ میاں محمد رشید نے اپنی زوجہ اوّل کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے سات شادیاں مختلف اقوام میں کیں جن کے ناموں کے بارہ میں معلومات مفقود ہیں۔ صرف ایک خاتون مسماۃ جمیلہ اختر کا نام معلوم ہو سکا ہے جن کے بطن سے ایک لڑکا ہارون الرشید تولّد ہوا تھا۔ چنانچہ زوجہ اوّل کے سوا اور کسی عورت کے بطن سے کوئی دختر تولّد نہیں ہوئی۔ تعدادِ ازدواج کے لحاظ سے خاندان منگرالانِ گجرات میں میاں محمد رشید کا ایک ریکارڈ ہے جسے کوئی آج تک نہیں توڑ سکا۔ میاں محمد رشید کی جملہ دختران خاندان سے باہر بیاہی گئیں۔ میاں محمد رشید کے گھر میں کسی ایک وقت میں ایک سے زیادہ زوجہ نہیں رہی۔ وہ اپنی سابقہ زوجہ کی وفات یا طلاق کی صورت میں ہی عقدِ ثانی کیا کرتے اور کبھی بھی اُنہوں نے کسی زوجہ کی موجودگی میں دُوسرا نکاح نہیں کیا۔ میاں محمد رشید کے فرزند میاں عبدالہادی کی شادی بھی خاندان سے باہر مسماۃ پروین خالدہ سے ہوئی جن کے بطن سے علاوہ تین پسران ایک صاحبزادی مسماۃ عظمیٰ رشید بھی ہے جو ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔

میاں رسول بخش کے تیسرے صاحبزادے میاں مراد علی کی شادی اپنے خاندان سے باہر موضع جلالپور جٹاں تحصیل و ضلع گجرات کے کشمیری گھرانے کی خاتون مسماۃ امام بی بی سے ہوئی۔ جو کہ نیک طینت۔ فرشتہ صفت۔

ایثار پیشہ۔ وفاشعار۔ صابر اور جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ صلہ رحمی۔ خوش خلقی اور دانشمندی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ انہوں نے بھرپور زندگی بسر کرنے کے بعد ۲۵ر اگست ۱۹۴۸ء کو انتقال فرمایا اور اپنے خاندان کے آبائی قبرستان بیگم پورہ گجرات میں مدفون ہوئیں۔ اُن کے بطن سے تین پسران کے علاوہ دو دختران میں سے مسماۃ نذیر بیگم زوجہ میاں صبح صادق (مرحوم) گرداور قانون گوی پسر میاں نواب دین ڈار اور مسماۃ رابعہ بی بی زوجہ شیخ فضل الٰہی پراچہ (مرحوم) رئیس بھیرہ ضلع سرگودھا تھیں۔ ہر دو خواتین خاندان سے باہر بیاہی گئیں۔ دونوں بہنیں نہایت بااخلاق۔ متواضع۔ بلند قامت اور خوش گفتار تھیں۔ ہر دو میں سے کسی کے ہاں بھی اولاد نہیں تھی۔ مسماۃ نذیر بیگم ۷ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کو وفات پاگئیں۔ جبکہ مسماۃ رابعہ بی بی کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔ اللہ کریم ہر دو کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ ارزانی فرمائیں کہ ؏

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است

میاں مراد علی کے صاحبزادے میاں محمد اکرم کی شادی خاندانِ منگرال سے باہر ایک دوشیزہ مسماۃ سردار بیگم سے ہوئی یہ خاتون متوازن شخصیت کی امین۔ باوقار۔ سادہ مزاج۔ صابر و شاکر اور راضی برضا ہونے کے علاوہ وفاشعار اور اولاد پر جان چھڑکنے والی ماں تھیں اپنے ذی مرتبت اور شریف النفس خاوند کی ملازمت کے دوران عزیز و اقربا سے صلہ رحمی۔ بالخصوص اپنے عیالدار دیور کے بچوں سے پیار محبت اور اُن کی مادی امداد اُن کا طُغرائے امتیاز تھا۔ انہوں نے اپنے خاوند کو کبھی بھی اپنے محدود آمدنی والے برادرِ خورد کی خدمت سے نہ روکا۔

بلکہ بخندہ پیشانی ایثار سے کام لیتے ہوتے اپنے خاوند کے لواحقین سے مروت سے پیش آتی رہیں۔ اُن کا اپنے دیور پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنا جملہ زیور اُن کی تحویل میں دے رکھا تھا۔ اپنے خاوند کے حادثۂ ریل کے بعد عالمِ بیوگی میں اپنے دو صاحبزادوں اور واحد صاحبزادی مسماۃ شاہ سلطانہ کے ہمراہ اپنے سسرال گجرات لوٹ آئیں اور اپنے تین کمروں کے ذاتی مکان واقعہ محلہ چابکسواراں میں رہائش پذیر ہوئیں۔ اُن کے دیور نے چند ایک معتبرین کی موجودگی میں اُن کا تمام زیور لُٹا دیا۔ یہ خاتون اپنی زندگی کے بقیہ ایام انتہائی باوقار طور پر گزار کر راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی واحد صاحبزادی مسماۃ شاہ سلطانہ کی شادی میاں محمد حسن انسپکٹر آبکاری و محصولات (ریٹائرڈ) سے ہوئی۔ یہ شادی اندرونِ خاندان ہوئی۔

میاں محمد اکرم کے فرزند میاں محمد زمان خان کی شادی بیرونِ خاندان شیخ عبدالعزیز کی صاحبزادی مسماۃ ممتاز بیگم سے ہوئی۔ جو نہایت ہی حسین و جمیل۔ متوازن قد و قامت اور خوش اطوار کی حامل دوشیزہ تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ دو پسران کے تین دختران مسماۃ رخسانہ زمان۔ مسماۃ شہناز زمان اور مسماۃ نیلم زمان تولد ہوئیں۔ ان میں سے مسماۃ رخسانہ زمان کی شادی اپنے ماموں زاد شیخ زاہد انور سے خاندانِ منگرال سے باہر ہو چکی ہے۔ میاں محمد زمان کے دونوں پسران کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ مسماۃ ممتاز بیگم بوجہ فالج صاحبِ فراش ہیں۔

میاں محمد اکرم کے فرزندِ ثانی میاں محمد اقبال کی شادی خاندان سے باہر موضع کھوکھر کی (مضافات شہر گوجرانوالہ) کی ایک قبول صورت۔

صاحبِ اخلاق اور نوجوان دوشیزہ مسماۃ ممتاز بیگم سے ہوئی۔ میاں بیوی ایک کامیاب گھریلو زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کے ہاں دو دختران تولد ہوئیں۔ اِن میں سے دُختر کلاں مسماۃ نازلی تھیں۔ اور دوسری دُختر گودی میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس دوران میاں محمد اقبال تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہو گئے جو اُن کو اپنی والدہ مرحومہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ میاں محمد اقبال کی وفات کے بعد یہ چھوٹا سا کُنبہ بے سہارا رہ گیا چنانچہ اُن کی بیوہ اپنی بچی کو لے کر اپنے میکے چلی گئیں۔ مسماۃ نازلی کے بارہ میں یہی معلوم ہوا ہے کہ سِنِ بلوغت کو پہنچنے پر خاندان سے باہر اُن کی شادی ہو چکی ہے۔

میاں مراد علی کے پسرِ ثانی میاں محمد افضل کی پہلی شادی اُن کی چچازاد مسماۃ فضل بیگم دُختر میاں حسین بخش سے ہوئی جو سُرخ و سفید۔ پیکرِ تسلیم و رضا۔ نازک اندام۔ اور بھرپور جوانی کی حامل دوشیزہ تھیں۔ اپنی ازدواجی زندگی کے سوا سال بعد بیمار پڑ گئیں اور داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُن کی وفات کے چند سال بعد میاں محمد افضل کا عقدِ ثانی مسماۃ فرخ سلطانہ دُختر میاں برکت علی سے بیرونِ خاندان ہوا۔ یہ خاتون بھی قبول صورت۔ زیرک۔ چنچل۔ توانا اور معاملہ فہم ہونے کے علاوہ خوش اخلاق گھریلو عورت تھیں۔ اپنے کردار اور معاملہ فہمی سے اپنے سُسرال کے کنبہ کو اُنہوں نے اپنا گرویدہ کر لیا۔ وہ صائب الرائے اور بات کی دھنی تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ چار پسران کے تین دُختران مسماۃ انور سلطانہ۔ مسماۃ اختر سلطانہ۔ مسماۃ سعیدہ سلطانہ تولد ہوئیں تمام بچیوں کو مڈل تک تعلیم دلوائی گئی۔ یہ تمام لڑکیاں اپنی تدبر اور زیرک

والدہ کے زیرِ تربیت اُن کے اوصاف سے متصف ہوئیں۔ اور اُن کی شادیاں یکے بعد دیگرے خاندان سے باہر ہو گئیں۔ سبھی بچیوں کی گھریلو زندگانی انتہائی خوشگوار رہی۔ مسماۃ انور سلطانہ کی شادی سرگودھا میں رائے غلام مہدی پی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ) سے ہوئی۔ جبکہ مسماۃ اختر النساء کی شادی راجہ محمد نذیر ڈسٹرکٹ مینجر یونائیٹڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ گجرات سے ہوئی۔ جو موضع برکی تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی کے رہنے والے ہیں۔ مسماۃ سعیدہ سلطانہ کی شادی ریٹائرڈ میجر گل محمد لون سے ہوئی جو شہر جہلم کے سکونتی ہیں۔ مسماۃ فرخ سلطانہ ایک کامیاب اور باوقار زندگی بسر کرنے کے بعد گجرات میں ہی مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو وفات پاگئیں۔ اُن کا مرقد مسجد بیگم پورہ کے احاطۂ قبرستان میں ہے۔

میاں محمد افضل کے بڑے لڑکے میاں محمد اسلم کی شادی سال ۱۹۳۶ء میں امرتسر کے کشمیری خاندان میں مسماۃ رفعت سلطانہ سے ہوئی۔ یہ خاتون قبول صورت۔ خوش اخلاق۔ مزاج شناس۔ بیدار مغز اور صاحب فراست بہو۔ وفاکیش بیوی اور جانثار ماں تھیں۔ اپنے اہلِ کنبہ کے اشاروں پر چلنے اور سسرال میں کنبہ پروری کی بنا پر مقبول تھیں۔ عام افرادِ کنبہ انتہائی خوش اخلاق اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے والے لوگ ہیں۔ آپس میں شیر و شکر ہیں اور مکمل ضبط و نظم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے اہلِ کنبہ کے ہر دکھ درد۔ رنج و خوشی میں سر جوڑ کر مل بیٹھتے ہیں۔ یہ خصوصیات دیگر اقوام کے امتزاج کے متعدد مواقع کے تحت پیدا ہوئی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر راجپوت قوم کی کسی گوت کے خالص خون میں سوائے جنگجوئی اور محاذ آرائی کے کسی دوسرے عنصر کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ راجپوت

اور ہم جنسی۔ جماعتی خود ستائی اور خودنمائی اس قوم کے وہ خصائل ہیں جو
اگر اُن سے چھین لیے جائیں تو "بے تیغ سپاہی" ہی رہ جائیں گے۔ راجپوت
قوم کسی عہد یا دور میں بھی مصلحت بیں نہیں رہی ہے۔ اُس کا مسلک کچھ
اس نظریہ کا امین ہے کہ ؎

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

لیکن تعلیمی رجحان اور دیگر اقوام میں ازدواج اور شادیاں آئندہ نسل میں
حسین امتزاج تو پیدا کر گئیں۔ لیکن یوں ہی راجپوت قوم کے بیٹے اور بیٹیاں
وقتی مصلحت اور دُنیاداری کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر اپنی جبلت کے بعض
قابلِ ستائش پہلوؤں سے رفتہ رفتہ بے نیاز ہوتے گئے۔ اور یہ شاہین
بچے کرگس کی ہم نشینی سے مصلحت کوش ہو گئے۔ امر واقع ہے کہ آغوشِ مادر
سے ہی قوم کی بچیاں اور بچے تربیت پا کر آئندہ نسلوں کی روایات کے محرک
بنتے ہیں۔ اس تحریر سے کسی خاص قوم یا فرقہ کی تضحیک مقصود نہیں ہے۔
بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب بھی دیگر اقوام سے بیرونِ کنبہ رشتے ناطے
کیے جاتے ہیں تو کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی کے تحت خود اپنے نسلی خصائل
طور و اطوار اور رجحانات بھی ضرور بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ؎

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دُنیا میں او بیگانہ خو رہنا

بات مسماۃ رفعت سلطانہ کی ہو رہی تھی۔ جو نہایت ہی شگفتہ مزاج
ہر دلعزیز اور زیرک بہو تھیں۔ اللہ کریم نے اُنہیں سال ۱۹۷۴ء میں
سعادتِ حج سے بھی مشرف فرمایا۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین پسران

کے تین دُختران بھی تولد ہوئیں جن کے نام مسماۃ نگہت پرویز اسلم - مسماۃ نجمہ پرویز اسلم - اور مسماۃ صبوحی اسلم ہیں۔ جو علی الترتیب ۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء ۲۲رجون ۱۹۴۸ء اور ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو تولد ہوئیں۔ مسماۃ نگہت پرویز اسلم کی شادی میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد شیخ سجاد حسین اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس لاہور سے ہوگئی اور مسماۃ نجمہ پرویز اسلم کی شادی بھی تعلیم کے بعد میجر محمد اجمل فاروقی آرمی ایجوکیشن کور کرنل سے ہوچکی ہے جبکہ مسماۃ صبوحی اسلم ابھی زیر تعلیم ہیں۔ حج سے واپسی کے چند ماہ بعد مسماۃ رفعت سلطانہ نے داعئی اجل کو لبیک کہا۔

میاں محمد اسلم کے پسر کلاں میاں محمد پرویز اسلم کی شادی مسماۃ انور سلطانہ کی صاحبزادی یعنی اپنی پھوپھی زاد مسماۃ طلعت سلطانہ دُختر رائے غلام مہدی ریٹائرڈ پی سی ایس سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ دو لڑکوں کے ایک دُختر مسماۃ عالیہ پرویز ہے جو ابھی زیر تعلیم ہے۔

میاں محمد اسلم کے دوسرے لڑکے میاں محمد جاوید اسلم کی شادی بھی خاندان سے باہر ایک دوشیزہ مسماۃ پروین یوسف سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک پسر کے علاوہ ایک دُختر مسماۃ نادیہ جاوید بھی ہے جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔

میاں محمد اسلم کے تیسرے صاحبزادے میاں محمد خالد اسلم کی شادی اپنی سب سے چھوٹی پھوپھی مسماۃ سعیدہ سلطانہ کی صاحبزادی مسماۃ زاہدہ خالد دُختر میجر گل محمد لون سے خاندان سے باہر ہوئی۔ اُن کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تولد ہوئے۔ لیکن ہر دو پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئے۔

میاں محمد افضل کے فرزندِ ثانی میاں محمد یوسف نے اپنی جسمانی کمزوری

کے باعث مجرّد زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ فرمایا اور انہوں نے باوجود صاحب ثروت و حیثیت ہونے کے شادی نہیں فرمائی۔ اُن کا نظریہ ہے کہ ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

میاں محمّد افضل کے تیسرے صاحبزادے میاں محمّد محسن کی شادی اپنے تایا محمّد اکرم کی واحد دُختر مسماۃ شاہ سلطانہ سے اندرونِ خاندان ہوئی۔ انہوں نے بھی مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی اور شادی کے وقت اُن کے والد اور والدہ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مسماۃ شاہ سُلطانہ انتہائی شریف صابر۔ کم گو۔ سلیقہ شعار اور گھریلو خاتون ہیں۔ انہوں نے نہایت سادہ اور پُروقار زندگی بسر کی۔ اُن کے بطن سے علاوہ دو لڑکوں کے تین لڑکیاں مسماۃ غزالہ محسن۔ مسماۃ ناہید محسن اور مسماۃ فرزانہ محسن تولّد ہوئیں۔ مسماۃ غزالہ محسُن اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد سال ۱۹۷۴ء میں مسٹر شبیر حسین سے بیرونِ خاندان بیاہی گئیں۔ جبکہ مسماۃ ناہید محسن بی۔ اے کی طالبہ ہیں۔ اور مسماۃ فرزانہ محسن ایف اے میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ہر دو بچیاں نہایت ہی خلیق۔ قبول صُورت۔ ذہین اور سعادت مند ہیں۔

میاں محمّد افضل کے سب سے چھوٹے پسر میاں محمّد سعید کی شادی خاندان سے باہر ایک خاتون مسماۃ سعیدہ بانو سے ہوئی۔ یہ خاتون وضع دار۔ سلیقہ شعار اور ہمہ صفت موصوف صاحبہ خانہ ہیں۔ طبیعت میں ٹھہراؤ اور گرہستی کا عنصر غالب ہے۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین پسران ایک صاحبزادی مسماۃ عمرانہ سعید تولّد ہوئی۔ یہ بچی ابھی ابتدائی تعلیم میں ہے۔

میاں رسول بخش کے چوتھے صاحبزادے میاں حسین بخش کی شادی

بیرونِ خاندان حوالدار جانی خان کی دُختر نیک اختر مسمّاۃ بیگم بی بی سے ہوئی۔ چونکہ اُن کی نند کا نام بھی یہی تھا اس لیے سسرال والوں نے اُن کا نام تبدیل کر کے مسمّاۃ سردار بیگم رکھ دیا۔ اور تا دمِ مرگ وہ اسی نئے نام سے پکاری جاتی رہیں۔ وہ نہایت ہی حسین و جمیل۔ نازک اندام۔ سرو قامت سادہ مزاج۔ سنجیدہ۔ پُر وقار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ میاں بیوی کمال محبت اور مروّت سے زندگی سے ہم آہنگ تھے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ خاوند انتہائی خُدا پرست تھے۔ بیوی بھی پابندِ صوم و صلوٰۃ تھیں ہر ماہ گیارہویں کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ مسجد حاجی محمّد الدین گڑھی شاہدولہ سے خواتین نعت خواں مدعو کیجاتیں اور اس طرح اس گھر میں درود و صلوٰۃ کے ترانے گونجا کرتے۔ اس ماحول میں ایک تقدس اور نور کی فضا اُن کی زندگی بھر بپا رہی۔ اُن کے بطن سے علاوہ ایک فرزند تین دُختران مسمّاۃ فضل بیگم۔ مسمّاۃ سرور بیگم اور مسمّاۃ اقبال بیگم تولد ہوئیں۔ مسمّاۃ فضل بیگم کی شادی عین عنفوانِ شباب میں اندرونِ خاندان اپنے تایا زاد میاں محمّد افضل سے ہو گئی۔ یہ خاتون انتہائی حسین۔ خوش اطوار سلیقہ شعار اور کم گو تھیں۔ اپنی شادی کے سوا سال کے اندر ہی اندر بیمار پڑ گئیں اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور یوں اپنے میکے والوں کو ہمیشہ کے لیے غمزدہ چھوڑ گئیں۔ مسمّاۃ سرور بیگم کی شادی ایک درویش صفت چوہدری علی محمّد جو مسجد حاجی محمّد الدین سے اُن دنوں باہتمام اور باقاعدگی سے قرآنِ پاک سیکھنے دھول خورد تحصیل گجرات سے آیا کرتے تھے ہو گئی۔ گویا یہ نکاح بیرونِ خاندان قوم جاٹ میں ہوا۔ اور یہ شادی میاں حسین بخش کی درویش دوستی۔ مذہبی رواداری اور اسلام کے اصولوں کی سختی

سے پیروی کا ایک منہ بولتا ثبوت تھی۔ مسماۃ سردار بیگم ایک زاہدہ۔ شب زندہ دار۔ باپردہ۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ شرعی قواعد کی پابند اور اصولوں پر سختی گیر خاتون تھیں۔ زندگی بھر اپنے خاوند کی معمولی آمدنی سے گزر بسر کی۔ اگرچہ والد اور والدہ نے عمر بھر اُن کا ساتھ دیا اور ہر طرح سے مالی اور اخلاقی امداد جاری رکھی پھر بھی اس نیک نہاد خاتون نے کبھی بھی کسی قسم کا گلہ شکوہ یا حرفِ شکایت زبان سے نہ نکالا۔ اپنے خاوند کی وفات کے بعد بھی باوقار طریقہ سے سُسرالی گاؤں میں جاتیں۔ پردہ کی اوٹ میں اراضی زرعی کے حساب کتاب کی بات چیت کرتیں۔ اُن کو سال ۱۹۵۱ء میں سعادتِ حرمین الشریفین اور حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ عبادت گزاری اور عشقِ رسولِ مقبول میں مستغرق تھیں۔ جب تک زندہ رہیں نماز و روزہ کی پابند رہیں۔ اُن کے بطن سے پانچ بچے اور پانچ بچیاں تولد ہوئیں۔ جن میں سے صرف دو فرزندان ہی بقیدِ حیات ہیں۔ یہ معزز خاتون ۸۲ سال کی عمر میں سال ۱۹۷۱ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔

میاں حسین بخش کی تیسری دُختر مسماۃ اقبال بیگم ہیں۔ وہ اوائلِ عمر ہی سے نفاست پسند۔ خوددار۔ سلیقہ شعار۔ خوش گفتار اور ذی وقار خاتون ہیں۔ وہ سرو قامت۔ نازک اندام۔ خوش شکل۔ سُرخ و سفید۔ متوازن نقوش اور والد و والدہ کے حُسن کا امتزاج ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے اس وقت کی انگریز مشنری عورتیں جو معزز گھرانوں میں ہفتہ میں تین بار شہر بھر میں آیا کرتی تھیں اس گھرانہ میں بھی آتیں۔ مسماۃ اقبال بیگم نے لکھنا پڑھنا اُنہی سے سیکھا۔ دینی علم کے لیے مشہور مذہبی گھرانے کے

سربراہ مولانا شمس الدین سے قرآنِ پاک کی تعلیم مکمل کی ۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا ۔ پردہ کی سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی ۔ گویا اُس دور کے تقاضوں کے مطابق گھر کی چار دیواری میں ہی اکتسابِ علم ہوا ۔ نماز روزہ کی عادت راسخ ہو گئی ۔ عین جوانی میں سال ۱۹۱۴ء میں اپنی پھوپھی مسماۃ بیگم بی بی کے فرزند میاں اقبال نبی سے اندرونِ خاندان شادی ہو گئی ۔ ان کے بطن سے صرف تین فرزند ہی تولد ہوئے تھے کہ خاوند اللہ کو پیارے ہو گئے دُنیا اندھیر ہو گئی ۔ ازدواجی زندگی صرف آٹھ سال تھی سال ۱۹۲۲ء میں عین جوانی میں بعمر ۲۴ سال بیوہ ہو گئیں ۔ اس کے بعد اپنے بڑے بیٹے (مولف) کے برسرِ روزگار ہونے تک کبھی اُن کو سفید یا بھڑکیلے لباس میں کسی نے نہیں دیکھا ۔ تمام دن اپنے سُسرال میں گھر کے اندر سے چٹخنی چڑھا کر گھریلو کام کاج میں دن گزار دیتیں ۔ اولاد کے لیے سختی سے احکام تھے کہ شام کے چراغ جلنے سے پہلے گھر واپس پہنچ جاؤ ورنہ دروازہ نہیں کھولا جائے گا ۔ شاید یہ اُنہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی راقم کو گھر کی چار دیواری ہی سے باہر کی رنگین زندگی سے کہیں زیادہ محبت ہے ؎

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

محترمہ اقبال بیگم اپنے میکے اور سُسرال ہر دو جگہ نہایت احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتیں ۔ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُنہیں حُسنِ سیرت سے بھی فیاضی سے نوازا ہے ۔ ایک دن اُن کے خاوند کے بڑے بھائی میاں محمد نظیر الحسن نے آبدیدہ ہو کر راقم سے فرمایا کہ خاندان سے باہر اور خود خاندان میں کئی ایسے شواہد موجود ہیں ، جن کے تحت نوجوان لڑکیاں اپنے لواحقین کے لیے باعثِ تشویش نظر

آتی ہیں لیکن ہماری اس ہمشیرہ نے جوانی میں بیوگی کو کچھ اس طرح بسر کیا کہ ہمارے سر اُن کی تعظیم کے لیے احسان و مروّت کے جذبات کے ساتھ از خود خمیدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے خاندانی وقار اور نیک نہادی سے بھی سر فخر و انبساط سے تن جاتے ہیں ۔ والدہ محترمہ اب بھی اُسی متانت ۔ جذبہ ایثار اور بزرگی کی اساس ہیں اور اپنی بے پناہ یادداشت ۔ گزشتہ واقعات اور مفید معلومات سے میری اس ناچیز تالیف میں قوم کی معلومات میں اضافہ کی بنیاد ہیں ۔ وہ نہ صرف راقم کے لیے بلکہ جملہ افرادِ خاندان کی متاعِ عزیز ہیں ۔ اگرچہ وہ زبانِ بے زبانی سے گویا ہیں کہ ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ !

مسماۃ اقبال بیگم سال ۱۹۵۱ئہ میں سعادتِ حج بیت اللہ اور حاضری دربارِ رسالت سے بھی مشرف ہوئی ہیں ۔ باقاعدگی سے قرآن خوانی اُن کا معمول ہے ۔ نعت خوانی اور سماعتِ نعت کا بھی بہت اشتیاق رکھتی ہیں جو کچھ دل میں ہے بے کم و کاست زبان پر ہوتا ہے ۔ انہیں اس بات سے قطعی باک نہیں ہے کہ اُن کی راست گفتاری سے دلوں کے آبگینے ٹوٹ بھی سکتے ہیں ۔ مصلحت کوشی سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں ہے ؎

ہوں وہ آزاد کہ جوں سرو کسی کی خاطر

سرِ تسلیم مرا خم نہ ہوا پر نہ ہوا !

میاں حسین بخش کے واحد صاحبزادے میاں محمد سردار خان نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں ۔ اُن کی پہلی شادی خاندان سے باہر خواجہ نور الٰہی سکونتی موضع روڑس تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کی دختر مسماۃ زینب بی بی سے ہوئی ۔ جو نہایت سعادت مند ۔ نیک سیرت ۔ زاہدہ اور پابندِ صوم و

بیگم رشیدہ وقیع الحق صاحبہ۔ جنابہ نسیم نصیر صاحبہ۔ جنابہ شاہدہ عزیز صاحبہ۔ جنابہ بیگم خورشید اکرم صاحبہ
بشیر احمد ایدا صاحب۔ جنابہ بیگم عزیز اعظم صاحبہ۔ خواجہ سجاد صاحب۔ مؤلف اور خواجہ محمد اجمل صاحب
کراچی میں حج بیت اللہ کے لیے جانے والے (ہار پہنے ہوتے) افرادِ کنبہ کیساتھ۔

والدہ مؤلف بیگم اقبال نبی صاحبہ (ہار پہنے ہوتے) حج بیت اللہ سال ۱۹۵۱ئہ سے واپسی پر۔
آپ کے بائیں بیگم عبدالستار سیٹھ صاحبہ اور دائیں جانب والدہ حمید قریشی صاحبہ تشریف فرما ہیں۔

صلواۃ خاتون تھیں۔ اُن کے بطن سے صرف ایک دُختر مسماۃ فرخندہ اختر
تولّد ہوئیں جن کو ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد جوانعمری ہی میں اپنے پھوپھی زاد
میجر محمّد لطیف سے سلسلۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ مسّماۃ فرخندہ اختر کو
سال ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ سعادتِ حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی
سعادت نصیب ہوئی۔ دُوسری بار سال ۱۹۷۴ء میں بعمر ۴۶ سال بغرضِ زیارت
حرمین الشریفین سے مشرف ہوئیں۔ میجر محمّد لطیف سے اُن کے یہاں ایک
لڑکا اور ایک لڑکی تولّد ہوئے لیکن دونوں بچے قضائے الٰہی سے گود
میں ہی پیدائش کے فوراً بعد وفات پا گئے۔ میجر محمّد لطیف نے اپنے
گھر والوں کے کہنے سُننے سے اُنہیں سال ۱۹۵۱ء کے آخری ماہ میں طلاق
دے دی۔ آج کل مسّماۃ فرخندہ اختر اپنے ننھیال میں مقیم ہیں۔ اُن کی والدہ
مسّماۃ زینب بی بی کا بھی چند سال ہوئے ۱۹۷۰ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

میاں محمّد سردار خان نے اپنی دوسری شادی بھی خاندان سے باہر
ایک مہاجر کنبہ کی خاتون مسّماۃ کنیز فاطمہ دُختر علی محمّد راجپوت ساکن گوہانہ
ضلع رہتک سے ۱۴ فروری ۱۹۴۳ء کو کی۔ اس خاتون کے بطن سے علاوہ
دو پسران ایک دُختر مسّماۃ خالدہ سلطانہ تولّد ہوئیں۔ مسّماۃ خالدہ سُلطانہ
نے ابتدائی تعلیم میٹرک تک حاصل کی۔ اُن کی شادی اپنے والد کی وفات
کے بعد راجہ محمّد نواز سکنہ سنگھوئی ضلع جہلم سے ہو گئی۔ جو عرصہ تک بطور
خانہ داماد اپنی ساس کے پاس رہے۔ اس کنبہ کی کفالت مسّماۃ کنیز فاطمہ
بطور لیڈی ویلفیئر ورکر اور اُن کے پسر میاں خالد سردار حسین کرتے رہے ہیں
آج کل یہ کنبہ لاہور میں مقیم ہے۔

میاں محمّد سردار خان نے تیسری شادی خاندان کے اندر مسّماۃ فرخندہ بیگم

دختر میاں محمد الدین سے کی۔ چونکہ میاں محمد سرفراز خاں کی دختر اول کا نام بھی فرخندہ اختر تھا اس لیے انہوں نے اپنی زوجہ سوئم کا نام بدل کر رفعت سلطانہ رکھ لیا۔ اس خاتون کے بطن سے علاوہ ایک فرزند دو دختران تولد ہوئیں جن کے نام مسماۃ فریدہ سلطانہ اور مسماۃ عابدہ سلطانہ ہیں۔ ہر دو لڑکیوں میں سے مسماۃ فریدہ سلطانہ نے میٹرک ایس وی تک تعلیم پائی۔ جبکہ مسماۃ عابدہ سلطانہ نے ایف اے کیا۔ ہر دو کے بارہ میں ابتداً میاں کمال دین کی خواتین کے زمرہ میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

میاں محمد سرفراز خاں کے پسر میاں خالد سرفراز کی حال ہی میں ۱۹ فروری ۱۹۷۷ء کو خاندان سے باہر ناہید اختر بی اے سے شادی ہو چکی ہے۔ اُن کی زوجہ نہایت شریف الطبع۔ خوش اخلاق۔ وسیع القلب۔ باوقار اور سلیقہ شعار خاتون ہیں۔ باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سلجھے ہوئے دماغ کی سادہ طبع خاتون ہیں۔ میاں محمد سرفراز خاں کے دوسرے پسر میاں حامد سرفراز کی شادی بھی خاندان سے باہر شیخ محمد اقبال ریٹائرڈ صدر دفاعلبائی زنیں ضلع گجرات کی زوجہ ثانی سے دختر مسماۃ شاہدہ بانو سے ہو چکی ہے جن کے بطن سے علاوہ دو پسران دو دختران تولد ہوئیں۔ اُن کی دختر ثانی مسماۃ فرحیہ حامد ابھی گودی میں ہے۔ جبکہ اُن کی پلوٹھی کی بچی تولدگی کے چند یوم بعد ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔

مسماۃ شاہدہ بانو میٹرک پاس ہیں۔ وہ زیرک۔ حاضر جواب۔ سمجھدار۔ خود شناس اور ہوشیار خاتونِ خانہ ہیں۔ چند سالوں میں انہوں نے اپنے لیے سسرال میں ایک منفرد مقام پا لیا ہے۔ وہ خودداری میں اس مقولہ کی ترجمان ہیں کہ ؎ خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

پہلی قطار: میاں حامد سردار صاحب - محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ - میاں خالد سردار صاحب
دوسری قطار: محترمہ فریدہ سلطانہ صاحبہ - محترمہ فرخندہ اختر صاحبہ - محترمہ خالدہ سلطانہ صاحبہ

محترمہ اقبال بیگم صاحبہ - محترمہ فرخندہ اختر صاحبہ
- محترمہ زینب بی بی صاحبہ

محترمہ ناہید اختر صاحبہ

# میاں محمد اعظم کے پسران میاں نور محمد المعروف

## میاں نور خان کے ورثا اور انکی خواتین کنبہ!

میاں محمد اعظم کے پسر ثانی میاں نور و خاں نے دو شادیاں کیں۔ اُن کی پہلی شادی خاندان سے باہر ایک خاتون مستماۃ حاکم بی بی سے ہوئی۔ یہ خاتون قبول صورت اور گھریلو قسم کی عورت تھیں۔ ان کے بطن سے صرف ایک پسر میاں الٰہی بخش ہی تولد ہوئے تھے کہ وہ وفات پاگئیں۔ اس کے بعد میاں نور و خاں نے عقدِ ثانی خاندان میں سے ہی مستماۃ وزیر بیگم دختر میاں پیر و خاں سے کیا۔ جو نہایت درجہ قبول صورت۔ نیک سیرت۔ سلیقہ شعار۔ وفا کیش اور گھریلو خاتون تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین پسران میاں محمد بخش۔ میاں نبی بخش اور میاں گیلانی بخش چار دختران مستماۃ ریشم بی بی۔ مستماۃ سردار بیگم۔ مستماۃ مہتاب بیگم اور مستماۃ عباسی بیگم تولد ہوئیں۔

میاں نور و خاں کے پسر میاں الٰہی بخش کی شادی خاندان سے باہر ایک دوشیزہ مستماۃ حاکم بی بی سے ہوئی۔ یہ خاتون پابندِ صوم و صلوٰۃ اور گھریلو زندگی میں مشاق تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ ایک فرزند میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین ایک صاحبزادی مستماۃ نذر بی بی تولد ہوئیں۔ جن کا ذکر میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کی پہلی زوجہ کے زمرہ میں گزر چکا ہے۔ میاں علاؤ الدین محمد یوسف محی الدین کی دوسری شادی خاندان سے باہر ایک دوشیزہ مستماۃ عائشہ بی بی سے ہوئی۔ لیکن بدستور سابق ہر دو میاں بیوی کی طبائع اور رجحانات کا تضاد اس بار بھی فریقین میں

علیحدگی کا باعث بنا۔ ہر دو ازدواج سے اُن کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔
میاں علاؤ الدین محمد یوسف نے تیسرا نکاح اپنے ایک مرید کی دُختر نیک اختر سے
کیا جن کا نام مسمّاۃ غلام فاطمہ تھا۔ ان کے بطن سے علاوہ دو فرزندان
میاں خورشید محی الدین و میاں مبارک محی الدین ایک دُختر مسمّاۃ محمودہ بیگم
تولد ہوئیں۔ یہ صاحبزادی خاندان سے باہر بیاہی گئیں۔ مسمّاۃ غلام فاطمہ نے
اپنے جلیل القدر خاوند کی وفات کے بعد کچھ عرصہ اُن کے گھر میں قیام فرمایا
بعد میں وہ لاہور منتقل ہو گئیں اور وہیں عقدِ ثانی کر لیا۔ چند سال پہلے وہ
بھی وفات پا چکی ہیں۔ اُن کی صاحبزادی مسمّاۃ محمودہ بیگم بھی عرصہ ہوا فوت
ہو چکی ہیں۔ دونوں ماں بیٹی خوش اطوار، خوش گفتار اور قبول صورت خواتین
تھیں۔

میاں خورشید محی الدین پسر کلاں میاں علاؤ الدین محمد یوسف کی شادی
خاندان سے باہر ایک دوشیزہ مسمّاۃ نور بیگم سے ہوئی جو قبول صورت،
معتدل مزاج اور گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے بطن سے علاوہ دو فرزندان
دو دُختران مسمّاۃ کوثر پروین اور مسمّاۃ نصرت ہیں۔ مسمّاۃ کوثر پروین کی شادی
جناب محمد یونس کے ساتھ خاندان سے باہر ہو چکی ہے جبکہ نصرت ابھی زیرِ تعلیم
ہے۔

میاں مبارک محی الدین فرزندِ ثانی میاں علاؤ الدین محمد یوسف کی شادی
بھی خاندان سے باہر ایک دوشیزہ مسمّاۃ وزیر بیگم دُختر بابو مہتاب دین ڈار
سے ہوئی جو نہایت درجہ غریب طبیعت، سلیقہ شعار، گھریلو قسم کی خاتون ہیں
اُن کے بطن سے علاوہ دو پسران کے چار دُختران مسمّاۃ مریم بی بی، مسمّاۃ
مسعودہ بیگم، مسمّاۃ ثریا بیگم اور مسمّاۃ عذرا بیگم تولد ہوئیں۔ مسمّاۃ مریم بی بی کی

شادی کراچی میں خاندان سے باہر جناب سجاد احمد سے ہو چکی ہے جبکہ
مسماۃ مسعودہ بیگم کا نکاح بھی خاندان سے باہر راولپنڈی کے جناب
اعجاز احمد سے ہو چکا ہے۔ دیگر دونوں بچیوں کے بارہ میں والدین ابھی
اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکے ہیں۔ حال ہی میں مبارک محی الدین نے

میاں نور خان کے فرزند میاں محمد بخش کی شادی خاندان سے باہر
ایک دوشیزہ مسماۃ چراغ بی بی دختر فضل دین ڈار سے ہوئی۔ یہ خاتون
صابر و شاکر۔ سلیقہ مند۔ گھر گرہستی میں ماہر اور سلیم الطبع تھیں۔ ان کے بطن
سے ایک فرزند میاں محمد صادق کے علاوہ ایک دختر مسماۃ حمیدہ بیگم تولد
ہوئیں۔ اُن کی اس دختر کی شادی اندرونِ خاندان صوبیدار نذر محمد
پسر میاں خیر الدین سے ہو گئی۔ جن کے بطن سے علاوہ دو پسران میاں
محمد منظور الٰہی اور میاں محمد اقبال ایک دختر مسماۃ خورشید بیگم تولد ہوئیں
جو سولہ سترہ سال کی عمر کو پہنچ کر وفات پا گئیں۔ مسماۃ خورشید بیگم نہایت
حسین اور نازک اندام تھیں۔ اور شادی سے پہلے ہی فوت ہو گئیں۔

میاں محمد صادق کی شادی خاندان سے باہر ایک خاتون مسماۃ معراج
بیگم دختر نواب دین ڈار سے ہوئی۔ یہ خاتون انتہائی سادہ مزاج۔ وفا
شعار۔ متوازن قدر شخصیت کی حامل تھیں۔ ان کے بطن سے علاوہ دو
پسران (متوفی) دو دختران مسماۃ سلطان بیگم اور مسماۃ تاج بیگم تولد ہوئیں۔
مسماۃ سلطان بیگم کا نکاح خاندان سے باہر بابو محمد رفیق پسر محمد حسین ڈار سے
ہوا۔ لیکن انہوں نے عقد ثانی کر کے ہری پور (صوبہ سرحد) میں مستقل اقامت
اختیار کر لی اور اس طرح یہ خاتون اپنے میکے میں بلا اولاد مقیم ہونے پر
مجبور ہیں۔ مسماۃ تاج بیگم کی شادی اندرونِ خاندان اپنی پھوپھی زاد میاں

محمد منظور الٰہی پسر صوبیدار نذر محمد سے ہو گئی۔ ان کے بطن سے علاوہ دو پسران ایک دختر مسماۃ گل نساء تولد ہوئی۔ ہر دو پسران ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ جبکہ مسماۃ گل نساء کی شادی خاندان سے باہر صلاح الدین ولد محمد امین ڈار سے ہو چکی ہے۔ یہ لڑکی صاحب اولاد ہے۔ اور آج کل میکے میں مقیم ہے۔ حال ہی میں اُس کا خاوند سعودی عرب میں تلاشِ معاش کے سلسلہ میں گیا ہے۔

میاں نور خان کے فرزند میاں نبی بخش کی شادی اپنے تایا میاں رسول بخش کاردار بارود خانہ گجرات کی واحد دختر مسماۃ بیگم بی بی سے ہوئی۔ جن کا مفصل ذکر اپنے والد کی اولادوں کے زمرہ میں ہو چکا ہے۔ مسماۃ بیگم بی بی کے بطن سے علاوہ پانچ فرزندان میاں مختار نبی۔ میاں گلزار نبی۔ میاں محمد نظیر الحسن۔ میاں اقبال دین اور میاں محمد اقبال نبی تین صاحبزادیاں مسماۃ فیروزاں بی بی۔ مسماۃ زبیدہ بی بی اور مسماۃ محمودہ بی بی تولد ہوئیں۔

میاں نبی بخش کی صاحبزادی مسماۃ فیروزاں بی بی آٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ صغیر سنی میں اُن کی منگنی میاں محمد صادق سے ہو چکی تھی۔ لیکن اوائل عمری میں ہی یہ بچی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میاں نبی بخش کی دوسری صاحبزادی مسماۃ زبیدہ بی بی دوہرے جسم کی قبول صورت۔ سرو قامت۔ تندرست و توانا اور باوقار خاتون تھیں۔ ابتدائی گھریلو تعلیم و تربیت کے بعد سن بلوغت کو پہنچیں تو اُن کی شادی میاں ضیاء الدین پسر میاں گیلانی بخش سے ہو گئی۔ جو اُس وقت سب انسپکٹر

پولیس تھے ۔ مسمّاۃ زبیدہ بی بی کے بطن سے علاوہ چار فرزندان ایک دُختر مسمّاۃ اشرف بیگم تولد ہوئی ۔ جو بچپنے میں ہی فوت ہو گئیں ۔ مسمّاۃ زبیدہ بیگم انتہائی وفاشعار ۔ صلح جُو ۔ مرنجاں مرنج ۔ سلیقہ شعار ۔ ہمدرد اور صاحب اوصاف حمیدہ خاتون تھیں ۔ ابھی جوان ہی تھیں کہ بیمار پڑ گئیں ۔ اپنے چھوٹے بھائی میاں محمد اقبال سے انہیں والہانہ محبّت اور پیار تھا ۔ اُن کی بیماری کا بہت بُرا تاثر لیتے ہوئے خود بھی بیمار پڑ گئیں ۔ اپنی بیماری کے دوران بھائی کی صحت کے لیے دُعا کرتیں اور کہتیں " اللہ کریم مجھے بھائی کا غم نہ دینا ۔ اُس کی بجائے مجھے اُٹھا لینا ۔" اپنے بھائی سے صرف تین یوم پہلے ۲۴ر جون ۱۹۲۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی قبرستان بیگم پورہ میں مدفون ہوئیں ۔

میاں نبی بخش کی تیسری دُختر مسمّاۃ محمودہ بیگم قبول صُورت ۔ نازک اندام ۔ سرو قامت اور بھرپُور جوانی کی حامل دوشیزہ تھیں ۔ عین جوانی میں بعمر ۱۶ سال راہیٔ مُلکِ عدم ہوئیں ۔ اُن کی ابھی منگنی تک بھی نہیں ہوئی تھی ۔

میاں نبی بخش کے سب سے بڑے صاحبزادے میاں مختار نبی کی شادی سیالکوٹ شہر کے مشہور خواجہ خاندان میں خواجہ اللہ جوایا کی بڑی صاحبزادی مسمّاۃ فیروزہ بیگم الملقب بادشاہ بیگم سے ہوئی ۔ جو انتہائی سلیقہ شعار ۔ قبول صُورت ۔ متوازن قد و قامت اور پُر وقار شخصیت کی حامل خاتون تھیں ۔ تعلیم مڈل تک تھی ۔ گھریلو معاملات اور انتظامی خصوصیات سے متصف تھیں ۔ میکے اور سُسرال ہر دو جگہ آسودگی تھی ۔ ہر طبقۂ فکر میں عزت و احترام سے دیکھی جاتیں ۔ سُسرال میں سب سے بڑی اور پہلی بہو ہونے کے باوصف ہر اہم معاملہ میں خصوصی کردار کی حامل تھیں

شوہر کی چہیتی بیوی اور ساس سسر کی واجب التکریم بہو تھیں۔ میاں بیوی دونوں تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اُن کے بطن سے دو دختران جنابہ زیب النسا۔ اور جنابہ زینت النسا۔ تولد ہوئیں۔ چونکہ ان کے ہاں صرف یہی دو بچیاں تھیں اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ بیگم میاں مختار نبی نے ازدواجی زندگی میں کار چلانا سیکھا اور اپنے جلیل المرتبت خاوند کے ہمراہ ملی علمی مجالس میں شرکت فرمائی۔

میاں مختار نبی کی بڑی صاحبزادی محترمہ زیب النسا۔ صاحبہ نے ابتدائی پرائمری تعلیم کے بعد کوئین میری سکول دہلی سے میٹرک پاس کیا۔ بعد میں کینیرڈ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ خاندانِ منگرال راجپوت کی پہلی گریجوایٹ خاتون ہیں۔ اُن کی شادی خاندان سے باہر جناب ایس۔ ایم۔ اکرام آئی سی۔ ایس سے ہوگئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین لڑکوں کے ایک صاحبزادی شاہدہ اکرام بھی تولد ہوئی۔ جنابہ زیب النسا مقبول صورت۔ متوازن نقوش کی حامل۔ امورِ خانہ داری۔ نظم و نسق اور اقتصادیات میں ماہر خاتونِ خانہ ہیں۔ اہلِ خاندان سے حسنِ سلوک۔ خاوند کے عزیز و اقربا سے صلہ رحمی اور اولاد کے لیے سراپا ایثار کی مثالی شخصیت ہیں۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں وہ گرل گائیڈ اور بیڈمنٹن کی اچھی کھلاڑی تھیں اپنے عظیم ادیب و نامور افسر خاوند کی معیت میں صوبہ بمبئی۔ صوبہ بنگال اور صوبہ پنجاب کے علاقوں میں مقیم رہیں اور خواتین کی سرگرمیوں کے سماجی میدان میں بھی خاطر خواہ حصہ لیا۔ اپنے خاوند کے ہمراہ یورپ۔ امریکہ۔ برطانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا وسیع دورہ کیا۔ اپنے خاوند اور جواں سال سب سے چھوٹے بیٹے شیخ زاہد اکرام کی وفات کے بعد

محترمہ بیگم زینت رشید احمد صاحبہ
جناب ایس۔ ایم۔ اکرام صاحب سی ایس پی
محترمہ بیگم زیب النساء اکرام صاحبہ

محترمہ بیگم زینت رشید احمد صاحبہ
سید رشید احمد صاحب سابق ڈائریکٹر جنرل
ریڈیو پاکستان

الحاج شیخ محمد ایوب صاحب

محترمہ بیگم اشرف ایوب صاحب

وہ گوشہ نشینی میں کبھی لاہور اور کبھی راولپنڈی میں اپنی ذاتی قیام گاہ میں گزر بسر کر رہی ہیں۔ وہ اختلاجِ قلب کی مریضہ ہیں۔ گجرات سے اُنہیں بس اس قدر تعلقِ خاطر ہے کہ یہاں اُن کے عظیم والد میاں مختار نبی آسودۂ خاک ہیں ؎

اے گُل بہ تو خورسندم تو بُوئے کسے داری

اُن کی صاحبزادی جنابہ شاہدہ اکرام کی شادی ڈاکٹر جاوید اظفر (پی۔ ایچ۔ ڈی) پلاننگ کمیشن اسلام آباد (حکومتِ پاکستان) سے ہو چکی ہے۔ جنابہ زیب النساء گاہے گاہے اپنے مرحوم والد کی قبر کی زیارت کے لیے گجرات آتی ہیں۔

میاں مختار نبی کی دوسری صاحبزادی محترمہ زینت النساء نے ابتدائی پرائمری۔ مڈل اور میٹرک کی تعلیم کے بعد سال ۱۹۳۲ء میں کنیرڈ کالج لاہور سے بی اے (سیکنڈ ڈویژن) میں کیا۔ اُنہوں نے ایم۔ اے کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور سال ۱۹۳۴ء میں انگریزی زبان میں فسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کر کے یونیورسٹی بھر میں اوّل رہیں اور سونے کا تمغہ جیتا۔ چنانچہ سرکاری وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے اُنہیں برطانیہ بھیجا گیا۔ جہاں کیمبرج یونیورسٹی میں سال ۱۹۳۶ء میں اُنہوں نے تعلیمی اور تدریسی سرٹیفکیٹ سیکنڈ ڈویژن میں حاصل کیا جس میں حسبِ ذیل مضامین شامل تھے۔ تدریس۔ بچوں کی نفسیات۔ ذرائعِ تعلیم بالخصوص تعلیمی اصول و اسلوبِ تعلیم۔

وطن واپسی پر اُنہیں لاہور کالج برائے خواتین میں سرکاری ملازمت میں بطور سینئر لیکچرار لے لیا گیا۔ اس دوران اُن کی شادی سیّد رشید احمد

سابق ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سے ہو گئی۔ اُن کے بطن سے صرف
دو دختران شبنم اور رعنا تولد ہوئیں۔ چونکہ سید رشید احمد کراچی میں
تعینات تھے اس لیے خوشگوار ازدواجی زندگی کی راہ میں اُن کی
بیگم کی ملازمت لاہور کو سدِ راہ نہ بننے دیا گیا اور بیگم زینت رشید احمد
صاحبہ نے حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر کراچی
کی راہ لی۔ یہاں پہلے اُنھوں نے بطور پروفیسر اور پھر بطور پرنسپل گورنمنٹ
کالج برائے خواتین کراچی پندرہ سال تک کام کیا۔ اس سے پہلے وُہ
وزارتِ اطلاعات و نشریات میں بھی متعدد شعبوں سے منسلک رہیں۔
اپنے قیام کراچی کے دوران اُنھوں نے کئی اقساط میں اخبار مارننگ نیوز
اور نیشنل پریس ٹرسٹ میں "تعلیم اور نوجوان نسل" کے موضوع پر متعدد
مضامین شائع کروائے۔ اُنھوں نے ریڈیو پاکستان سے ثقافتی اور تعلیمی
عنوانات پر متعدد تقاریر براڈکاسٹ کیں اور مباحثوں میں حصہ لیا۔ اُنھوں
نے پاکستان ڈیلیگیشن جو ایشیا اور افریقی ممالک کی کانفرنس منعقدہ بمقام
سیلون میں جا رہا تھا کے لیے ورکنگ پیپر تیار کیا۔ اُنھوں نے خود بھی
بطور ممبر یا لیڈر "یونیورسٹی خواتین کانفرنس" منعقدہ لندن۔ پیرس اور
ہیلسنکی کے علاوہ اپنے ملک پاکستان میں بھی شمولیت کی۔ اُنھوں نے
پہلی کامن ویلتھ کانفرنس میں بمقام آکسفورڈ بطور ایڈوائزر پاکستان
ڈیلیگیشن شمولیت فرمائی۔

اپنے ملک کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے تحت اُنھوں نے یورپ
کے اکثر ممالک کے سرکاری دورے کیے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ
میں خواتین کے کالج اور یونیورسٹیوں کا معائنہ کیا اور اپنے خاوند کی

معیت میں ریڈیو اور ٹی وی کے نظام کا تمام امریکہ میں مشاہدہ کیا۔ حکومت
پاکستان کی طرف سے عورتوں کے پہلے خیرسگالی دورہ پر بطور سرکاری
ممبر سویٹ یونین کا بھی بیگم زینت رشید احمد صاحبہ نے دورہ کیا۔
اُن کی گراں قدر تعلیمی خدمات کے صلہ میں حکومتِ پاکستان نے
اُنھیں تمغۂ قائداعظم اور ستارۂ خدمت کے اعزازات سے نوازا۔ بیگم
زینت رشید احمد صاحبہ تعلیمی کونسل اور سنڈیکیٹ۔ تعلیمی نصاب اور
امتحانی کمیٹیوں کے علاوہ خواتین کے سپورٹس بورڈ کی بھی ممبر اور سرگرم
رُکن رہی ہیں۔ وہ کراچی کے بورڈ آف سیکنڈری و ہائر سیکنڈری ایجوکیشن
کی بھی ممبر تھیں۔ وہ پرنسپل ایسوسی ایشن کراچی کی نائب صدر، اور کراچی کالج
برائے خواتین واپوا کالج برائے خواتین کراچی کی چیئرمین رہیں۔ بیگم زینت
رشید احمد صاحبہ پاکستان فیڈریشن آف یونیورسٹی خواتین کی بانی اور
تین بار مسلسل صدر منتخب ہوئیں۔ وہ سال ۱۹۷۱ء میں بطور پرنسپل کراچی
کالج برائے خواتین ریٹائر ہوئیں۔ اُن کی مستقل دلچسپی اور خصوصی مشاغل
میں تعلیم نسواں۔ ثقافت کا فروغ اور نوجوان نسل کی تربیت اور اُن کی
بہبود شامل ہے۔
وہ ایک اچھی بیوی۔ جاں نثار ماں۔ ہمدرد بہن۔ سلیقہ مند رفیقۂ حیات
اور فنونِ لطیفہ سے شغف رکھنے والی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتونِ قوم ہیں۔
اُنھوں نے اُس زمانہ میں تعلیم کی شمع فروزاں کی جب مسلمانوں میں پردہ
کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی اور عام طور پر لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب
خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن آفرین ہے اُن کے مایۂ ناز والدین پر اور سلام
ہے خود ان کے عزم و ہمت کو کہ انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ ؎

یقیں محکم، عملِ پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

میاں نبی بخش کے پسرِ ثانی میاں گلزار نبی جوانی میں ہی شادی سے پہلے وفات پا گئے۔ اس لیے اُن سے سلسلۂ اناث و ذکور کا شروع ہونا ہی ممکن نہیں تھا۔

میاں نبی بخش کے فرزندِ سوئم میاں محمد نظیر الحسن کی شادی خاندان سے باہر راولپنڈی کے خواجہ مہر بخش کی دُختر مسمّاۃ زینب بی بی سے ہوئی۔ جو میانہ قد کی حسین و جمیل خاتون ہونے کے علاوہ متوازن خدو خال کی سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ اپنے اعلیٰ خاندانی وقار اور والدین کی ارفع تربیت نے اُن میں جوہرِ کامل کی تمام خصوصیات اُجاگر اور درخشاں کر رکھی تھیں۔ وہ نہایت درجہ صابر۔ وفا شعار۔ ہمدرد۔ کفایت شعار خوش وضع و خوش اطوار خاتونِ خانہ تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ چار پسران دو دُختران مسمّاۃ اختر النساء۔ اور جنابہ اشرف النساء تولد ہوئیں۔ مسمّاۃ اختر النساء تو اپنی پیدائش کے چند ماہ بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ جبکہ جنابہ اشرف النساء نے اپنی والدہ کی زیرِ تربیت اپنا بچپن اور جوانی بسر کی۔ وہ آغاز سے ہی کم گو۔ باوقار۔ ذہین اور اوصافِ حمیدہ کی حامل دُخترِ قوم شمار ہوتی تھیں۔ گھر میں پردہ کی پابندی تھی لیکن والدین میں اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ذوق بدرجۂ اَتم موجود تھا۔ اپنی تایازاد بہنوں کی اعلیٰ معیار کی تعلیم و تربیت نے اُن کے شوقِ حصولِ تعلیم کو مہمیز کا کام دیا۔ تعلیمی میدان میں باعزم جہدِ مسلسل سے بھائیوں کے ساتھ ساتھ اشرف النساء نے بھی گھر پر لگاتار محنت سے متعدد تعلیمی میدان سر کرنے شروع

کیے۔ میٹرک میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کے بعد اُنہوں نے ایف اے
پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بی اے کا امتحان اسلامیہ
کالج فارومن لاہور سے پاس کیا اور اپنے مضامین میں یونیورسٹی میں جو اُس
وقت غیر منقسم پنجاب کی واحد یونیورسٹی تھی اور جس میں ہندو، سکھ اور
مسلمان طلباء اور طالبات کثیر تعداد میں شامل تھے اوّل آئیں۔ اس امتیازی
کامیابی پر انہیں گورنمنٹ سکالرشپ ملا۔ ایم اے کا امتحان انہوں نے
گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے پاس کیا اور پھر اپنے مضمون اکنامکس میں
یونیورسٹی کی لڑکیوں میں اوّل آئیں۔ اُن کے والدِ گرامی اُنہیں خود کالج میں
صبح چھوڑنے اور واپسی پر لینے جاتے۔ تعلیم کے دوران اُنہوں نے پردہ
کی پابندی برقرار رکھی۔ وہ انتہائی منکسر المزاج طالبہ تھیں۔ زمانۂ طالب علمی
اور مابعد بھی انہوں نے سادہ اور پُروقار زندگی بسر کی۔ وہ ایک مشرقی
خاتون کی جملہ صفات سے متصف ہیں۔ اُن کی والدہ مسماۃ زینب بی بی
نے بھی کمال ایثار اور مروّت سے اپنی بچی کی اعلیٰ تربیت میں اپنے خاوند
کا ساتھ دیا۔ مسماۃ زینب بی بی ۳۱ جولائی ۱۹۴۴ء کو وفات پا گئیں اور
چاہ ٹھاکر دالہ موضع بانٹھ سے ملحق خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئیں۔
اپنی والدہ کی وفات کے چند سال بعد جنابہ اشرف النساء کی شادی
جناب ایس۔ ایم ایوب جو اس وقت وزارتِ مالیات میں ایک اعلیٰ عہدہ
پر فائز تھے سے ہو گئی۔ اس سے قبل جنابہ اشرف النساء نے چند سال بطور
لیکچرار اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ گرلز کالج لائلپور میں کام کیا۔ شادی
کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے کراچی کالج فارومن اور اس کے بعد راولپنڈی
کے ایک کالج میں بطور لیکچرار کام کیا۔ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کے

چند سال بعد اُنہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور ایک مشرقی خاتونِ خانہ کی زندگی کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ اپنے ادیب و فارسی زبان کے نغز گو شاعر خاوند کی معیت میں مشرقِ بعید، مشرقِ وسطیٰ، شمالی افریقہ اور یورپ کا طویل سفر اُنہوں نے مختلف اوقات میں کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا سفر انہوں نے متعدد بار کیا اور اس سلسلہ میں اپنے سفرناموں کو قلم بند کر کے محفوظ کیا وہ اچھی ادیبہ اور واقع نگار خاتون ہیں۔ اُنہوں نے اپنے جلیل القدر خاوند کی رفاقت میں پانچ مرتبہ حج بیت اللہ اور حاضری دربارِ رسالت کی سعادت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ خاندانِ منگرالانِ گجرات کی دوسری ایم اے دختر ہیں۔ وہ حلیم الطبع، کفایت شعار، سلیقہ مند، مرنجاں مرنج، خاموش طبیعت، ذہین اور گھریلو خاتون ہیں۔ اپنی طبیعت کے ٹھہراؤ اور راضی برضا رہنے کی بناء پر وہ ایک قناعت پسند زندگی بسر کر رہی ہیں اور کیوں نہ ہو ؎

فروتنی است دلیلِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

آج کل دونوں میاں بیوی دُنیا کے سفر پہ سیاحت کی غرض سے گئے ہوئے ہیں۔

میاں محمد نظیر الحسن کے فرزندِ اکبر میاں فیض الحسن فیضی نے مجرد زندگی کو اپناتے ہوتے شادی نہیں کی۔ میاں محمد نظیر الحسن کے فرزندِ ثانی میجر محمد بشیر الحسن کی شادی میسرز فیروز سنز لاہور کے چیئرمین جناب عبدالحمید خاں کی صاحبزادی مسماۃ مسرت جہاں سے ہوئی۔ اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ وہ خلیق، متواضع، خوش گفتار، مخیر، عالی حوصلہ، صلہ رحمی پہ یقین

بیگم قمر النساء اعجاز (اہلیہ اقامتی مجسٹریٹ شکر گڑھ) ایک سکول کے نئے بلاک
کی رسم افتتاح کے موقع پر۔ اُن کے بائیں جانب بیگم اصغر علی میاں صاحبہ
(اہلیہ ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ) اور بیگم تحصیلدار شکر گڑھ ہیں۔

مؤلف، انیلہ اعجاز نبی، بیگم قمر اعجاز صاحبہ بچی کی رسم عقیقہ و سالگرہ کے موقع پر۔

رکھنے والی پُروقار شخصیت کی مالکہ ہیں۔ وہ متوازن خدوخال کی خاتون ہیں۔ ورثہ میں ملی ہوئی ستودہ صفات وعادات کے علاوہ گھریلو انتظام اور رکھ رکھاؤ کی اعلیٰ اقدار سے متصف ہیں۔ میکے اور سُسرال ہر دو جگہ نہایت عزت و احترام سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے بطن سے علاوہ دو پسران ایک دُختر طلعت بشیر تولد ہوئیں۔ بچوں کی تربیت میں والدین نے انتہائی محنت اور شفقت سے کام لیا۔ جنابہ طلعت بشیر انتہائی خاموش طبع باخلاق ذہین اور بلند کردار دُخترِ قوم ہیں۔ انہوں نے نہایت محنت اور لگن سے اپنی تعلیم جاری رکھی اور اچھی پوزیشن میں بی اے پاس کیا۔ والدین نے نہایت تزک و احتشام سے اُن کی شادی خاندان سے باہر کی۔ اُن کے بطن سے ایک دختر مسماۃ عائشہ تولد ہوئیں۔ شادی کے چند سال بعد فریقین میں علیحدگی ہو گئی۔ جنابہ طلعت بشیر آج کل اپنے میکے میں اعلیٰ تعلیمی کورس کرنے میں منہمک ہیں۔ وہ انتہائی صابر و شاکر، پابندِ صوم وصلوٰۃ اور نیک طینت خاتون ہیں۔

میاں محمد نظیر الحسن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ریٹائرڈ کرنل محمد ریاض الحسن کی شادی کشمیری بازار لاہور کے ایک تاجر خاندان چائنسمر ہاؤس والوں کی صاحبزادی مسماۃ سنبہ سلطانہ سے ہوئی۔ اُن کے بطن سے علاوہ دو پسران دو دُختران نبیلہ ریاض المعروف گُنّی اور گُل رعنا المعروف پھُول تولد ہوئیں۔ اوّل الذکر کچھ عرصہ پہلے ایف اے کی طالبہ تھیں اب اُن کی شادی ہو چکی ہے جبکہ موخر الذکر میٹرک میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ہر دو بچیاں سرو قامت، خوش وضع، بلند اخلاق، ذہین اور نیک سیرت دُخترانِ قوم ہیں۔ اپنے تعلیمی مشاغل کے علاوہ کھیلوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔

میاں محمد ریاض الحسن کے ہر دو صاحبزادے ابھی خورد سال ہیں۔ میاں محمد ریاض الحسن اور اُن کی زوجۂ محترمہ دونوں سال ۱۹۹۴ء میں سعادتِ عمرہ و حاضریِ دربارِ رسالت مآب سے مشرف ہو چکے ہیں۔

میاں نبی بخش کے چوتھے فرزند میاں اقبال الدین بچپنے میں ہی رحلت کر گئے۔ جبکہ اُن کے پانچویں اور سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد اقبال نبی کی شادی اپنے حقیقی ماموں میاں حسین بخش کی صاحبزادی محترمہ اقبال بیگم (والدہ مؤلف) سے ہوئی جن کا مفصل ذکر میاں حسین بخش کی اولادِ اناث کے سلسلہ میں اسی باب میں گزر چکا ہے۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین صاحبزادوں کے کوئی دُختر تولّد نہیں ہوئی۔

میاں محمد اقبال نبی کے صاحبزادے میاں اعجاز نبی (مؤلف) کی شادی خاندان سے باہر ۸ فروری ۱۹۸۴ء کو سیالکوٹ کے خواجہ خاندان کے چشم و چراغ خواجہ محمد اکرم کی دُختر ثانی جنابہ قمر النساء سے ہوئی۔ جن کی تعلیم مڈل تک تھی۔ یہ خاتون میاں مختار نبی کی زوجہ محترمہ فیروزہ بیگم کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی کی دُختر تھیں۔ اور جنابہ فیروزہ بیگم کی سعی سے ہی یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ جنابہ قمر النساء قبول صورت۔ دراز قد۔ متوازن خدوخال۔ کشادہ پیشانی۔ فرخندہ جبیں۔ خوش خلق۔ نیک سیرت۔ سلیقہ شعار۔ زیرک۔ معاملہ فہم۔ وفا شعار۔ صلہ رحمی کرنے والی اور پُرخلوص خاتونِ خانہ ہیں۔ انہوں نے انیلہ اعجاز نبی کو گود لیا۔ اور میاں بیوی اُس کی اعلیٰ پایہ کی تعلیم و تربیت میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ اُن کی بیٹی انتہائی ذہین۔ حاضر دماغ۔ خوش پوش شگفتہ مزاج اور ہر دلعزیز ہونہار طالبہ ہیں۔ اس نے نرسری۔ کے۔ جی I اور کے۔ جی II میں اپنی جماعت میں ہر بار اوّل پوزیشن

انیلہ اعجاز نبی

محترمہ فرخندہ اختر صاحبہ۔ محترمہ بیگم قمر اعجاز صاحبہ محترمہ اقبال بیگم صاحبہ

سال ۱۹۷۵ء کے دوران مؤلف و بیگم قمر اعجاز باب المجیدی مسجدِ نبوی مدینہ منورہ کے باہر

حاصل کی۔ اب وہ میونسپل جونیئر ماڈل سکول گجرات میں درجہ کے جی چہارم کی طالبہ ہیں۔ وہ اپنی پُر ذہانت باتوں اور اوصافِ حمیدہ سے ہر ملنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ اُن کی قابلیت اور تعلیمی لگن کا یہ عالم ہے کہ وہ ابھی صرف سات سال کی عمر میں کے جی چہارم کی طالبہ ہیں۔ گویا اپنی ہم عمر بچیوں سے تعلیم میں ایک سال آگے ہیں۔ جنابہ قمر النساء گھر میں اپنی بیوہ ساس اور خاوند (مؤلف) کی خدمت کے علاوہ ہر آنے جانے والے فردِ خاندان کے لیے سراپا عقیدت اور مروت ہیں۔ سال ۱۹۶۵ء میں پہلی بار اُنہیں حج بیت اللہ کی سعادت کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح وہ اِس خاندان کی پہلی بہو ہیں جن کو اس قدر کم عمر میں زیارتِ حرمین نصیب ہوئی۔ اپنے میکے میں بھی وہ اپنی ہم جلیس وہم عمر خواتین میں منفرد خاتون ہیں جو سب سے پہلے اس شرف سے ہم کنار ہوئیں۔ اُنہیں سال ۱۹۷۲ء میں دوسری مرتبہ حاضری دربارِ حبیبِ کبریا اور حجِ کعبہ کی سعادت ملی۔ اس لحاظ سے بھی وہ خاندانِ منگرالان کی واحد بہو ہیں جو ایک سے زاید مرتبہ ارضِ مقدس گئیں۔ وہ ایک صابر و شاکر۔ قناعت پسند اور راضی برضا خاتون ہیں۔

میاں محمد اقبال نبی کے پسر میاں افتخار نبی کی شادی بھی خاندان سے باہر ایک کشمیری نژاد خاتون مسماۃ قمر بانو سے ہوئی۔ میاں محمد افتخار نبی شادی کے دو سال بعد فوت ہو گئے۔ ان کے ہاں بھی کوئی اولاد تولد نہیں ہوئی۔ عدت پوری کرنے کے بعد مسماۃ قمر بانو نے میکے میں ہی نکاح ثانی کر لیا۔ اور یوں اُن کے روابط اس خاندان سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گئے۔

میاں نورو خان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں گیلانی بخش

نے ضلع سیالکوٹ کے موضع گھرتل کی ایک دوشیزہ سے شادی کی جن کا نام مستماۃ کرم بی بی تھا۔ یہ شادی خاندان سے باہر ہوئی ۔ اُن کے بطن سے صرف دو فرزند میاں نوبہار الدین و میاں فضل بہار الدین تولد ہوئے۔ چند سال بعد یہ صاحبہ اوصافِ حمیدہ فوت ہوگئیں ۔ ان کی فوتیدگی کے کچھ سال گزرنے کے بعد میاں گیلانی بخش نے موضع کھیپڑانوالہ ضلع گجرات کے ایک زمیندار خانوادہ کی خاتون مستماۃ فضل بی بی سے عقدِ ثانی کیا۔ یہ خاتون باوقار۔ صاحبِ حوصلہ۔ مرنجان مرنج۔ خدمت گزار اور گھریلو قسم کی عورت تھیں ۔ انہوں نے کمال محنت و دیانت سے گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالا دیا۔ وہ "سسرال میں" "اماں جنتی" کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ باوجود صلبی اولاد کے نہ ہونے وہ اپنے خاوند کی واحد زندہ اولاد میاں نوبہار الدین کو اپنے بچہ کی طرح چاہتی تھیں اور اس کُنبہ کے لیے سراپا شفقت و ایثار تھیں ۔ اپنے خاوند کی وفات کے بعد اور پھر اپنے سوتیلے بیٹے کی مرگ کے بعد وہ پہلی سی تندہی کے ساتھ اُن کی اولاد کی خدمت میں لگی رہیں اراضیات کے انتظام و انصرام اور مزارعین سے پیداوار کے حصّہ کا حصول کمال دانشمندی سے کرتی رہیں ۔ وہ ایک مدبر اور سلیقہ مند خاتون تھیں جو باوجود اَن پڑھ ہونے کے غایت درجہ انتظامی خوبیوں کی حامل تھیں۔ سال ۱۹۴۴ء میں اپنے خاوند کی وفات کے بعد گھریلو نظم و نسق کُلی طور پر اُن کے ہاتھ میں تھا۔ جب تک زندہ رہیں کسی سے پرخاش نہیں رکھی۔ اور اس شعر کی تفسیر بنی رہیں کہ ؎

آزادہ رَو ہوں اور مِرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے!

ایستادہ :- مؤلف - خواجہ محمد اکبر - ضرار بن نصیر
نشستہ :- ندیم خاور - انیلہ اعجاز - بیگم نزہت سرور - بیگم قمر اعجاز - بیگم فریدہ اکبر -

ایستادہ : تمثیلہ ظفر - ندیم خاور - بیگم فریدہ اکبر - بیگم نزہت سرور - بیگم اکرام فاطمہ ظفر - تحریم ظفر - ضرار بن نصیر - راحیلہ ظفر
نشستہ : بیگم قمر اعجاز - صوفیہ سرور - انیلہ اعجاز - عاصم سرور - مؤلف -
انیلہ اعجاز کے عقیقہ پر لواحقین کا ایک گروپ فوٹو

میاں گیلانی بخش کے صاحبزادے میاں فضل بہارالدین تو بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اس لیئے اُن کا سلسلۂ ذکور میاں نو بہارالدین سے چلا۔ جنہوں نے اپنے تایا میاں نبی بخش کی دُختر ثانی مستماۃ زبیدہ بی بی سے شادی کی جن کا ذکر اسی باب میں تحت اولاد میاں نبی بخش ہو چکا ہے مستماۃ زبیدہ بی بی کی وفات کے بعد میاں نو بہارالدین کی دوسری شادی خاندان میں ہی میاں محمد اشرف کی دُختر ثانی مستماۃ اصغری بیگم سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ تین فرزند میاں محمد محمود اختر۔ میاں محمد مسعود اختر۔ میاں محمد محبوب اختر تین دُختران مستمات مسرت النساء۔ مستماۃ فخر النساء اور مستماۃ عفت النساء تولد ہوئیں۔ لڑکوں کے علاوہ تینوں بچیوں کو والدین نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ چنانچہ ابتدائی پرائمری اور مڈل تعلیم کے بعد تینوں بچیوں نے میٹرک پاس کیا اور یکے بعد دیگرے اپنے والد کی وفات کے بعد سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ مستماۃ مسرت النساء کی شادی خاندان سے باہر جناب محمد انور سٹیشن ماسٹر ریلوے سے قرار پائی اور وہ ایک بھرپور گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ اُن کی اولادیں ذکور اور اناث موجود ہیں۔ وہ ایک سلیقہ شعار بیوی۔ محبت کرنے والی ماں اور نہایت کامیاب خاتونِ خانہ ہیں۔

مستماۃ فخر النساء کی شادی جناب محمد رفیق احمد خان انسپکٹر گڈس محکمہ ریلوے سے ہوئی۔ یہ خاتون بھی اپنے گھر میں شاد و آباد ہیں اور اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب ہیں۔ وہ وفا کیش، متوازن شخصیت اور گھریلو اوصاف سے متصف خاتون ہیں۔ اُن کی شادی بھی خاندان سے باہر ہوئی ہے۔

مستماۃ عفت النساء کی شادی پہلے ایک جگہ خاندان سے باہر ہوئی۔

جہاں اُن کے ہاں ایک فرزند بھی تولّد ہوا۔ لیکن میاں بیوی میں اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ چنانچہ یہ نزاع طلاق پر منتج ہوا۔ بعد میں مسمّاۃ عفت النساء کی دوسری شادی موضع ساہنہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات کے ایک زمیندار و رئیس چوہدری صالح محمّد سے ہوگئی۔ جہاں یہ خاتون انتہائی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔

میاں نوبہار الدین کی زوجہ اوّل مسمّاۃ زبیدہ بی بی سے واحد موجود اور سلسلۂ ازدواج میں منسلک صاحبزادے میاں محمّد ظفر کی شادی اپنے والد کے حقیقی ماموں زاد بھائی شیخ رحمت اللہ انسپکٹر آف سکولز کی دختر جنابہ اختر النساء سے ہوئی جو دراز قامت۔ متوازن جسم۔ معتدل ناک نقشہ کی صحتمند گریجوایٹ خاتون ہیں۔ اُن دونوں کی منگنی قریباً گیارہ سال تک برقرار رہی۔ جنابہ اختر النساء ایک پڑھی لکھی سلیقہ شعار اور انتظامی امور میں پوری دسترس رکھنے والی گھریلو خاتونِ خانہ ہیں۔ وہ تعلیم کے حصول میں خود بھی پیش پیش رہیں اور انہوں نے اپنے بچّوں کی تعلیم میں بھی بھرپور حصّہ لیا۔ اپنے خاوند کی ملازمت کے دوران سُسرال سے دُور رہنے کی وجہ سے حصّہ اراضی اور حصّہ مکانِ جدی کا اپنی سوتیلی ساس کی اولاد سے علیحدہ کروانا، اُن کی غایت درجہ حکمت عملی اور ذہانت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے کمال دانشمندی اور سلیقہ سے اپنے حصّہ کی جائیداد کو اپنی گرفت میں لیا۔ اپنی بہترین انتظامی استعداد کی بدولت اب بھی وہ اراضی جدی کے معاملات اور گھریلو گتھیوں کو بطریقِ احسن سلجھانے کا ملکہ رکھتی ہیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ ایک فرزند میاں محمّد بلال ظفر دو صاحبزادیاں جنابہ نبیلہ ظفر ناز اور جنابہ روبینہ شاہین تولّد ہوئیں۔ انہوں نے اپنے خاندانی ورثہ تعلیم

کے فروغ اور بچیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اپنے خاوند کی بھرپور اعانت کی۔

میاں محمد ظفر کی بڑی صاحبزادی جنابہ نبیلہ ظفر ناز قبول صورت - سرو قامت - پُرکشش شخصیت - خوش مزاج اور اعلیٰ کردار کی مالک دُختر قوم ہیں جنہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد بی اے پاس کیا - اُن کی شادی جناب محمد نسیم سالسٹر نیشنل ہیلتھ اینڈ سوشل سکوریٹی لندن (برطانیہ) سے ہو چکی ہے - اور اُن کے بطن سے تاحال ایک بچی روبیلہ نامی تولد ہوئی ہے - جنابہ نبیلہ نسیم ایک خُوش گفتار دُختر قوم ہیں - انگریزی بڑی روانی سے بولتی ہیں - وہ مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتی ہیں - اُن کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک ہے -

میاں محمد ظفر کی دُوسری صاحبزادی جنابہ روبینہ شاہناز بھی کھلتے ہوئے رنگ ، شگفتہ - کتابی چہرہ - معتدل مزاج - دراز قامت اور اعلیٰ اقدار کی حامل دوشیزہ ہیں - اُنہوں نے حال ہی میں بی اے پاس کیا ہے - وہ فنونِ لطیفہ سے والہانہ شغف رکھتی ہیں - گھریلو تقریبات اور نجی محفلوں کی جان ہیں - اُن کی سہیلیوں اور ملاقاتوں کا حلقہ بہت وسیع ہے - کالج میں ہونے والے ڈراموں میں بھی خاطر خواہ اور نمایاں حصہ لیتی رہتی ہیں - وہ ایک مقبول اور صاحبِ کردار طالبہ تھیں - آج کل گھریلو کام کاج میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹا رہی ہیں - وہ سخت کوشش اور محنت کی دلدادہ دُختر قوم ہیں اُن کا مقدس نظریہ ہے کہ :

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں !
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنیکی خو کر لے

میاں محمد ظفر کے صاحبزادے میاں محمد بلال ابھی کنوارے ہیں۔

میاں نوبہار الدین کی زوجہ ثانی محترمہ اصغری بیگم کے بڑے صاحبزادے میاں محمد محمود اختر کی شادی خاندان سے باہر اپنی سوتیلی دادی مسماۃ فضل بی بی کے لواحقین کی ایک دوشیزہ مسماۃ سعیدہ تبسم سے ہوئی۔ جو قبول صورت نازک اندام۔ باسلیقہ اور گھریلو خاتون ہیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ چار پسران دو دختران مسماۃ عائشہ محمود (عمر ۱۴/۱۳ سال) اور مسماۃ عائمہ محمود (عمر تین ماہ) تولد ہوئی ہیں۔ میاں بیوی کے مراسم غایت درجہ خوشگوار ہیں۔ مسماۃ سعیدہ تبسم بااخلاق۔ انتظامی امور سے بہرہ ور ایک وفا شعار بیوی اور بلند کردار کی حامل خاتون خانہ ہیں۔

میاں نوبہار الدین کے صاحبزادے میاں محمد مسعود اختر نے ایک دوشیزہ مسماۃ روبینہ بیگم سے بیرون خاندان دسمبر ۱۹۷۴ء میں اپنی پسند کی شادی کی ہے۔ مسماۃ روبینہ بیگم ایک سلجھی ہوئی۔ بھرے جسم اور متوازن نقوش کی معتدل مزاج خاتون ہیں۔ دونوں میاں بیوی اپنی جدی اراضی واقعہ متصل آبادی موضع بانٹھ پر مقیم ہیں۔ جہاں اُنہوں نے اپنی حسب ضرورت رہائشی اقامت گاہ تعمیر کر رکھی ہے۔ دونوں ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔

میاں نوبہار الدین کے سب سے چھوٹے فرزند میاں محمد محبوب اختر ابھی کنوارے ہیں۔

## میاں محمد مقصود کے پسر میاں پیر خان کے ورثا اور اُنکی خواتین

میاں محمد مقصود کی زوجہ کے نام اور خصائل کے بارہ میں کسی ذریعہ

سے بھی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ اس لیئے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا
کہ اُن کی شادی خاندان ہی سے ہی قرار پائی یا وہ بیرونِ خاندان بیاہے
گئے۔ البتہ اُن کے واحد پسر میاں پیر خان کی شادی خاندان سے باہر
ایک خاتون مسماۃ شرف بی بی سے ہوئی۔ یہ خاتون ایک سلیقہ شعار گھر
گرہستی میں ماہر اور باوقار بہو شمار ہوتی تھیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ
دو پسران میاں چراغ دین اور میاں خیر الدین دو دُختران مسماۃ وزیر بیگم
اور مسماۃ جواہر بی بی تولد ہوئیں۔ یہ دونوں خواتین اپنے دور کی سگھڑ اور
گھریلو عورتیں شمار ہوتی تھیں۔ تعلیم معمولی اور گھریلو قسم کی تھی۔ جوانی کو پہنچیں
تو مسماۃ وزیر بیگم کی شادی خاندان کے اندر ہی میاں نور خان سے ہو گئی
یہ شادی میاں نور خان کی زوجہ اول کی وفات کے بعد ہوئی اور
بطور عقدِ ثانی میاں نور خان سے ہوا۔ مسماۃ وزیر بیگم کی کوکھ سے خاندانِ
منگرالانِ گجرات کے عظیم فرزند پیدا ہوئے جن کی اولادیں کنبہ میں
سربرآوردہ اور ممتاز شخصیات کی حامل ہوئیں۔ مسماۃ وزیر بیگم ایک
خوددار۔ باوقار۔ صاحبِ فراست۔ ذی شعور۔ باحوصلہ اور نیک طینت
خاتون تھیں۔ انہوں نے اولاد کی پرورش اور تربیت میں بھرپور حصہ
لیا۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود اولاد کو پڑھایا اور زمانہ کی رفتار
کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے انہیں تیار کیا۔ علاوہ تین پسران میاں
محمد بخش۔ میاں نبی بخش اور میاں گیلانی بخش، مسماۃ وزیر بیگم کے بطن
سے چار دُختران مسماۃ ریشم بی بی۔ مسماۃ سردار بیگم۔ مسماۃ مہتاب بیگم
اور مسماۃ عباس بیگم تولد ہوئیں۔ مسماۃ ریشم بی بی کا مفصل ذکر میاں
رسول بخش کے پسر میاں وزیر بخش کی زوجہ کے سلسلہ میں پہلے گزر

چُکا ہے ۔ مسمّاۃ سردار بیگم باوقار ۔ حسین ۔ متوازن خطوط اور کتابی چہرہ
کی دُختر قوم تھیں اُن کی شادی خاندان سے باہر شیخ فاروقی کنبہ کے
شیخ فیروز الدین افسر مال سے ہوئی جن کے نام پر ریلوے سٹیشن
گجرات سے ملحق آبادی فیروز آباد معرضِ وجود میں آئی اور جن کے
بیٹوں میں سے شیخ محمد نیاز فاروقی (مرحوم)، ایگزیکٹو انجینئر انہار
شیخ محمد افضل فاروقی (مرحوم)، لیفٹیننٹ جنرل (ڈائریکٹر جنرل
میڈیکل سروسز حکومتِ پاکستان)، اور شیخ محمد اکبر فاروقی (مرحوم) سابق
چیئرمین میونسپل کمیٹی گجرات نے شہرتِ تامہ حاصل کی ۔ مسمّاۃ وزیر بیگم
کی صاحبزادی مسمّاۃ مہتاب بیگم کی شادی بھی خاندان سے باہر
جلال پور جٹاں کے رئیس میاں نواب دین ڈار سے ہوئی ۔ جن کے
بطن سے میاں صبیح صادق گرداور قانونگوئی اور مسمّاۃ معراج بیگم
زوجہ میاں محمد صادق تولد ہوئیں ۔

مسمّاۃ وزیر بیگم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی مسمّاۃ عباس بیگم کی
شادی گجرات کے ہی سیّد فضل شاہ (المعروف سمدے شاہ) سے
ہوئی جن کے پسران سیّد عظمت علی (ریٹائرڈ) ڈی ۔ ایس ۔ پی
(پولیس محکمہ) سیّد الطاف حسین (ریٹائرڈ) سپرنٹنڈنٹ پولیس
اور سیّد تفضل علی (تاجر) سربرآوردہ شخصیتیں کہلائے ۔ گویا مسمّاۃ
وزیر بیگم کے بطن سے میاں نورد خان کے فرزند اور اناث ہر دونوں
جانب سے مقتدر ہستیوں نے جنم لیا ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میاں پیرو خان کی دُختر ثانی مسماۃ جواہر بی بی گجرات ہی کے قوم بٹ کے نامور سلوٹ جناب فضل دین ڈار سے ہوئی۔ اُن کے بطن سے بھی تین پسران نواب دین، گلاب دین اور محمد حسین کے علاوہ ایک دُختر مسماۃ چراغ بی بی زوجہ میاں محمد بخش تولد ہوئیں۔

میاں پیرو خان کے پسر میاں چراغ دین نے ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کی ایک دوشیزہ مسماۃ حسن بی بی سے شادی کی۔ اُن کے ہاں عرصہ تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس خاتون کی وفات کے بعد میاں چراغ دین نے موضع چک سادا تحصیل گجرات کی ایک خاتون مسماۃ حسین بی بی (المشہور اماں چک والی) سے عقد ثانی کیا۔ لیکن ان کے بطن سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ہر دو خواتین خاموش طبیعت، نیک صفات اور بلند کردار کی حامل تھیں۔

میاں پیرو خان کے فرزند ثانی میاں خیر الدین کی شادی خاندان سے باہر موضع جلا پور جٹاں کی دوشیزہ مسماۃ زینب بی بی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے علاوہ چار پسران میاں محمد مرید، میاں قمر الدین، میاں محمد الدین اور میاں نذر محمد کے ایک دُختر مسماۃ نواب بی بی تولد ہوئیں جن کی شادی خاندانِ منگرال سے باہر محمد حسین ڈار سے ہوئی جن کے بطن سے ماسٹر محمد رفیق (ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہری پور ہزارہ صوبہ سرحد) اور مشتاق احمد متقی بعمرہ سال تولد ہوئے۔

میاں خیر الدین کے فرزند میاں محمد مرید کی شادی موضع جلا پور جٹاں کی دوشیزہ مسماۃ خدیجہ بی بی سے ہوئی جو قبول صورت، خوش اطوار اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ وہ سادہ مزاج اور گھریلو قسم کی عورت تھیں

اُن کے بطن سے صرف دو پسران میاں محمد احسان اللہ خان اور میاں محمد امان اللہ خان ہی پیدا ہوئے۔ مسماۃ خدیجہ بی بی اپنی بھرپور اور کامیاب زندگی گزارنے کے بعد ۴، نومبر ۱۹۴۹ء کو فوت ہوگئیں۔ ان کو قبرستان مسجد بیگم پورہ میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است

میاں محمد سرور کے صاحبزادے میاں محمد احسان اللہ خان کی شادی اُن کے چچا میاں محمد الدین کی دُخترِ کلاں مسماۃ آمنہ بی بی سے ہوئی۔ اگرچہ یہ دوشیزہ ناخواندہ تھیں پھر بھی وہ تمام گھریلو صفات سے متصف تھیں۔ وہ کھلتے ہوئے رنگ۔ تیکھے نقوش۔ متوازن قد و قامت کی دُختر قوم تھیں۔ اُن کی سادگی اور شرافت مثالی تھی۔ اُن کے بطن سے صرف ایک دُختر مسماۃ شاہزادہ بیگم ہی تولد ہوئیں کہ میاں بیوی میں اَن بَن ہوگئی۔ اور اس طرح وہ اپنے خاوند کی ملازمت کے سلسلہ میں اُن کے ساتھ رہنے کی بجائے میکے میں ہی رہنے لگیں۔ میاں محمد احسان اللہ نے اسی دوران ایک خاتون مسماۃ جنت بی بی سے اپنی پسند کی دُوسری شادی کرلی۔ یہ خاتون قدرے خواندہ ہونے کے علاوہ قبول صورت۔ سلیقہ شعار۔ شگفتہ مزاج۔ متوازن شخصیّت کی حامل ہونے کے علاوہ اپنے خاوند کی حد درجہ مزاج شناس محبوبہ تھیں۔ اُن کی موجودگی ہی میں اگرچہ میاں محمد احسان اللہ خان کی زوجۂ اوّل اُنہی کے حبالۂ نکاح میں رہیں لیکن کبھی بھی اُن کے مابین مراسم خوشگوار نہ ہوسکے۔ چنانچہ اپنے والد میاں محمد الدین کی زندگی تک وہ اپنے میکے میں مقیم رہیں اور اس کے بعد مسماۃ آمنہ بی بی معہ اپنی دُختر مسماۃ شہزادہ بیگم اپنے

دیور اور چچازاد بھائی میاں محمد امان اللہ خان کی سرپرستی میں لاہور اقامت گزیں رہیں۔ حتیٰ کہ سال ۱۹۷۱ء کے اوائل میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور گجرات کے قبرستان ترہنگان میں آسودۂ خاک ہوئیں۔ اپنی وفات سے پہلے انہوں نے اپنی واحد دختر مسماۃ شہزادہ بیگم کی شادی لاہور کے ایک مشہور سید خاندان کے فرد سید حسن شاہ سے کر دی۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ دونوں سال ۱۹۷۶ء میں سعادت حج بیت اللہ اور حاضری دربار رسالت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ مسماۃ شہزادہ بیگم اپنی والدہ محترمہ کی طرح خوش شکل۔ دراز قامت۔ متوازن بدن اور خوش خلق خاتون ہیں جن کی شادی خاندان سے باہر ہو چکی ہے۔ مسماۃ آمنہ بی بی نے اپنی ازدواجی زندگی کے بارہ میں کبھی تلخ نوائی کا اسلوب نہیں اپنایا۔

میاں محمد احسان اللہ خان کی زوجہ ثانی سے علاوہ دو پسران میاں محمد نصر اللہ خان اور میاں محمد مظہر اللہ خان پانچ دختران مسماۃ زبیدہ بیگم مسماۃ گلزار بیگم۔ مسماۃ گلشن بیگم۔ مسماۃ افتخار بیگم اور مسماۃ مختار بیگم تولد ہوئیں۔ ان میں سے صرف مسماۃ زبیدہ بیگم نے اپنے خالہ زاد ذلیل اللہ سے اپنی پسند کی شادی کی۔ دیگر بہنوں نے اپنے بھائیوں کی شرکت سے سمن آباد لاہور میں تعلیم و تدریس کا ادارہ قائم کیا۔ یہ کنبہ اپنے والد اور والدہ کی وفات کے بعد مستقلاً گجرات سے نقل مکانی کر کے لاہور قیام پذیر ہو گیا ہے۔ اور ان کے خاندان سے روابط قریباً منقطع ہی ہو چکے ہیں۔ میاں محمد نصر اللہ خان مجرد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ میاں محمد مظہر اللہ خان نے حال ہی میں اپنے ننہال میں گجرات ہی

سے خاندان سے باہر شادی کی ہے۔ اُنہوں نے گُڈو دُختر محمد اکرم بٹ
سے شادی کی ہے۔

میاں محمد سرور کے فرزندِ ثانی منشی میاں محمد امان اللہ خان کی شادی
بھی اپنے چچا میاں محمد الدین کی دُخترِ ثانی مسمّاۃ رابعہ بی بی سے ہوئی۔
اُن کے ہاں بھی ایک دُختر مسمّاۃ رضیہ بیگم تولّد ہوئی تھیں کہ بعد میں
میاں بیوی کی ناچاقی ہو گئی۔ میاں محمد امان اللہ خان وکلاء کی منشی گیری
کے سلسلہ میں گجرات سے لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں اُنہوں نے بھی
اپنی پسند کی شادی ایک خاتون مسمّاۃ گلاب بی بی سے رچالی۔ لیکن
اس سے کوئی اولاد تولّد نہ ہوئی۔ دونوں میاں بیوی دو مرتبہ حج بیت اللہ
کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اُنہوں نے میاں محمد احسان اللہ کی
زوجہ اوّل اور اُن کی بیٹی مسمّاۃ شہزادہ بیگم کو لاہور ہی میں اپنی
کفالت میں رکھا۔ مسمّاۃ رابعہ بی بی اپنے میکے میں ہی مقیم رہیں اور وہیں
اُنہوں نے انتقال فرمایا۔ وہ انتہائی منکسر المزاج۔ سلیقہ شعار۔ صاف گو
اور گھریلو عورت تھیں۔ اُن کی زبان سے اپنے خاوند کی نسبت کبھی سے
کبھی بھی حرفِ شکایت نہیں سُنا۔ اُن کی لڑکی مسمّاۃ رضیہ بیگم کی شادی
خاندان سے باہر لاہور ہی میں ہوئی۔

میاں خیر الدین کے فرزندِ ثانی میاں محمد الدین کی شادی خاندان سے
باہر موضع کھیپڑانوالہ تحصیل گجرات کی ایک خاتون مسمّاۃ نواب بی بی سے
ہوئی۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین صاحبزادوں میاں عبدالحق۔ میاں شریف احمد
اور میاں بشیر احمد چھ دُختران مسمّاۃ آمنہ بی بی۔ مسمّاۃ رابعہ بی بی۔ مسمّاۃ
فیروزہ بی بی۔ مسمّاۃ صغریٰ بی بی۔ مسمّاۃ اختر النساء اور مسمّاۃ اعجاز بیگم تولّد

ہوئیں۔ عیالداری اور میاں محمد الدین کی قلیل آمدنی کی وجہ سے ہر دو میاں
بیوی کو انتہائی محنت اور کفایت سے گزر بسر کرنا پڑی۔ مسماۃ نواب بی بی
انتہائی جفاکش۔ صابر و شاکر عورت تھیں۔ اُنہوں نے اپنی اولاد کو بڑی
جان جوکھوں سے پروان چڑھایا۔ کبھی بھی عسرت یا تنگ دستی کی شکایت
زبان پر نہ لائیں۔ کسب حلال میں کوشاں اور مصروف رہیں۔ لڑکیوں میں
ماسوائے مسماۃ اختر النساء کوئی بھی میٹرک تک تعلیم حاصل نہ کر سکیں
مسماۃ اختر النساء کو بچپنے میں ہی میاں مختار نبی نے اپنی کفالت میں
لے لیا تھا۔ اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت دیگر افرادِ کنبہ سے جداگانہ اور
ارفع طریقہ سے ہوئی۔ لڑکوں میں سے کسی نے بھی پرائمری سے زیادہ
تعلیم حاصل نہ کی۔ مسماۃ آمنہ بی بی اور مسماۃ رابعہ بی بی دونوں اپنے
تایا زاد لڑکوں سے بیاہی گئیں جن کا مفصل ذکر فرزندان میاں محمد سرور
کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ مسماۃ فیروزہ بی بی کی شادی خاندان سے باہر
محمد امین ڈار سے ہوئی جبکہ مسماۃ صغریٰ بی بی کی شادی بھی خاندان سے
باہر حاجی محمد علی سے ہوئی۔ ہر دو کی اولادیں ذکور و اناث موجود ہیں۔ مسماۃ
اختر النساء کی شادی بھی خاندان سے باہر خلیفہ شجاع الدین مرحوم،
سپیکر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے صاحبزادے خلیفہ علاؤ الدین سے ہوئی۔
جو میاں مختار نبی نے کمال تزک و احتشام سے جبکہ وہ بطور ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ
زراعت جالندھر تعینات تھے سرانجام دی۔ اس خاتون کے ہاں ایک
فرزند ذکی الدین اور دو دختران تولد ہوئیں۔ مسماۃ اعجاز بیگم کی شادی موضع
دینا پور کے ایک زمیندار چوہدری سردار خاں سے ہوئی جن کے بطن
سے بھی اولادیں ذکور و اناث موجود ہیں۔ مسماۃ نواب بی بی کی سبھی

دختران انتہائی سلیقہ شعار۔ اطاعت گزار۔ زیرک اور گھریلو خواتین ہیں۔

میاں محمد الدین کے صاحبزادے میاں عبدالحق کی شادی خاندان سے باہر اپنے ننہال موضع کھیپڑانوالہ تحصیل گجرات کی ایک خاتون مسماۃ بہشتاں بی بی سے ہوئی۔ جو ناخواندہ ہونے کے باوجود ایک گھریلو خاتون تھیں۔ اُنہوں نے نہایت صبر و دانشمندی سے گزر بسر کی۔ سسرال میں ساس کی زندگی کی وجہ سے وہ خود ایک بزرگ ہستی کی حیثیت سے اپنی اولاد اور ہر دو دیور میاں مرید احمد اور میاں بشیر احمد کے لیے ایک شفیق ماں اور ہمدرد بہن کے منزلہ تھیں۔ اُن کے بطن سے چار پسران میاں ضیاءالحق۔ میاں مظہرالحق۔ میاں اظہرالحق اور میاں ظفرالحق کے علاوہ دو دختران مسماۃ زاہدہ بیگم اور مسماۃ شاہین بیگم تولد ہوئیں۔ ہر دو بچیاں اپنی والدہ مسماۃ بہشتاں بی بی کی صفات سے متصف ہیں۔ اپنی والدہ کی بے وقت موت کی وجہ سے اپنے چچا میاں بشیر احمد کی زیر کفالت مقیم ہیں کیونکہ والد کے گھر میں کوئی دیکھ بھال کرنے والی خاتون نہیں ہے۔ میاں عبدالحق بھی اپنی زوجہ کی وفات کے بعد یوسفِ بے کارواں ہی ہیں۔

میاں عبدالحق کے صاحبزادے میاں ضیاءالحق کی شادی حال ہی میں اُس کی پھوپھی مسماۃ اعجاز بیگم کی صاحبزادی مسماۃ روبینہ بیگم سے ہوئی ہے۔ آغاز میں ہی فریقین کی طبائع کا تضاد نمایاں ہے۔ دیکھیں یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ میاں عبدالحق کے دوسرے دو صاحبزادوں میں سے ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی جبکہ میاں ظفرالحق ابھی خوردسال ہیں۔

میاں محمد الدین کے پسر ثانی میاں مرید احمد کنوارے ہی رحلت فرما

چکے ہیں۔ بلوغت کے باوجود اُن کی شادی نہ ہوئی۔

میاں محمد الدین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے میاں بشیر احمد کی شادی خاندان سے باہر بابو مہتاب دین ڈار کی صاحبزادی مسماۃ بشیراں بی بی سے ہوئی جو انتہائی سلیقہ شعار۔ دانا۔ امورِ خانہ داری میں ماہر اور شریف النفس خاتون ہیں۔ اُن کے بطن سے چار پسر ہی تولد ہوئے جن میں سے کسی ایک کی بھی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ہر دو میاں بیوی ایک کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میاں خیر الدین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے صوبیدار میاں نذر محمد کی شادی خاندان میں سے ہی میاں محمد بخش کی صاحبزادی مسماۃ حمیدہ بیگم سے ہوئی جن کا تذکرہ بسلسلہ اولاد میاں محمد بخش پہلے گزر چکا ہے۔ اُن کی دُختر مسماۃ خورشید بیگم رسنِ بلوغت کو پہنچتے ہی تھیں کہ بیمار ہو کر راہئ ملکِ عدم ہوگئیں۔

صوبیدار میاں نذر محمد کے صاحبزادے میاں محمد منظور الٰہی کی شادی اندرونِ خاندان اپنے ماموں میاں محمد صادق کی دُختر ثانی مسماۃ تاج بیگم سے ہوئی۔ جن کے والد نے اپنی وفات سے چند یوم پہلے اپنی جملہ جدی اراضی اُن کے نام ہبہ کر دی۔ جو مسماۃ تاج بیگم کی وفات پر اُن کے خاوند اور اولاد یعنی دو پسران اور ایک دُختر گُل نسا کے نام منتقل ہوگئی۔ میاں منظور الٰہی کے ہر دو پسران کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس فیملی کے بارہ میں مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

صوبیدار میاں نذر محمد کے فرزندِ ثانی میاں محمد اقبال کی شادی خاندان سے باہر ملتان کی ایک دوشیزہ مسماۃ استیاز بیگم المعروف معافی بیگم

سے ہوئی۔ جو ایک قبول صورت۔ خوش مزاج اور عائل ستودہ صفات گھریلو
خاتون ہیں۔ اُن کے بطن سے علاوہ تین پسران میاں حامد اقبال۔ میاں
نوید اقبال اور میاں تنویر اقبال دو دختران مسماۃ شاہدہ بیگم اور مسماۃ ساجدہ بیگم
تولد ہوئیں۔ مسماۃ شاہدہ بیگم کی شادی خاندان سے باہر راولپنڈی کے
ارشد احمد سے ہوئی۔ لیکن یہ بچی اپنی شادی کے ایک سال بعد ہی
وفات پا گئیں۔ اُن کے چالیسواں کے بعد اُن کی ہمشیرہ مسماۃ ساجدہ بیگم
کو اُن کی جگہ سال ۱۹۸۵ء میں اپنے سابقہ بہنوئی کے حبالۂ نکاح میں دے
دیا گیا۔ جہاں وہ آج کل ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں۔
میاں محمد اقبال کے صاحبزادے میاں حامد اقبال کی شادی پیرزادہ
آصف الدولہ گجراتی کی بھانجی سے منگرال خاندان سے باہر کی ایک دوشیزہ
مسماۃ اصغری سے سال ۱۹۷۶ء کے اوائل میں ہو چکی ہے۔ ہر دو میاں بیوی
بھرپور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تذکرۂ خواتینِ قوم منگرال
راجپوت سکنہ ضلع گجرات اختتام پذیر ہوا ؎
گر قبول افتد زہے عز و شرف